امام یحییٰ بن شرف الدین النّووی رحمہ اللہ کے مجموعہ احادیث

اربعینِ نووی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل

خطاباتِ جمعہ

حصہ اوّل

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

امام یحییٰ بن شرف الدّین النّووی رحمہ اللہ کے مجموعۂ احادیث

اربعینِ نووی رحمۃ اللہ علیہ

کی تشریح و توضیح پر مشتمل خطاباتِ جمعہ

از

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تدوین:

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور

حصہ اوّل

مکتبہ خُدّام القُرآن لاھور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501

maktaba@tanzeem.org

مؤسس انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپنی دلی خواہش اور جدوجہد کے تقاضوں کے عین مطابق' مرحوم کے تمام قانونی وارثین ہر مسلمان کو ڈاکٹر صاحبؒ کی طبع شدہ تصنیفات/ تالیفات' آڈیوز' ویڈیوز کو طبع/ تیار کر کے شائع کرنے کی کھلی اجازت دیتے ہیں (چاہے قیمتاً ہو یا مفت تقسیم) اور اس کے لیے کسی پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہمارا کسی قسم کی رائلٹی یا ''محفوظ حقوق'' کا تقاضا بھی نہ ہے اور نہ ہوگا' البتہ تیار کردہ مواد (آڈیوز یا ویڈیوز) اور کتب کے چند نسخے ہمارے ریکارڈ کے لیے بھیج دیے جائیں تو ممنون ہوں گے۔ تاہم ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی ناپسندیدہ کوشش مثلاً تبدیلی الفاظ' غلط اقتباس' سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اور ہمارے موقف کی صحیح ترجمانی نہ ہو اور جس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے' تو ہم اس شخص کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مکمل حق محفوظ رکھتے ہیں۔

نام کتاب ——— اربعین نوویؒ کی تشریح وتوضیح پر مشتمل خطاباتِ جمعہ
از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

طبع اوّل (مئی 2016ء) ——— 3,300

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 3-35869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور

قیمت (مکمل سیٹ) ——— 600 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 040 - 6

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

بسم الله الرحمن الرحيم

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ق
وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ج

(الحشر: ۷)

''اور جو کچھ رسول ﷺ تم لوگوں کو دے
دیں وہ لے لو اور جس چیز سے
روک دیں اس سے رک جاؤ!''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدیم

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((تَرَكْتُ فِيكُمْ اَمْرَيْنِ، لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا : كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّةَ نَبِيِّهٖ)) [رواه المالك مرسلاً] ''(مسلمانو!) میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ وہ ہیں: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سُنّت'' —— چنانچہ دین اسلام اور شریعتِ اسلامی کی یہی دو بنیادیں ہیں' ایک اللہ کی کتاب قرآن حکیم اور دوسری سُنّتِ رسولؐ۔ کتاب اللہ وحیٔ جلی اور وحی بِاللفظ ہے' جبکہ سُنّت وحیٔ خفی پر مبنی ہے۔ یعنی اس کا مفہوم اللہ ہی کی طرف سے آیا ہے لیکن الفاظ اللہ کے رسول ﷺ کے ہیں۔ گویا سُنّت وحی بِاللفظ نہیں بلکہ وحی بالمعنیٰ ہے۔ سُنّتِ رسول ﷺ کا علم ہمیں دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے' جن میں سے پہلا تواترِ اُمت اور دوسرا حدیث ہے' جو سُنّتِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تحریری ریکارڈ ہے۔

قرآنِ حکیم نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری اور تکمیلی پیغامِ ہدایت ہے' جو نبی آخر الزّماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ آنحضور ﷺ کا فرضِ منصبی نہ صرف اس کتاب ہدایت کو نوعِ انسانی تک پہنچا دینا تھا ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧) بلکہ اس کی توضیح و تبیین بھی تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ (النحل) ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کی جانب یہ ''الذکر'' (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ آپ واضح کر دیں لوگوں کے لیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے ان کی جانب اور تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں''۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعے قرآن حکیم کی تشریح و توضیح فرما دی' جو ذخیرۂ حدیث کی صورت میں اُمت کی راہنمائی کے لیے محفوظ ہے۔

یہ ذخیرۂ حدیث صحاحِ ستہ' موطا امام مالک' مسند احمد اور دیگر اُمّہات الکُتب پر محیط ہے اور ہر دور میں اہلِ علم نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان میں سے انتخاب کر کے احادیث کے خوبصورت گلدستے تیار کیے ہیں۔ بعض روایاتِ حدیث کی بنیاد پر (جن کا ذکر محترم ڈاکٹر

صاحبؒ کے تمہیدی خطاب میں قدرے تفصیل سے موجود ہے) چالیس احادیث کو جمع کرنے کا عمل علماء و محدثین کے ہاں باعثِ سعادت رہا ہے' چنانچہ متعدد اہلِ علم نے چالیس احادیث پر مشتمل مجموعے (اربعینیات) مرتب کیے ہیں۔ ''اربعین نوویؒ'' ایک ایسا ہی عطر بیز گلدستۂ حدیث ہے جو ساتویں صدی ہجری کے بلند پایہ زاہد و عابد اور محدث و فقیہہ امام یحییٰ بن شرف الدین النووی ؒ (۶۳۱ـ۶۷۶ھ) نے مرتب فرمایا۔ امام نوویؒ کئی کتابوں کے مصنف ہیں' جن میں ریاض الصالحین اور شرح صحیح مسلم بہت معروف ہیں۔ ۴۲ احادیث پر مشتمل ان کے مختصر مجموعۂ احادیث (اربعین) کو جو قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی وہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی مرتب کے حصے میں نہ آئی۔ امام نوویؒ نے اپنی ''اربعین'' میں ایسی احادیث کو جمع کیا ہے جو دین میں اساس کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی جامعیت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ وہ کم و بیش ان تمام مسائل کا احاطہ کرتی ہیں جو ہر مسلمان کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے ۰۸ـ۲۰۰۷ء کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی لاہور میں اپنے خطاباتِ جمعہ میں ''اربعین نوویؒ'' کی احادیث کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا۔ ان خطابات کے دوران محترم ڈاکٹر صاحب نے ''اربعین'' کی ۴۲ احادیث پر مستزاد ''حکمت دین کا ایک عظیم خزانہ'' کے عنوان سے حضرت معاذ بن جبل ؓ سے مروی ایک طویل حدیث کا مطالعہ بھی دو نشستوں میں کرایا۔ قرآن اکیڈمی کے شعبۂ مطبوعات کے زیر اہتمام ترتیب و تسوید کے بعد ان خطاباتِ جمعہ کی ماہنامہ ''میثاق'' میں اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے اور اس سلسلے کی تکمیل کے بعد ان کو یکجا کر کے ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ان خطاباتِ جمعہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحبؒ زیر مطالعہ حدیث کے مضامین کی مناسبت سے ہر خطاب کے آغاز میں قرآن حکیم کی آیات بھی تلاوت کرتے رہے اور ہر حدیث کی تشریح و توضیح میں ذخیرۂ احادیث سے دیگر متعلقہ احادیث بھی بیان کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس خدمت کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے لیے صدقۂ جاریہ اور بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنائے اور اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت کی خدمات سرانجام دینے والوں کے لیے اسے سعادتِ دارین کا باعث بنائے!

۵ شعبان المعظم ۱۴۳۷ھ / ۱۳ مئی ۲۰۱۶ء
بروز جمعۃ المبارک

خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات

فہرست

(حصّہ اوّل)

تمہیدی خطاب	حدیث کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ	9
حدیث ۱	عمل میں نیت کی اہمیت اور قرآن و حدیث میں ربط و تعلق	23
حدیث ۲	اسلام' ایمان اور احسان: حدیثِ جبرائیلؑ کی روشنی میں	39
حدیث ۴۳	حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ	107
حدیث ۳	ارکانِ اسلام	145
حدیث ٤	انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان	165
حدیث ٤	ایمان بالقدر (تقدیر پر ایمان)	183
حدیث ٥	مذمّتِ بدعت	213
حدیث ١٠	اَکلِ حلال کی اہمیت	247
حدیث ٦	حلال' حرام اور اصلاحِ قلب	265
حدیث ٧	اخلاص' خیر خواہی اور وفاداری	283
حدیث ٨	نبی اکرم ﷺ کو حکمِ قتال اور قتل کی تین صورتیں	317
حدیث ٩	اطاعتِ رسولؐ کی فرضیت اور کثرتِ سوال کی ممانعت	347
حدیث ١١، ١٢	تقویٰ اور اس کی عملی شکلیں	355
حدیث ١٣، ١٤	اسلامی اخوت اور خونِ مسلم کی حرمت	373
حدیث ١٥	اسلامی آدابِ معاشرت	393
حدیث ١٦	غصہ کی ممانعت	413

(حصّہ دوم)

حدیث ۱۷،۱۸	حسنِ تہذیب اور حسنِ سلوک	435
حدیث ۱۹	استعانت باللہ (صرف اللہ سے مدد مانگنا)	455
حدیث ۲۰،۲۱	اسلام میں شرم وحیا اور استقامت کی اہمیت	477
حدیث ۲۲،۲۳	فرائض کا التزام اور رسول اللہ ﷺ کی جامع نصیحتیں	497
حدیث ۲٤	حرمتِ ظلم اور حقیقتِ توحید	521
حدیث ۲۵،۲٦،۲۷	صدقے کا حقیقی مفہوم اور نیکی اور گناہ کی پہچان	541
حدیث ۲۸	وجوبِ التزامِ سُنّت (سُنّت کو لازم پکڑنا)	561
حدیث ۲۹	ابوابِ خیر (حکمت اور بھلائی کے دروازے)	593
حدیث ۳۰	شرعی احکام کی اقسام (فرائضِ دینی کا جامع تصوّر)	615
حدیث ۳۱	زہد کی حقیقت وفضیلت	655
حدیث ۳۲،۳۳	اسلام میں عدل وانصاف کی اہمیت اور اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی	665
حدیث ۳٤	امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس کی اہمیت	681
حدیث ۳۵	اسلامی معاشرت کے اصول اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کی بنیادیں	703
حدیث ۳٦	حسنِ معاشرت' طلبِ علم اور درس وتدریس کی فضیلت	727
حدیث ۳۷	اللہ رب العزت کا فضلِ عظیم اور اس کی وسعتِ رحمت	747
حدیث ۳۸	ایمان کے ظاہری وباطنی ثمرات اور تقربِ الٰہی کے ذرائع	765
حدیث ۳۹،٤۰	خطا' نسیان اور جبر واکراہ کی معافی اور دنیا کی بے ثباتی	793
حدیث ٤۱	اطاعتِ رسول ﷺ: ایمان کی علامت ہے	811
حدیث ٤۲	رحمتِ الٰہی کی وسعت اور توبہ کی فضیلت	833

تمہیدی
خطاب

حدیث کی اہمیت
اور اس کا مقام ومرتبہ

۲۵ مئی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝ (النور)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝ (التغابن)

شریعتِ اسلامی کی دو بنیادیں

سب جانتے ہیں کہ ہمارے دین اسلام اور شریعت اسلامی کی دو بنیادیں ہیں‘ ایک کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم اور دوسری سنتِ رسولؐ ۔ جیسا کہ ہمارے کلمۂ طیبہ کے دو حصے ہیں: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یعنی توحید اور رسالت ۔ کلمۂ شہادت جو ہمارے اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے اس کے بھی دو حصے ہیں: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ـــ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ میں فرق یہ ہے کہ کتاب اللہ وحی جلی ہے‘ وحی باللفظ (verbal

(revelation ہے' وحی بالمعنیٰ نہیں ہے۔عیسائیوں کے ہاں وحی کے بارے میں یہ تصور ہے کہ وحی بِاللّفظ (verbal) نہیں ہوتی' بلکہ صرف ایک مفہوم منتقل کر دیا جاتا ہے' اس مفہوم کو پھر رسول اپنی زبان میں ادا کرتا ہے۔ گویا الفاظ اللہ کے نہیں ہوتے۔ ہمارا تصور اس کے برعکس ہے۔ ہمارے نزدیک وحی جلی ''وحی بِاللّفظ'' ہے' جو لفظ بلفظ اللہ کا کلام ہے۔ دوم یہ کہ وہ بالکل محفوظ ہے۔ اس کا ایک حرف تو کجا کسی ایک شوشے میں بھی کوئی تحریف نہیں ہوئی۔

اس کے مقابلے میں سنت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بھی وحی ہے' مگر وہ وحی خفی پر مبنی ہے۔ اس کا بھی اشارہ اللہ کی طرف سے ہے' لیکن یہ وحی بِاللّفظ نہیں ہے' وحی بالمعنیٰ ہے۔ یعنی مفہوم اللہ کی طرف سے آیا ہے' لیکن الفاظ اللہ کے رسولؐ کے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کی حفاظت قرآن کی طرح کی حفاظت نہیں ہے۔ اس معنی میں تو حفاظت ہے کہ تاریخ انسانی میں صرف ایک مثال ہے کہ کسی ایک شخصیت کے اقوال اور اعمال کی صداقت اور صحت کو پرکھنے کے لیے لاکھوں انسانوں کی سیرت و کردار کا جائزہ لیا گیا۔ احادیث کی جانچ پرکھ کے لیے مسلمانوں نے اسماء الرجال کا جو علم ایجاد کیا' پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس اعتبار سے سنتِ رسولؐ کی واقعتاً حفاظت کی گئی ہے۔ البتہ یہ حفاظت بالواسطہ ہوئی ہے' اس معنی میں حفاظت نہیں کہ ہر شے لفظ بلفظ محفوظ ہے' بلکہ ایسا بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک مجمع میں کچھ لوگوں نے باتیں سنیں' پھر انہوں نے جو روایت کی تو بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ میری کوئی بات آپ جا کر لوگوں کو بتائیں گے تو ہر شخص کے بتانے میں کچھ فرق پیدا ہو جائے گا۔ اس کی ایک بڑی مثال ''اُمُّ السُّنّۃ'' یعنی حدیث جبرائیلؑ ہے جو ''اربعین نووی'' میں دوسرے نمبر پر آئے گی۔ یہ ایک اہم اور مشہور متواتر حدیث ہے' لیکن مختلف راویوں نے جب اسے بیان کیا ہے تو لفظی طور پر اس میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

یہ بھی جان لیجیے کہ سنت اور حدیث دو علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں۔ آنحضور ﷺ کا تعامل اور طرزِ عمل سنت کہلاتا ہے اور حدیث اس کا ایک تحریر شدہ ریکارڈ ہے۔ سنت کو

معلوم کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ایک حدیث اور دوسرا اُمت کا تواترِ عمل۔آنجناب ﷺ کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے آپؐ کی پیروی کی۔صحابہ کرام کو عمل کرتے ہوئے تابعین نے دیکھا تو وہ ان کے نقشِ قدم پر چلے۔تو اس طرح بہت سی چیزیں تواتر کے ساتھ اُمت میں منتقل ہو گئیں۔یہ تواترِ عمل سنت کا علم حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

عام طور پر لوگ سنت اور حدیث کو مترادف سمجھ لیتے ہیں' حالانکہ یہ دو مختلف الفاظ ہیں' ان کا مفہوم جدا ہے۔یہ دونوں الفاظ' حدیث اور سنت' اللہ کے لیے بھی آئے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی۔مثلاً: ﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝۲۳﴾ (الفتح) ''یہ اللہ کا دستور ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے' اور تم اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے''۔سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ۝۴۳﴾ ''پس تم اللہ کے قانون میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔اور تم اللہ کے قانون کو ہرگز ٹلتا ہوا نہیں دیکھو گے''۔اسی طرح فرمایا: ﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ۝۷۷﴾ (الاسراء) ''یہ ہمارا طریقۂ عمل رہا ہے ان انبیاء و رُسلؑ کے بارے میں جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا۔اور آپ ہماری سنت میں کوئی تغیر نہیں پائیں گے''۔حدیث کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝۸۷﴾ ''اور تم اللہ سے بڑھ کر کسی کو حدیث (بات) میں سچا نہیں پاؤ گے''۔اسی طرح فرمایا گیا: ﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰﴾ (المرسلٰت) ''تم اس (قرآن) کے بعد کس حدیث پر ایمان لاؤ گے؟'' قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ کی بات کے لیے بھی حدیث کا لفظ آیا ہے: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ﴾ (التحریم:۳) ''اور (یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے) جب نبی کریم ﷺ نے راز داری سے اپنی ایک بیوی کو ایک بات بتائی''۔ان حوالوں سے پتا چلا کہ سنت کا لفظ بھی سنت اللہ اور سنت الرسول دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے اور حدیث کا لفظ بھی حدیث اللہ اور حدیث الرسول دونوں کے لیے آیا ہے۔

اصطلاح میں حدیث کسے کہتے ہیں؟ حدیث دو طرح کی چیزوں پر مشتمل ہے۔ ایک ''اخبار'' ہے جو خبر کی جمع ہے اور ایک ''آثار'' ہے جو اثر کی جمع ہے۔ خبر رسول اللہ ﷺ کے کسی قول' فعل یا تقریر کو کہتے ہیں۔ قول اور فعل کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں لیکن تقریر کے بارے میں یاد رہے کہ اصطلاح میں اس کا مفہوم ہے کہ کوئی کام آنحضور ﷺ کے سامنے کیا گیا اور آپؐ نے روکا نہیں' تو اسے آپؐ کی منظوری کی ایک سند حاصل ہوگئی۔ لہٰذا آنجنابؐ کے اقوال' افعال اور تقریر اخبار کہلاتے ہیں اور کسی صحابی کے اقوال' افعال اور تقریر آثار کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ گمانِ غالب یہی ہے کہ صحابی جو بات کہہ رہے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے' بلکہ انہوں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوگی اور جس پر صحابی عمل کر رہے ہیں انہوں نے اسے رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھا ہوگا۔ ان اخبار و آثار کے مجموعہ کا نام حدیث ہے۔

حدیث نبویؐ کے دو حصے ہیں: متن اور سند۔ متن (text) یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا ارشاد فرمایا۔ جبکہ سند یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کس نے سنا' اُس سے کس نے سنا۔ یعنی آنجنابؐ سے صحابی' صحابی سے تابعی' تابعی سے تبع تابعی' یہ روایت کہلاتی ہے' اور یہ کڑیاں (links) راوی کہلاتے ہیں۔ امام بخاریؒ جب کوئی حدیث بیان کرتے ہیں تو اپنی شخصیت سے لے کر نبی کریم ﷺ تک درمیان کی تمام کڑیاں بیان کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک مستند درجے کی حدیث ہوتی ہے۔ یہ کڑیاں نبی اکرم ﷺ سے لے کر محدث تک ہونی چاہئیں۔ ہمارے ہاں علماء کے اندر بھی سند چلتی ہے۔ جو لوگ دینی علوم سے فارغ التحصیل ہیں' ان کی بھی سند ہے۔ آج دینی مدارس کے جو شیخ الحدیث ہیں انہیں بھی ائمۂ حدیث سے لے کر اپنے آپ تک پورا سلسلۂ سند معلوم ہوتا ہے۔ ان تصریحات سے اندازہ کریں کہ حدیث کی خاطر کتنی محنت ہوئی ہے اور کس قدر کوشش کی گئی ہے۔

حدیث کی سند میں جن راویوں کے نام آتے ہیں ان کے حالات کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں کسی راوی پر جھوٹ کا الزام تو نہیں' کسی کو سوءِ حفظ کا عارضہ تو لاحق نہیں تھا۔ ہر راوی کے سیرت و کردار کو جانچا جاتا ہے۔ راویوں کے بارے

میں ان معلومات کا علم ''اسماء الرجال'' کہلاتا ہے اور تاریخِ انسانی میں صرف آنحضور ﷺ ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کی حدیث کو جانچنے کے لیے تمام راویوں کے حالات کا بخوبی جائزہ لیا جاتا ہے۔

سند کے اعتبار سے حدیث کی چند اقسام یہ ہیں: مسند' مرفوع' مرسل' ضعیف' موضوع۔ مسند: وہ حدیث جس کی ساری کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہوں' کہیں کوئی وقفہ نہ ہو' یعنی متصل ہو۔ مرفوع: وہ حدیث جو رسول اللہ ﷺ سے روایت کی جا رہی ہو۔ مرسل: وہ حدیث ہے جو ایک تابعی رسول اللہ ﷺ سے بیان کر رہے ہوں اور یہ نہ بتا رہے ہوں کہ انہوں نے یہ حدیث کس صحابی سے سنی ہے۔ مرسل کا درجہ وہ نہیں ہے جو مرفوع کا ہے۔ ضعیف: جس میں کسی ایک راوی کا کردار معیاری نہ ہو' یا اسے سوءِ حفظ کا عارضہ ہو۔ اگر روایت کی کسی ایک کڑی میں بھی ان دونوں میں سے کوئی ایک بات ہو تو وہ حدیث ضعیف ہے۔ موضوع: جس روایت کے بارے میں محدثین کرام نے چھان بین کر کے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ یہ کوئی من گھڑت حدیث ہے' اس کی نسبت آنجناب ﷺ کی جانب درست نہیں ہے' اسے موضوع کہتے ہیں۔ احادیث میں جو موضوع ہیں انہیں بھی جمع کیا گیا ہے۔ ایسی کتابوں کو ''کتاب الموضوعات'' کا نام دیا جاتا ہے۔

ضعیف احادیث کے ضمن میں یہ واضح رہے کہ کسی حدیث کے ساتھ ضعیف لکھا ہو تو اس سے ہمیں خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کو چھوڑ دیں' یہ تو ضعیف ہے۔ حالانکہ سند کی ایک کڑی میں بھی ضعف ہو تو حدیث ضعیف کہلاتی ہے۔ ضعیف احادیث کے اندر بھی علم و حکمت کے بڑے اعلیٰ موتی ہوتے ہیں۔ دیکھئے' ایک ہے کسی بات کا سچ ہونا' جبکہ ایک ہے سچ کا ثابت ہو جانا۔ کتنے ہی سچ ایسے ہوتے ہیں جن کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے وکلاء سے سنا ہوگا کہ خالص سچ پر کوئی ایک مقدمہ بھی نہیں جیتا جا سکتا' کچھ نہ کچھ جھوٹ اس میں شامل کرنا پڑتا ہے۔ تو سچ کا ثابت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو سچ ثابت نہ ہو سکے وہ جھوٹ ہے۔ چنانچہ ضعیف حدیث کمزور تو ہے' لیکن موضوع نہیں ہے' وہ متروک نہیں ہوگی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ ہاں اس سے کوئی حکمِ شرعی

نہیں نکلے گا۔ اس سے حلت وحرمت کے احکامات اخذ نہیں کیے جائیں گے۔ اگر ہم ضعیف احادیث سے احکامات اخذ کرنا شروع کر دیں تو پھر شریعت اصل شکل میں باقی نہ رہے گی۔ ضعیف احادیث فضائل کے ضمن میں قابل قبول ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے مصنفین اپنی کتب میں ضعیف احادیث کی صورت میں حکمت کے بڑے قیمتی موتی لائے ہیں۔

چالیس احادیث حفظ کرنے کی فضیلت

خطباتِ جمعہ کی ان نشستوں میں ہمیں ''اربعینِ نووی'' کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس کے آغاز سے قبل ہم چالیس احادیث حفظ کرنے کی فضیلت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے رواۃ میں حضرات علی‘ عبداللہ بن مسعود‘ معاذ بن جبل‘ عبداللہ بن عمر‘ عبداللہ بن عباس‘ انس بن مالک‘ ابوالدرداء اور ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہم ہیں‘ جو سب جلیل القدر اور ثقہ صحابہ ہیں۔ لیکن کہیں تابعین یا تبع تابعین کی سطح پر کوئی راوی ایسا آ گیا ہے جو قابل اعتماد نہیں‘ جس کا حافظہ متاثر ہے یا جس کا سیرت و کردار مشکوک ہے‘ لہٰذا یہ روایت ضعیف قرار پا گئی۔ وہ حدیث یہ ہے: ((مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا مِنْ اَمْرِ دِیْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فِیْ زُمْرَةِ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ)) ''جس شخص نے میری امت کی حفاظت کی خاطر دین کے معاملے میں چالیس احادیث حفظ کیں‘ اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز فقہاء اور علماء کے گروہ میں سے اٹھائے گا''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِیْهًا عَالِمًا)) ''اللہ تعالیٰ اسے فقیہہ اور عالم کی حیثیت سے اٹھائے گا''۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ((وَکُنْتُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیَامَةِ شَافِعًا وَّشَهِیْدًا)) ''اُس شخص کے حق میں قیامت کے دن میں سفارش کرنے والا اور گواہی دینے والا ہوں گا''۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ((قِیْلَ لَهُ ادْخُلْ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شِئْتَ)) ''اس سے کہا جائے گا کہ تم جنت کے جس دروازے سے چاہو داخل ہو جاؤ''۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے: ((کُتِبَ فِیْ زُمْرَةِ الْعُلَمَاءِ وَحُشِرَ فِیْ زُمْرَةِ الشُّهَدَاءِ)) ''اس

شخص کا نام علماء کی فہرست میں لکھ لیا جائے گا' اور وہ قیامت کے روز شہداء کے ساتھ اکٹھا کیا جائے گا''۔ یہ حدیث اور اس کی مختلف روایات کو امام نوویؒ نے ''اربعین نووی'' کے مقدمہ میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ حفاظِ حدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اگرچہ اس کے طرق بہت زیادہ ہیں۔ یہ حدیث ''کنز العُمّال'' میں بھی ہے۔ اس مجموعۂ احادیث میں ضعیف اور صحیح دونوں طرح کی احادیث موجود ہیں۔

حدیث کا ترجمہ کرتے ہوئے میں نے حفظ کا لفظ اس لیے برقرار رکھا ہے کہ ہمارے ہاں حفظ کا ایک عجیب تصور پایا جاتا ہے' جیسے قرآن کا حافظ ہے لیکن مفہوم نہیں سمجھتا' یہ تو نام کا حافظ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جب کوئی حفظ کرتا تو وہ اس کے متن کے ساتھ ساتھ مفہوم کو بھی یاد کرتا' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اس پر عمل بھی کرتا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں روایت موجود ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جن حضرات کا خاص شغف قرآن سے تھا' جیسے حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما' وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیات پڑھ لیتے تو آگے نہ بڑھتے جب تک ہمیں ان کا علم حاصل نہ ہو جاتا اور جب تک ہم اس پر عمل نہ کر لیتے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ تین چیزیں جمع ہو گئیں! الفاظ ان کے حافظے میں محفوظ ہو گئے' علم ان کے ذہن میں آ گیا اور عمل ان کی سیرت کا حصہ بن گیا۔ یہ تین شرائط پوری ہوں گی تو کوئی حافظ کہلانے کا مستحق ہو گا۔ اب ''حفظ'' کے لفظ کو مدنظر رکھ کر مذکورہ بالا حدیث کا مطالعہ کریں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کچھ تابعین نے سوال کیا تھا کہ آنجناب کا اخلاق کیا تھا؟ تو اُمّ المؤمنین نے فرمایا تھا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ أَمَا تَقْرَأُ الْقُرْآنَ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (مسند احمد' ح ۲۳۴۶۰) ''آپؐ کا اخلاق قرآن کریم تھا۔ کیا تم قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں پڑھتے ہو: یقیناً آپؐ خلقِ عظیم کے حامل ہیں''۔ واضح رہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا شمار چوٹی کے فقہائے صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ حضراتِ تابعین جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کے بارے میں پوچھ رہے ہوں گے تو انہیں کتنی حسرت ہو گی کہ اگر ہم بھی چند

سال پہلے دنیا میں آ جاتے تو آنجناب ﷺ کی صحبت سے مستفید ہو جاتے۔ ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند

دوچار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا!

قرآن وحیٔ متلو ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے' جو الفاظ اور حروف کی شکل میں ہمارے پاس ہے اور آنجناب ﷺ قرآن مجسم تھے' قرآن حکیم ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ جب آپ قرآن کریم پڑھیں گے تو بہت سی سورتیں سیرت کے ابواب دکھائی دیں گی۔ سورۃ الانفال میں غزوۂ بدر کا تذکرہ ہے۔ سورۃ آل عمران کا ایک بہت بڑا حصہ غزوۂ اُحد پر مشتمل ہے۔ سورۃ التوبۃ کا ایک بڑا حصہ غزوۂ تبوک سے متعلق ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کی جملہ تعلیمات کو مجسّم شکل میں دیکھنا ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔ یعنی تم قرآن حکیم پڑھو' اسی کے آئینہ میں حضرت محمد ﷺ کی سیرت نظر آئے گی۔

((مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ......)) جو حدیث بیان ہوئی ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ ضعیف ہے' لیکن اس سے اشتغال کا معاملہ دیکھیں کہ پچاس سے زائد ائمہ دین اور علماء کرام نے چالیس چالیس احادیث کے مجموعے مرتب کیے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی چالیس احادیث کا گلدستہ تیار کیا۔

ہم جو ''الاربعین'' پڑھیں گے' اس کے مؤلف امام نوویؒ ہیں' جن کا پورا نام یحیٰی بن شرف الدین النوویؒ ہے۔ آپ ۶۳۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۷۶ھ میں فوت ہو گئے۔ گویا کل ۴۵ برس عمر پائی۔ اتنے کم عرصے میں حدیث کے سلسلے میں ان کی بڑی خدمات ہیں۔ انہوں نے صحیح مسلم کی شرح بھی لکھی۔ ''ریاض الصالحین'' امام نوویؒ ہی کا مرتب کردہ احادیث کا مجموعہ ہے جو نہایت مقبول ہے۔ اسی طرح تمام ''اَربعین'' جو مرتب ہوئی ہیں' ان میں مقبول ترین امام نوویؒ کی اَربعین ہے۔ عربی میں کتاب کا اصل نام ''الاربعون النوویۃ'' ہے' لیکن ہمارے ہاں فارسی ترکیب کی وجہ سے ''اربعینِ نوویؒ'' ہے۔

عصرِ حاضر کے دو عظیم فتنے

اس وقت دنیا میں دو فتنے بہت بڑے ہیں اور بدقسمتی سے ان دونوں کو بڑا فروغ حاصل ہے۔ ان دونوں فتنوں کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی شخصیت سے ہے۔ ان میں سے ایک فتنہ ختمِ نبوت کی مہر توڑنے والا' نئی نبوت کا دعوے دار ہے' جبکہ دوسرا فتنہ انکارِ حدیث کا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایران میں بہاء اللہ اٹھا تھا جو نبوت کا مدعی تھا۔ بہائی آج بھی پوری دنیا میں موجود ہیں۔ مسلمان ممالک میں ان کے دفاتر' لائبریریز اور ریڈنگ رومز ہیں۔ مغرب میں تو بہائی بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد اٹھنے والا بہت بڑا فتنہ قادیانیت ہے' جسے مسلسل فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ سیٹلائٹ کے ذریعے سے پوری دنیا میں ان کے پروگرام نشر ہوتے ہیں' جسے وہ اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پوری مغربی دنیا ان کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ اس فتنے کا سرغنہ غلام احمد قادیانی ہے۔ اس نے انگریزوں کی خوشنودی کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کی نفی کی۔

ہندوستان میں انگریز نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم موجود ہیں' انہوں نے ہمیں دل سے قبول نہیں کیا' اس لیے کہ ہم نے مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی' جبکہ ہندو تو پہلے ہی غلام تھا' پہلے مسلمان کا غلام تھا' اب انگریز کا غلام ہو گیا۔ ان کے لیے تو معاملہ صرف آقاؤں کی تبدیلی کا تھا' جبکہ مسلمان حاکم سے محکوم بنائے گئے۔ اس لیے مسلمانوں کے اندر جذبۂ انتقام تھا' وہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کھوئے ہوئے مقام کو حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں نے مختلف احیائی تحریکیں برپا کیں۔ حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریک اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے' جو اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ دُنیوی اعتبار سے اگرچہ وہ ناکام ہو گئے اور بالاکوٹ کے مقام پر شہادت پائی' لیکن انہوں نے جہاد کا ایک صُور پھونک دیا تھا۔ چنانچہ طویل عرصہ تک اس علاقہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد جاری رہا۔ اس کے بعد کتنے ہی علماء کرام کو پھانسی دے دی گئی اور بہت سوں کو ''کالا پانی'' بھیج دیا گیا۔

علماءِ کرام نے ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا تھا اور دارالحرب کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہمیں ہندوستان میں ریشمی رومال کی تحریک نظر آتی ہے۔ یہ تحریک حضرت شیخ الہندؒ کی برپا کی ہوئی تھی جو چودھویں صدی کے مجدّد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تحریک ایک تدبیر تھی' جو ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ تدبیر یہ تھی کہ ایک طرف خلافتِ عثمانیہ سے کہا جائے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو' دوسری طرف افغانستان کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو اور اندر سے ہم بغاوت کر دیں' تاکہ انگریز کو ہندوستان سے اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ خلافتِ عثمانیہ سے مدد لینے کے لیے حضرت شیخ الہندؒ خود حجاز گئے اور مدینہ منورہ میں ترک گورنر سے ملے۔ وہ آگے بھی جانا چاہتے تھے لیکن مخبری ہونے کی بنا پر انہیں شریف حسین نے گرفتار کر کے' چاندی کی طشتری میں رکھ کر انگریز کو پیش کر دیا' کہ یہ آپ کا باغی ہے' آپ کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ اِس وقت اردن کا جو بادشاہ ہے وہ اسی شریف حسین کی نسل میں سے ہے۔ انگریز حضرت شیخ الہندؒ کو واپس ہندوستان نہیں لائے بلکہ انہیں بحیرۂ روم (Mediterraneon Sea) کے ایک جزیرہ ''مالٹا'' میں قید میں ڈال دیا۔ بقول اقبال: ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

آپ چار سال وہاں قید رہے۔ جب ٹی بی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو پھر انہیں رہا کر دیا گیا کہ اگر یہ قید میں انتقال کر گئے تو ایک طوفان برپا ہو جائے گا۔ مسلمانوں کے دلوں میں موجزن جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے انگریزوں نے غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ کھڑا کیا' جس نے جہاد و قتال کو حرام قرار دینے کا اعلان کر دیا۔

عصرِ حاضر کا دوسرا بڑا فتنہ انکارِ حدیث کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے پہلے فتنہ سے بھی زیادہ خطرناک ہے' کیونکہ یہ زیادہ پھیل رہا ہے۔ ختمِ نبوت کا مسئلہ اتنا واضح ہے کہ ہر مسلمان اس کو بآسانی سمجھتا ہے' لیکن فتنۂ انکارِ حدیث کا زیادہ ادراک و

احساس نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ سرکاری سطح پر یہ طے ہے کہ قادیانی خواہ ربوائی (اصل قادیانی) ہوں یا لاہوری احمدی' دونوں دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انکارِ حدیث کا فتنہ اندر ہی اندر دیمک کی طرح اثر انداز ہو رہا ہے۔ یہ لوگ قرآن کریم کو ماننے اور سمجھنے کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن حدیثِ نبویؐ کو مناسب مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہیں' ان کے لیے صرف اخلاقی تعلیمات سے متعلق احادیث قابل قبول ہیں۔ حدیث شریف کو جائز مقام نہ دینے کی وجہ سے وہ قرآن حکیم کی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ اطاعتِ رسولؐ دائمی شے نہیں ہے' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی صرف اپنے زمانے کے لیے واجب الاطاعت تھی۔ قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴿۵۴﴾﴾ (النور)

''آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول مکرم کی۔ پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذمہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا' اور اگر تم اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اور نہیں ہے ہمارے رسول کے ذمہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام دے رہے ہیں۔''

اسی طرح سورۃ التغابن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴿۱۲﴾﴾

''اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول مکرم کی' پھر اگر تم نے روگردانی کی تو ہمارے رسول کے ذمہ فقط کھول کر پیغام پہنچانا ہے۔''

لیکن منکرینِ سنّت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ صرف اپنے دور کی حد تک ''مرکزِ ملّت'' ہونے کی حیثیت سے مطاع تھے اور ان کا حکم ماننا جانا ضروری تھا۔ آئندہ مسلمانوں کا جو امیر یا حاکم ہوگا' وہ مرکزِ ملت ہوگا اور اس حیثیت سے اس کی اطاعت

فرض ہو گی۔ یہ فتنہ بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ شریعت کی بہت ساری پابندیاں انہوں نے حدیث کو مناسب مقام نہ دینے کی وجہ سے نظر انداز کر دی ہیں۔ جیسے ان کے نزدیک پردے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ایک خاص دور کا کلچر تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کی اور بہت ساری غلط تشریحات کر رہے ہیں' ترجمہ غلط کر رہے ہیں۔ عام آدمی اور جدید تعلیم یافتہ لوگ عربی سے ناواقف ہوتے ہیں' لہٰذا وہ نہیں محسوس کر سکتے کہ ترجمہ غلط کیا جا رہا ہے۔ قادیانیوں نے بھی قرآن کریم کے ترجمہ میں تحریف کی۔ آخر وہی آیتیں ہیں جنہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر ہمارے دور کے علماء کرام تک تمام لوگ پڑھتے آئے ہیں' لیکن یہ لوگ ایسی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں کہ عقل کو بھی اپیل نہیں کرتیں۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ جب وہ کسی مسئلہ میں کسی شخص سے متاثر ہو جاتا ہے تو اس کی ہر بات کو صحیح سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

ان لوگوں کی چند تاویلیں ملاحظہ ہوں۔ قرآن کریم میں آیا ہے کہ چور مرد ہو یا عورت' ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ کہتے ہیں کہ بالفعل ہاتھ کاٹنا مراد نہیں ہے' یہ تو مولویوں نے خواہ مخواہ غلط بات سمجھی ہے' یہ تو بڑا وحشیانہ فعل ہے' ہاتھ کاٹ دینا تو ایک محاورہ ہے۔ جیسے کبھی والدین اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ تم نے تو ہمارے ہاتھ کاٹ دیے۔ یعنی کسی معاملہ میں تم نے کوئی ایسی بات کر دی ہے کہ اب ہمارے پاس کچھ نہیں رہا' کوئی چارۂ کار نہیں' تم نے ہمیں بے بس کر دیا ہے۔ گویا تم نے ہمارے ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایسا خوشحال معاشرہ پیدا کر دو کہ کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ ہو' بس یہ ہے ہاتھ کاٹ دینا۔ حالانکہ قرآن مجید اس کے بعد کہتا ہے: ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (المائدۃ:۳۸) ''بدلہ دینے کے لیے جو انہوں نے کیا (اور) عبرت ناک سزا اللہ کی طرف سے''۔ اب آپ سوچیں کہ مثالی نظام قائم کر دینا کوئی سزا ہے یا کوئی عبرت کی بات ہے؟

عجیب بات ہے کہ پنجاب نے دو غلام احمد پیدا کیے۔ ایک غلام احمد قادیانی' دوسرا غلام احمد پرویز۔ پہلے نے مہرِ ختمِ نبوت کو توڑا اور دوسرے نے حدیث اور سُنّتِ

رسول ﷺ کو شریعت کی مستقل بنیاد ہونے کی حیثیت سے چیلنج کر دیا۔ جیسے قادیانیوں کو مغرب کی آشیر باد حاصل ہے ایسے ہی حدیث کی قدر و قیمت کو گھٹانے والے لوگوں کو بھی ان کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کیونکہ تہذیبوں کے تصادم کے حوالے وہ اسلامی تہذیب کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا انحصار اکثر و بیشتر حدیث وسنت پر ہے۔ رینڈ کارپوریشن کی سفارشات میں شامل تھا کہ ایسے جدید تعلیم یافتہ لوگ جو اسلام کی ایسی تعبیریں کریں جو ہماری تہذیب کے ساتھ مماثل ہوں ان کی پشت پناہی کی جائے اور خاص طور پر انہیں الیکٹرانک میڈیا پر آنے کا بھرپور موقع دیا جائے۔ اور آج پاکستان میں بڑے پیمانے پر یہی ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے آج زیادہ ضرورت ہے کہ آپ حدیثِ نبویؐ کا مطالعہ کریں' تاکہ اس کی عظمت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا ایک رشتہ مضبوط ہو جائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

حدیث
(1)

عمل میں نیّت کی اہمیت
اور قرآن وحدیث میں ربط وتعلّق

یکم جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ (البقرۃ:۱۷۷)

عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِیٍٔ مَا نَوٰی ، فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ، وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَاَۃٍ یَنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ)) (متفقٌ علیہ)

آج ہم اللہ کا نام لے کر خطاباتِ جمعہ میں ’’اربعینِ نوویؒ‘‘ کے سلسلہ وار مطالعہ کا آغاز کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے بطورِ تمہید ’’حدیث کی اہمیت اور اس کا مقام ومرتبہ‘‘ کے موضوع پر خطاب کیا تھا۔ آج ہم ’’اربعینِ نوویؒ‘‘ کی پہلی حدیث کا مطالعہ کریں گے۔ اس حدیث مبارکہ سے پہلے میں نے خطبہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کا ابتدائی حصہ بھی پڑھا‘ تاکہ واضح ہو جائے کہ قرآن اور حدیث میں کتنا گہرا ربط ہے۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی سکّے کے دو رُخ یا بالفاظِ دیگر ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

قرآن مجید میں جو بات بڑے شاہانہ اندازِ خطاب میں آتی ہے احادیث میں وہ بات نہایت شاندار الفاظ میں آتی ہے تاکہ اس کی پوری طرح وضاحت ہو سکے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:٤٤)

''اور ہم نے آپ پر یہ الذکر (قرآن مجید) نازل فرمایا' تاکہ آپ لوگوں کے لیے واضح کریں جو اُن کی طرف نازل کیا گیا ہے۔''

قرآن کریم اصل میں لوگوں کی ہدایت کے لیے تھا جو آنحضور ﷺ کے پاس امانت تھا۔ اس لیے آپؐ کے ذریعے لوگوں کے لیے اس کی وضاحت ضروری تھی۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کو میں نے ''آیۃ البِر'' کا عنوان دیا ہے۔ معانی اور علم وحکمت کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین اور طویل ترین آیات میں سے ہے۔ اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کا جو تصور ہے وہ عمل کے محض ظاہری پہلو کے اعتبار سے ہے کہ یہ نیکی کا بہت بڑا کام ہے۔ اس لیے کہ اس نیک عمل کے پیچھے جو محرک ہوتا ہے وہ انہیں معلوم نہیں ہو سکتا' یا محض گمان کی حد تک ہوتا ہے' جبکہ گمان بھی یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارا نیکی کا یہ تصور رفتہ رفتہ صرف ظاہر تک محدود ہو جاتا ہے' باطن کی طرف توجہ نہیں رہتی۔

دراصل ہر عمل کے دو پہلو ہوتے ہیں' ایک اس کا ظاہر ہوتا ہے اور دوسرا باطن۔ یعنی باطن میں عمل کا محرک کیا ہے اور ظاہر میں عمل کی شکل کیا ہے۔ اگرچہ ظاہر بھی اپنی جگہ اہم ہے' اس لیے کہ ع ''لطافت بے کثافت جلوہ آرا ہو نہیں سکتی'' کے مصداق کسی لطیف شے کو واضح ہونے کے لیے کوئی کثیف شے درکار ہوتی ہے۔ لیکن اصل شے' جس پر زیادہ زور ہونا چاہیے' وہ اس کا باطن ہے' یعنی اس کی نیت۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف کر لو' بلکہ نیکی حقیقت میں اس کی ہے جو اللہ پر' روزِ قیامت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لایا۔''

یہ آیت مبارکہ ہمارے مرتب کردہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس نمبر۲

ہے‘ جس پر میں نے متعدد بار مفصّل دروس دیے ہیں۔اس وقت یہ بات سمجھانی مقصود ہے کہ ایمان سے نیکی کا کیا تعلق ہے۔ایمان درحقیقت کسی عمل کے محرک کو معیّن کرتا ہے۔ نیکی اللہ کی نگاہ میں صرف وہ عمل ہوگا جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کیا جائے اور جس کی جزا صرف آخرت میں مطلوب ہو۔ اگر دنیا میں اس کی جزا مطلوب ہے تو یہ ایک دھندا اور کاروبار ہے‘ نیکی ہرگز نہیں ہے۔کاروبار کرنا اپنی جگہ جائز ہے‘ لیکن وہ کاروبار کی شکل میں ہو۔ یہ چیز نہایت خطرناک اور گمراہ کن ہے کہ نیکی کا لبادہ اوڑھ کر اسے کاروبار کا ذریعہ بنایا جائے۔

مذکورہ بالا آیت میں ایمان باللہ کے بعد دیگر ایمانیات میں ایمان بالرسالت کا ذکر بھی ہے۔ درحقیقت ہمیں نبوت و رسالت کے ذریعے سے نیکی کا ایک ماڈل ملتا ہے کہ نیکی کے مختلف اعمال کسی شخصیت میں ایک توازن کے ساتھ آئیں۔ ورنہ بسا اوقات نیکی ہی کا جذبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر کے بدی کا راستہ کھول دیتا ہے۔چنانچہ نیکی ہی کا جذبہ تھا جس نے دنیا میں رہبانیت کی شکل اختیار کی۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ (الحدید:۲۷)

’’یہ رہبانیت تو خود انہوں نے (حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں نے) ایجاد کی‘ ہم نے تو یہ ان کے اوپر فرض نہیں کی تھی۔‘‘

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ)) (۱)

’’دینِ اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔‘‘

یہ بات ظاہر ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والے یہ کام کرتے تو نیکی کے جذبے سے ہیں‘ لیکن وہاں نیکی غیر معتدل اور غیر متوازن ہو جاتی ہے۔توازن کے ساتھ نیکی کا ایک مکمل مجسمہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک ہے جو ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔لیکن محرکاتِ عمل کا تعلق ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ سے ہے۔نیکی اسی لیے کی جائے کہ اللہ

---

(۱) مراسیل ابی داوٗد‘ ح ۲۸۷۔ وفتح الباری لابن حجر۹/۱۳۔ وسلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی ٤/۳۸۷۔

تعالیٰ راضی ہو جائے‘ اس سے صرف آخرت کی جزا اور اُخروی نجات مقصود ہو۔

اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے اس حدیث کے اندر سادہ انداز میں بیان فرمایا۔ اس حدیث کے بارے میں یہ بات جان لیں کہ اکثر محدّثین کرامؒ نے جو مجموعے مرتب کیے ہیں ان میں سب سے پہلے اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین کرامؒ بھی تو جمع وتدوین حدیث کی صورت میں ایک عمل اور ایک جِدّوجُہد کر رہے تھے۔ آنحضور ﷺ کی احادیث کی جمع وتدوین بہت بڑی نیکی تھی‘ اس پر جرح وتعدیل کا کام بہت محنت طلب تھا‘ جس میں بڑے خطرات تھے کہ کسی ایسے شخص کی روایت قبول نہ کر لی جائے جو جھوٹ بولتا ہو اور جھوٹی احادیث گھڑتا ہو‘ مبادا اُمت میں فتنہ پیدا ہو جائے۔ یہ ایک بڑی محنت طلب اور مشقت طلب جدوجہد تھی اور اس میں اصل شے ان کے نزدیک نیت کا معاملہ تھا‘ اسی لیے وہ اس حدیث کو پہلے لائے ہیں کہ اللہ کرے اس مجموعے کے مرتب کرنے میں ہماری نیت میں سوائے اللہ کی رضا اور آخرت کی جزا کے اور کوئی شے شامل نہ ہو۔

اب ہم اس حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی امیر المؤمنین ابوحفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں‘ چنانچہ ابوحفص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔ حدیث ہے: عَنْ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَبِیْ حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ﷺ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ ”امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود سنا اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے“۔ (اصل میں بعض اوقات روایت شروع ہو جاتی ہے ”عَنْ فُلَانٍ“ سے کہ فلاں صاحب سے روایت کیا گیا۔ اب یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان صاحب نے یہ خود آنحضور ﷺ سے سنا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے کسی صحابی سے سنا ہو‘ وہ خود براہِ راست سامع نہ ہوں۔ لہٰذا جب ”عَنْ“ سے بات شروع ہو تو کافی نہ ہو گی۔ یہاں فرمایا گیا: قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ ”فرماتے ہیں: میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا“)۔ اب آگے حدیث کا متن ہے: ((اِنَّمَا

الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) ''بے شک اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے''۔ یہاں عام آدمی سمجھے گا کہ ''عمل'' کا لفظ عام ہے اور نیکی اور بدی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ لیکن یہ مغالطہ ہے۔ عربی زبان میں جو دو الفاظ ''عمل'' اور ''فعل'' اور ان کی جمع ''اعمال'' اور ''افعال'' ہیں' ان کے استعمال میں فرق ہے۔ اس ضمن میں قرآن و حدیث سے جو وضاحت ہوتی ہے وہ یہ کہ ''عمل'' کہتے ہیں اس کام کو جس میں مشقت ہوتی ہو' جو محنت طلب ہو' جس کے بعد انسان تکان محسوس کرے۔ اسی لیے قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴﴾ (الغاشیۃ) ''بعض چہروں پر قیامت کے دن تکان طاری ہوگی' وہ لوگ ہوں گے تپتی ہوئی آگ کے اندر''۔ یہاں حدیث مبارکہ میں گفتگو نیکی کے بارے میں ہو رہی ہے' برائی کے کام کی بات نہیں ہو رہی کہ آپ کر تو معصیت کا کام رہے ہیں لیکن نیت آپ کی نیک ہے۔ قرآن وحدیث کے بعض مقامات اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہاں اعمال کا اطلاق معصیت اور گناہ کے کاموں پر نہیں ہوگا' بلکہ نیک اور بھلے کاموں پر ہوگا۔

آگے فرمایا: ((وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى)) ''اور ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی''۔ عمل کا ظاہر کچھ بھی ہو' لیکن اللہ کی نگاہ میں اصل شے اس کام کے پیچھے انسان کی نیت ہے۔ عرفِ عام میں اسے یوں سمجھئے کہ جب الیکشن کا دَور آنے والا ہو تو اب وہ چودھری اور سرمایہ دار جو اپنے محل میں ٹکا رہتا ہے' اب گلیوں میں نکلتا ہے' غریبوں سے بغل گیر ہوتا ہے' میلے کچیلے بچوں کو گود میں اٹھاتا اور انہیں پیار کرتا ہے۔ اب اس کا فیصلہ سب دیکھنے والے کر لیتے ہیں کہ وہ کس لیے ایسا کر رہا ہے۔ یہ کوئی حقیقی شفقت و محبت نہیں ہے' جو کہ نیکی کے کام ہیں' بلکہ یہ تو ووٹ لینے کا ایک دھندہ ہے۔ یہ تو ایسی حرکات ہیں جو ہمیں نظر آ رہی ہیں اور جن کے بارے میں ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن بعض چیزیں ہمارے مشاہدے سے بالکل مخفی ہوتی ہیں۔ اس کے لیے انسان کے اندر خود احتسابی ہونی چاہیے کہ میں کیا کر رہا ہوں' کس لیے کر رہا ہوں' کہیں میری نیت میں کوئی فساد تو پیدا نہیں ہو گیا' کہیں مجھ پر شیطان تو حملہ آور نہیں ہو گیا۔ لہٰذا جو نیت ہوگی

وہی ملے گا' صرف عمل کے ظاہری پہلو سے جزا نہیں ملے گی۔ کسی نے بڑی فاؤنڈیشن بنا دی ہو اور اس سے لوگوں کو بہت خیر پہنچ رہا ہو' لیکن آپ کو کیا معلوم کہ اس کے پیچھے اس کی نیت کیا ہے۔ آیا سرکار دربار میں رسائی حاصل کرنا اور انکم ٹیکس میں ہیرا پھیری اس کا مقصد ہے یا اللہ کی رضا پیش نظر ہے' یہ صرف اللہ جانتا ہے۔ دنیا میں ہم کہیں گے کہ نیکی کا کام ہے' بڑا اچھا کام ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس شخص کا سارا معاملہ نیت کے حوالے سے طے ہوگا۔

اب اس کے لیے آنحضور ﷺ نے ایک مثال دی: ((فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ)) ''پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی' تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ ہی کے حساب میں شمار ہوگی''۔

ہجرت یہ تھی کہ اہل ایمان کو حکم ہو گیا تھا کہ مکہ مکرمہ کو چھوڑ و اور مدینہ منورہ پہنچو۔ اہل وعیال کو چھوڑنا پڑے تو مکہ مکرمہ کے بھیڑیوں کے رحم وکرم پر چھوڑو۔ اسی طرح جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے قبائل میں مسلمان تھے انہیں بھی حکم تھا کہ اپنے قبیلوں کو چھوڑو اور مدینہ منورہ چلے آؤ۔ تمام اہلِ ایمان کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر جانے کے حکم کی وجہ میں نے اپنی کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' میں پورے دلائل کے ساتھ بیان کی ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد میں وہ دَور آ رہا تھا جس میں کفر کے ساتھ براہِ راست تصادم ہونا تھا' لہٰذا ضرورت تھی کہ پوری قوت ایک مرکز پر جمع ہو جائے' کیونکہ اگر قوت منتشر ہے' کچھ لوگ یہاں ہیں کچھ وہاں ہیں تو کوئی مؤثر اقدام نہیں کیا جا سکتا' لہٰذا یہ ہجرت فرض تھی۔ اس سے پہلے حبشہ کی طرف دو ہجرتیں ہوئیں تھیں جو کہ رضا کارانہ تھیں' ان میں صرف اجازت دی گئی تھی کہ اگر یہاں کی سختیاں نہیں جھیلی جا رہی ہیں اور صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے تو حبشہ میں جا کر پناہ گزیں ہو جاؤ۔ اس لیے کہ وہاں ایک عادل' نیک اور اچھا بادشاہ ہے۔ لیکن مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرض تھی' کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کے اندر ایک اہم قدم کی حیثیت رکھتی تھی۔

اب دیکھیں ہجرت کا ظاہر تو یہ ہے کہ کوئی شخص مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آ گیا ہے' اسے ہم مہاجر ہی کہیں گے' لیکن اس کی ہجرت کا اصل سبب کیا ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان' اُن کی محبت اور ان کے حکم کی پیروی ہے یا کوئی اور مقصد ہے؟ یہ اللہ جانتا ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں: ((فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا)) ''اور جس کی ہجرت ہوئی دنیا کے حصول کے لیے تا کہ دنیا حاصل کرے'' ((اَوِ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا)) ''یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کی'' ((فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ)) ''تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے شمار ہوگی جس کے لیے اس نے ہجرت کی''۔ اس بات کو سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ مکہ مکرمہ میں کوئی مسلمان دکانداری کر رہا تھا یا کوئی اور کام کر رہا تھا' جیسے حضرت خباب رضی اللہ عنہ لوہار تھے' تو اس کے ایمان لانے کے بعد کفار تو اُس سے کوئی کام نہیں کرواتے ہوں گے' کیونکہ اہلِ ایمان اور کفار کے مابین کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور صرف اہلِ ایمان ہی اس سے کام کرواتے ہوں گے' اور اب وہ تو مدینہ منورہ چلے گئے۔ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے گاہکوں کی خاطر مدینہ منورہ ہجرت کر گیا ہو۔ یہ باریک بات ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے' کوئی دوسرا شخص کسی پر کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے علمِ کامل کے حساب سے اپنے رسول ﷺ کو بتا رہا ہے اور آپ ﷺ ہمیں بتا رہے ہیں۔ یا فرض کریں کوئی صاحب کسی خاتون سے نکاح کے خواہش مند تھے' وہ خاتون ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلی گئیں تو اب یہ بھی کچے دھاگے سے بندھے وہاں پہنچ گئے۔ اب یہ بھی ہجرت تو کر رہے ہیں' لیکن ان کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے شمار نہیں ہوگی' بلکہ اس خاتون کے عشق اور محبت کے زمرے میں آئے گی۔ کہتے ہیں کہ ایک صاحب کو ''مہاجر اُمِّ قیس'' کہا جاتا تھا' یعنی انہوں نے اُمِّ قیس کے لیے ہجرت کی تھی۔

بہر حال اللہ کے ہاں کسی بھی عمل کا دارومدار نیت پر ہوگا اور دنیا میں ہم نیتوں کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کسی کی نیت پر شک کرنا اور حملہ کرنا جائز نہیں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ دلوں کا حال کیا ہے۔ دلوں کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ وہ ''عَلِيْمٌ

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ'' ہے۔حدیث نبویؐ ہے:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ))(۱)

''بے شک اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا' بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔''

اگر عمل صحیح اور نیک ہے اور دل میں اس کے لیے جو محرک اور جذبہ ہے وہ بھی صحیح ہے تو ایسا عمل اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔اب اسی حوالے سے چند احادیث دیکھیں کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ نے کس انتہا تک پہنچائی ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۲)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا' اور جس نے ریاکاری کے لیے صدقہ وخیرات کیا اس نے بھی شرک کیا''۔

اب دیکھیں نماز اگرچہ نیکی کا بہت بڑا کام اور ارکانِ اسلام میں سے رکن اعظم ہے' ایسے ہی روزہ اسلام کا عظیم رکن ہے اور صدقہ وخیرات بہت عظیم کارِ خیر ہیں' لیکن اس کے باوجود اگر یہ کام رضائے الٰہی کے بجائے ریاکاری' اپنی دین داری کا رعب گانٹھنے یا کسی اور مقصد کے لیے ہیں تو شرک کے زمرے میں آئیں گے —— اور شرک سے بڑا اور گھناؤنا گناہ اور کوئی نہیں ہے۔سورۃ النساء میں دو مقامات پر فرمایا گیا:﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ﴾ (آیات ۴۸ و ۱۱۶) ''بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہرگز نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' ہاں اس سے کم تر گناہ جس کو چاہے گا معاف فرما دے گا''۔

شرک دو طرح کا ہے۔ایک شرکِ جلی ہے اور دوسرا شرکِ خفی۔شرکِ جلی وہ ہے جو

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ......

(۲) مسند احمد' ح ۱۶۵۱۷۔

نظر آ رہا ہو کہ شرک ہو رہا ہے۔ مثلاً بُت یا کسی قبر کو سجدہ کیا جا رہا ہے' جبکہ شرکِ خفی دل میں ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نماز میں سجدہ کر رہے ہوں اور آپ کو یہ محسوس ہو کہ کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے تو آپ سجدہ ذرا لمبا کر دیں تو یہ شرکِ خفی ہے۔ اس کا تجزیہ آپ آسانی سے کر سکتے ہیں' مثلاً آپ پہلے پانچ سیکنڈ کا سجدہ کر رہے تھے اور اب دس سیکنڈ کا سجدہ کیا ہے تو یہ اضافی پانچ سیکنڈ کس کے لیے لگے ہیں؟ پانچ سیکنڈ تو اللہ کے لیے ہو گئے لیکن دوسرے پانچ کس کے لیے؟ گویا ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے۔ ایک مسجود اللہ کی ذات ہوئی اور ایک مسجود وہ لوگ ہوئے جنہیں دکھایا جا رہا ہے۔

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تربیت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جس حد تک باریک بینی آ گئی تھی اس کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک موقع پر عین حالتِ جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک شخص سے دوبدو مقابلہ ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کافر کو زیر کر لیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے۔ اب اسے خنجر گھونپنے ہی والے تھے کہ اس نے نیچے پڑے ہوئے بھی آپؓ کے منہ پر تھوک دیا۔ (جیسے انگریزی میں کہا جاتا ہے: To add insult to injury) حضرت علیؓ نے اس کی اس حرکت کے بعد اسے چھوڑ دیا اور فوراً اس کے سینے سے نیچے اتر آئے۔ وہ بہت حیران ہوا کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے جبکہ میں نے ان کی توہین بھی کی ہے! اس کے استفسار پر حضرت علیؓ فرمانے لگے: دیکھو! میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے' میں تمہیں صرف اللہ کے لیے قتل کر رہا تھا' لیکن اب اگر میں تمہیں قتل کرتا جبکہ تم نے میری توہین کی ہے' تو میری نیت میں میرے نفس کا انتقام بھی شامل ہو جاتا۔ ذرا غور کیجیے کہ جنگ کا معاملہ ہو' جو جذبات کی انتہائی گرمی کا وقت ہوتا ہے' مرو یا مارو کی کیفیت ہوتی ہے' اس حالت میں بھی انسان کی نگاہ دل اور نیت پر ہو' یہ رسول اللہ ﷺ کی تربیت کا ہی کمال تھا۔

یہ مضمون قرآن مجید میں بڑی حسین تمثیلوں کے پیرائے میں تین جگہ آیا ہے۔ ایک مقام سورۃ النور کا پانچواں رکوع ہے جو قرآن مجید کے بڑے اہم مقامات میں سے ہے

جس میں حکمت کے بڑے بڑے موتی ہیں۔ یہاں تین قسم کے لوگوں کا ذکر ہے۔ پہلے مؤمن صادق کی مثال بیان ہوئی ہے اور اس کے ایمان کی جھلک بھی دکھائی گئی ہے کہ اُس کا باطن نورِ ایمان سے منور ہوتا ہے اور ظاہر اعمالِ صالحہ سے مزین ہوتا ہے۔ مؤمن کے دل میں جو نورِ ایمان ہوتا ہے یہ دو نوروں کے امتزاج سے بنتا ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ (النور:۳۵) ''یہ روشنی پر روشنی ہے''۔ (اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ''اے اللہ! ہمیں ان میں شامل فرما!'') پھر ایک دوسری مثال' جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے' ایسے شخص کی دی گئی جس میں ایمان تو نہیں ہے لیکن ظاہری طور پر کچھ نیک اعمال ہیں' مثلاً غریبوں' مسکینوں کو کھانا کھلانا۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن' بعث بعد الموت کے وقت یاد آئے گا کہ میں نے تو بہت نیکیاں کی تھیں' ان کا کچھ تو اجر مجھے ملنا چاہیے۔ ایسے شخص کی تمثیل یوں بیان کی گئی: ﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُھُمْ کَسَرَابٍۢ بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ﴾ ''اور جن لوگوں نے کفر کیا (جنہوں نے اللہ اور آخرت کو نہیں مانا) ان کے اعمال (ان کی نیکیاں) سراب کی مانند ہیں جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے''۔ جیسے کہ صحرا میں دور سے پانی نظر آتا ہے' حالانکہ پانی نہیں ہوتا۔ اب پیاسا آدمی دوڑتا ہوا اُس کی طرف جا رہا ہے یہاں تک کہ تھک جاتا ہے' اب بھاگا نہیں جاتا تو گھسٹتا ہوا جا رہا ہے۔ ﴿حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا﴾ (النور:۳۹) ''یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا''۔ ﴿وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾﴾ (النور) ''اور وہ وہاں اللہ کو پائے گا جو اسے اس کا حساب پورا پورا عطا کرے گا۔ اور اللہ کو حساب لیتے دیر نہیں لگتی''۔ تمہارے اعمال میں نیت غلط تھی' لہٰذا تمہاری نیکیاں سراب کی مانند ہیں۔ انسان اپنے آپ کو سہارا دیتا ہے کہ وہ بڑے نیک اعمال کر رہا ہے' لیکن اگر اس میں خلوصِ نیت نہیں ہے' یعنی اللہ کی رضا اور آخرت کی جزا پیش نظر نہیں ہے تو وہ کوئی نیکی نہیں ہے۔

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں کہ جن کے دل میں تاریکی ہی تاریکی ہے اور عمل میں

کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی کی روشنی بھی نہیں' یہ خالص نفس پرست اور خالص مفاد پرست لوگ ہیں۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے: ﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ﴾ (آیت ۴۰) ''یا پھر (اس کی مثال ایسی ہے) جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا' کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے' اس پر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل۔ تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔''

دوسرا مقام سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑱﴾

''جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال (جو ظاہر میں نیکیاں نظر آتی ہیں) کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے پر کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے (اس کا کچھ بھی پھل نہ پائیں گے)۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے''۔

یہ نیکیاں اس لیے قابل قبول نہیں کہ یہ ایمان کے محرک سے خالی' محض دکھلاوے کی نیکیاں ہیں۔

اس سلسلے کا آخری مقام سورۃ الفرقان کی آیت ۲۳ ہے جس میں ایک عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاۗءً مَّنْثُوْرًا ㉓﴾ ''پھر ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو انہوں نے کیے تھے اور انہیں بنا ڈالا اڑتی ہوئی خاک''۔ یہاں کفار کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے خیال میں بڑے بڑے اعمال کیے ہوئے تھے' غریبوں کو کھانے کھلائے تھے۔ جیسا کہ ابوجہل نے کہا تھا جب اس سے پوچھا گیا تھا کہ کیا تمہارے خیال میں محمد (ﷺ) جھوٹ بول رہے ہیں جو یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ اُن کے پاس وحی آتی ہے' وہ اللہ کے نبی ہیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ آپ (ﷺ) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پوچھا گیا تو پھر مانتے کیوں نہیں ہو؟ اس نے کہا: ہمارے اور بنوہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ چل رہا تھا' انہوں نے غریبوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ انہوں نے حاجیوں کی خدمت کی تو

ہم نے ان سے بڑھ کر خدمت کی۔ تو ابھی تک ہم ان کے کندھے سے کندھا ملا کر آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم بنو ہاشم کے ایک فرد محمد (ﷺ) کی نبوت مان لیں تو ہم تو ہمیشہ کے لیے غلام ہو جائیں گے! یہ ہمیں گوارا نہیں ہے۔ دیکھئے اِن کفار کے اندر بھی نیکی کا ایک تصور اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا جذبہ پایا جاتا ہے' تاکہ زیادہ شہرت ہو جائے' زیادہ تعریف ہو' ان کی سخاوت کے زیادہ ڈنکے بجیں۔ مذکورہ بالا آیت میں ''مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ '' میں جو نکرہ کا استعمال ہوا ہے تو یہ تفخیم کے لیے ہے۔ یعنی ہم آگے بڑھ کر اُن کے بڑے بڑے اعمال کو گرد و غبار میں ملا دیں گے۔ بات سمجھانے کے لیے بلاتشبیہ عرض کر رہا ہوں کہ جیسے ایک فٹ بال کھیلنے والا دوڑ کر آتا ہے' پھر بال کو ہٹ لگاتا ہے' اسی طریقے سے ﴿قَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ﴾ ''ہم ان کے اعمال کی طرف بڑھیں گے'' ﴿فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ ''تو ہم اسے کر دیں گے گرد و غبار پھیلا ہوا''۔ گویا وہ اعمال کیا تھے' محض گرد و غبار اور راکھ تھی جو منتشر ہو گئی۔

دیکھئے کس قدر خوبصورت تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ'' کہ بادشاہوں کا کلام' کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ تینوں تمثیلیں ریاکارانہ نیکی کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ ان سب کے لیے سادہ ترین تشریح' تفسیر اور تبیین رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ......)) ہے۔ اور میں آپ کے سامنے یہی بات پیش کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن اور حدیث کا باہمی رشتہ کیا ہے۔

ہماری آج کی اس گفتگو سے ایک اور اہم مسئلہ بھی حل ہو رہا ہے۔ ہمارے نوجوان پوچھتے ہیں کہ کفار جو اتنے بڑے بڑے نیکی کے کام کرتے ہیں تو کیا انہیں کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا؟ جیسے ہندو پُن (کارِ خیر) کے کام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر گنگا رام ایک ہندو تھا' اس نے بہت بڑا ہسپتال بنایا۔ یا جیسے یورپ اور امریکہ میں رہنے والے انگریز اور عیسائی فلاح و بہبود کے بڑے بڑے ادارے قائم کرتے ہیں' اور نیکی کے بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ تو کیا اللہ کے ہاں ایسے لوگوں کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں

ہوگی؟ دیکھئے یہ لوگ اللہ' اس کے رسول اور آخرت کو نہیں مانتے تو پھر لازماً کوئی اور محرک ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ نیکی کے کام کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے لازماً کوئی ریاکاری' شہرت یا سرکار دربار میں رسائی وغیرہ مقصود ہوگی۔ کوئی نہ کوئی نیت تو ہوگی' کیونکہ کوئی عمل نیت اور مقصد کے بغیر نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک شخص رسول کو نہیں مانتا لیکن اللہ اور آخرت کو مانتا ہے' لہٰذا اس کے اعمال قابلِ قبول ہونے چاہئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسا شخص رسول کو کیوں نہیں مانتا؟ ایک ایسے شخص کا معاملہ تو علیحدہ ہے جس تک رسول کی دعوت نہیں پہنچی۔ ایسا شخص اگر توحید پر قائم ہو اور آخرت کو مانتا ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے اعمال قبول ہوسکتے ہیں' کیونکہ رسالت کا پیغام اس تک پہنچا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں آپؐ کا پیغام تو صرف عرب کی حدود تک پہنچا تھا' یا آپ ﷺ نے جو خطوط لکھے تو وہ صرف بادشاہوں کو لکھے تھے' عوام تک تو نہیں گئے تھے۔ یا پھر جن علاقوں کو مسلمانوں نے فتح کیا تو وہاں کے لوگوں نے اسلام کو سمجھا' اسلام کو دیکھا' مسلمانوں کو دیکھا اور اسلام کی برکات کو دیکھا' لیکن جہاں مسلمان نہیں گئے وہاں اسلام کی تعلیمات نہیں پہنچیں۔ مثلاً چین میں رہنے والوں تک تو یہ پیغام نہیں پہنچا تھا' لہٰذا وہ مستثنیٰ ہوں گے' ان سے توحید پر معاملہ ہوگا۔

البتہ جن لوگوں تک رسالت کا پیغام پہنچ گیا' یہاں تک کہ اتنی بات بھی پہنچ گئی کہ محمد (ﷺ) نام کے ایک شخص گزرے ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے' تو وہ شخص تحقیق کر کے رسالت پر ایمان کا مکلّف ٹھہرے گا۔ اور اگر وہ کوئی حق پرست ہوگا تو لازماً تحقیق کرے گا' بیٹھا نہیں رہے گا۔ اگر وہ حق کا طلب گار اور جویا ہے تو اس صورت میں لازماً اللہ اسے منزل تک پہنچا دے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جن لوگوں نے ہمارے راستے میں جدوجہد کی ہم انہیں لازماً اپنے (ہدایت کے) راستے دکھائیں گے''۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے تلاشِ حق میں کتنی محنت اور جِدّوجُہد کی ہے۔ مجھے تو بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی شخصیت ہر لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک شبیہہ (Replica) ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فارس میں پیدا ہوئے' باپ آتش کدے کا پجاری یا ذمہ دار تھا۔ ان کے دل میں یہ بات آئی کہ یہ کیا تماشا ہے کہ آگ ہم خود جلائیں' ایندھن ہم ڈالیں تو آگ جلے' پھر اسی آگ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں! آپ نے بغاوت کی کہ میں ایک اللہ کو مانوں گا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا اور کہا تھا: ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا۝۴۶﴾ (مریم) ''اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور مجھ سے ایک مدت کے لیے دُور ہو جاؤ''۔ ایسے ہی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے شہر ''اُر'' میں پیدا ہوئے۔ جیسے انہوں نے عراق سے شام کی طرف ہجرت کی ایسے ہی حضرت سلمان فارسیؓ نے ایران سے عراق کی طرف ہجرت کی۔ عراق سے متصل شام ہے اور ایران سے متصل عراق ہے۔ وہاں جا کر انہوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ اس لیے کہ اُس وقت تک عیسائیت ہی ''اسلام'' تھا' کیونکہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کی ابھی تک بعثت نہیں ہوئی تھی۔ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نہیں ہوئی حضرت مسیح علیہ السلام ہی کا دَورِ نبوت و رسالت جاری رہا۔ لہٰذا وہ عیسائی ہو گئے۔ اب وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے عیسائی راہبین کے پاس گئے۔ پہلے ایک کے پاس آئے اور تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس کے انتقال کا وقت آیا تو فرمایا کہ میری تو ابھی تسلی اور اطمینان نہیں ہوا' میری طلب علم کی سیری ابھی نہیں ہوئی۔ اس نے مشورہ دیا کہ اچھا اب فلاں راہب کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں پہنچ گئے' وہاں زیر تعلیم و تربیت رہے۔ اس کی بھی رحلت کا وقت آ گیا تو آپؓ نے اس سے بھی یہی کہا کہ میرے علم کی تشنگی ابھی باقی ہے۔ تب اس نے کہا کہ میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ جنوب کی طرف کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہونے والا ہے۔

عیسائیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں بڑے حق پرست اور حق کا علم رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ وہ سائمن (شمعون) کے پیروکار تھے اور موحدین تھے' جبکہ آج

کی عیسائیت گمراہ ہو چکی ہے۔ آج کی عیسائیت پال ازم ہے۔ یہ سب سینٹ پال کے پیروکار ہیں، جس نے تثلیث ایجاد کی اور شریعت موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ساقط کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار موجود تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ بحیرہ راہب نے آنحضور ﷺ کو بچپن میں پہچان لیا تھا جب آپ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ ایک قافلے کے ساتھ گئے۔ اس راہب نے آپؐ کو پہچان کر ابوطالب سے کہا تھا کہ اس کی حفاظت کرنا، کہیں یہودی ان کو پہچان کر قتل نہ کر دیں۔ ایسے ہی ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ جاؤ! میرا علم بتا رہا ہے کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) کا ظہور اب قریب ہے اور وہ ہوگا جنوب کی طرف کھجوروں کی سرزمین میں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے رختِ سفر باندھا اور ایک قافلے میں شریک ہو گئے جو مدینہ منورہ کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے قافلے کو لوٹ لیا اور ان کو گرفتار کر کے غلام بنا کر بیچ دیا۔ مدینہ منورہ کے ایک یہودی نے انہیں خریدا۔ چنانچہ یوں آپؓ مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہ طلبِ صادق کا نتیجہ ہے۔ اب آگے مکہ مکرمہ نہیں جا سکتے، لیکن آپؓ سن رہے ہیں کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، لیکن جائیں کیسے! پاؤں میں غلامی کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر خود تشریف لے آئے۔ گویا یہاں کنواں چل کر پیاسے کے پاس آ گیا۔ اب آپؓ اپنے مالک سے کچھ کھجوریں حاصل کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یہ آپ کے لیے صدقہ لایا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں صدقہ نہیں لیتا، یہ غریبوں کا حق ہے''۔ یہ بات اس راہب نے آپؓ کو بتائی تھی کہ یہ ان کی نشانی ہوگی کہ صدقہ قبول نہیں کریں گے، ہدیہ قبول کر لیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد حضرت سلمانؓ دوبارہ کھجوریں لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ ہدیہ ہے۔ آپؐ نے ہدیہ قبول کر لیا۔ اب آپؓ ایمان لے آئے۔

غور فرمائیں کہ ایک انسان میں اگر طلبِ حق ہے تو وہ اس کے لیے کیا کیا مشقتیں

جھیلتا ہے! لہٰذا اگر کسی شخص تک محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا پیغام پہنچ چکے اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو یا تو وہ عصبیت جاہلی کے اندر اور اپنے زعم میں مبتلا ہے یا اس کے اندر طلبِ صادق اور طلبِ حق موجود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام اعمال میں خلوص اور اخلاص کی روح پھونکے اور ہر عمل میں اپنی رضا اور آخرت کی فلاح پیشِ نظر رکھنے کی توفیق بخشے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِOO

حدیث ②

اسلام‘ ایمان اور احسان (۱)

حدیثِ جبرائیلؑ کی روشنی میں

۸ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ (النساء:۱۳۶)

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۠ (المائدۃ)

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (الحُجُرٰت:۱۴)

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ:

بَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰی عَلَیْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ، حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْهِ اِلٰی رُکْبَتَیْهِ وَوَضَعَ کَفَّیْهِ عَلٰی فَخِذَیْهِ، وَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِیْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِیَ الزَّکَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ

اِلَيْهِ سَبِيْلًا)) قَالَ :صَدَقْتَ' قَالَ :فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْاَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ' قَالَ :فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِيْمَانِ! قَالَ :((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ' وَمَلَائِكَتِهٖ ' وَكُتُبِهٖ ' وَرُسُلِهٖ ' وَالْيَوْمِ الْآخِرِ' وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) قَالَ: صَدَقْتَ' قَالَ: فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ! قَالَ:((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) قَالَ :فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ! قَالَ :((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ :فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا! قَالَ :((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا' وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْيَانِ)) ثُمَّ انْطَلَقَ' فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِیْ: ((يَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟)) قُلْتُ :اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ' قَالَ : ((فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ' اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ)) (رواہ مسلم)

آج جو حدیث ہمارے زیرِ مطالعہ ہے اور جس کا متن میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا ہے' اس کو ''حدیثِ جبرائیل'' کہا جاتا ہے اور اسے ''اُمّ السُّنّۃ'' قرار دیا گیا ہے' یعنی سُنّت کی جڑ اور بنیاد۔ جیسے سورۃ الفاتحہ کو ''اُمّ القرآن'' قرار دیا گیا ہے' یعنی قرآن مجید کے فلسفہ وحکمت کی جڑ اور بنیاد۔ اس حدیث کی عظمت کو عہدِ حاضر میں دو اشخاص نے پورے طور پر پہچانا ہے' ان میں سے ایک سفید فام امریکی William C.Chittick اور دوسری اس کی جاپانی بیوی Sachiko Murata ہے۔ ان کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے یا نہیں' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہناً اور قلباً مسلمان ہیں اگرچہ انہوں نے اعلان نہ کیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہو' کیونکہ ہماری معلومات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے۔ واللہ اعلم! ان دونوں نے انتہائی گہرے مطالعے کے بعد اِس حدیث کی روشنی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: "Vision of Islam" یہ کتاب تقریباً ڈھائی تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ کتاب سہیل اکیڈمی لاہور نے شائع کی ہے جو بازار میں دستیاب ہے۔ جو لوگ علمی ذوق رکھتے ہوں وہ اسے حاصل کر کے پڑھیں۔

یہ حدیث احادیث کی پانچ کتابوں میں ہے اور پانچ ہی صحابہؓ سے منقول ہے' یعنی

حضراتِ عمر بن خطاب' ابو ہریرہ' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر اور ابو عامر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے چار طُرق سے مروی ہے۔ ان میں سے جو متفق علیہ روایت ہے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے' لیکن جو مقبول ترین روایت ہے' جس کا متن اوپر پیش کیا گیا ہے' یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیح مسلم (کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان) میں ہے۔

مراتب میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم برابر نہیں تھے' سب کے اپنے اپنے مراتب تھے۔ کچھ صحابہؓ کو فقہائے صحابہ کہا جاتا تھا' اس لیے کہ وہ فہمِ دین میں دوسروں سے زیادہ مرتبہ رکھتے تھے۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ چوٹی کے مقام پر ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی چوٹی کے فقہاءِ صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان صحابہؓ سے مروی احادیث کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ جو اِس حدیث مبارک میں بیان ہو رہا ہے' یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا ہے۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں ہے کہ یہ آپؐ کی زندگی کے آخری دنوں کا واقعہ ہے۔ مولانا بدرِ عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے' جن کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا' اس حدیث کے تمام طُرق اپنی کتاب ''ترجمان السُنّۃ'' میں تفصیلاً بیان کیے ہیں۔ اس حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اصل میں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے' لیکن واقعہ کی تفصیلات کے ضمن میں کچھ مزید پہلو دوسری روایات میں آئے ہیں اور وہ بھی یہاں بیان کیے جائیں گے۔ ان میں یقیناً متن کے الفاظ میں بھی کچھ فرق ہے' لیکن واقعاتی تفصیل میں کچھ زیادہ فرق ہے۔

قرآن اور حدیث میں بنیادی فرق میں بارہا بیان کر چکا ہوں کہ قرآن وحیٔ جلی پر مشتمل ہے اور وحی باللّفظ ہے' یعنی الفاظ اللہ تعالیٰ کے ہیں جبکہ حدیثِ نبویؐ بھی اگرچہ وحی پر مبنی ہے لیکن وحیٔ خفی ہے۔ اس کے الفاظ متفق علیہ اور محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ راویوں کے بیان میں لفظی طور پر فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال ہے کہ آپ کسی محفل میں چند جملے بولیے اور پھر تھوڑی دیر بعد حاضرینِ محفل سے پوچھئے کہ میں نے کیا

کہا تھا‘ تو ہر ایک کے بیان میں کچھ نہ کچھ فرق واقع ہو جائے گا۔ البتہ حدیث اپنی روح‘ اپنے ہدف اور مضمون کے اعتبار سے متفق علیہ ہے‘ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی اس روایت کا سلسلہ وار مطالعہ کرتے ہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے اگر ہم اپنے آپ کو اُس ماحول کا حصہ سمجھیں تو اس واقعے کو چشمِ تصور سے دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ** ”اس اثنا میں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے“۔ **اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ‘ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ** ”کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے کپڑے انتہائی سفید اور اس کے بال انتہائی سیاہ تھے (میل اور گرد و غبار کے کوئی آثار نہیں تھے)“۔ ایک روایت میں **حَسَنُ الْوَجْهِ** ”نہایت خوبصورت انسان“ کے الفاظ بھی ہیں۔ لوگوں نے اُس وقت سوچا ہوگا کہ یہ کون ہیں؟ **لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ** ”اس شخص پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے“۔ اگر وہ باہر سے آیا ہوتا تو اُس کے کپڑے گرد آلود ہوتے‘ بالوں میں کچھ غبار ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ باہر سے نہیں آیا ہے۔ **وَلَا يَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ** ”اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں تھا“۔ ایک روایت میں اضافہ ہے: **فَنَظَرَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ** ”تو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے“۔ گویا اشاروں سے ہی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ پوری مجلس میں ان کا کوئی شناسا نہیں۔ اگر وہ شخص کسی کے ہاں مہمان آیا ہوتا تو وہ میزبان اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ یہ میرے مہمان ہیں‘ اور اگر براہِ راست آئے ہوتے تو ان کے بالوں اور کپڑوں پر سفر کے کچھ آثار ہوتے۔ ایک روایت میں ہے کہ ”ان کی داڑھی کے بال نہایت سیاہ تھے“۔ عام بالوں کی بجائے داڑھی کے بالوں کے تذکرے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عام طور پر عرب اپنے سر کو ڈھانپے ہوئے رکھتے تھے۔ اس لیے اس شخصیت کے داڑھی کے بالوں کا تذکرہ ہے کہ وہ انتہائی سیاہ تھے۔

حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ ”یہاں تک کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آ بیٹھا“۔ ایک روایت میں ہے: **قَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ آتِيْكَ؟** ”اُس نے پوچھا: اے اللہ

کے رسول! کیا میں حاضر ہو جاؤں؟" قَالَ: ((نَعَمْ)) "آپؐ نے فرمایا: "ہاں آؤ"۔ بلکہ اس روایت میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے کہا: ((اُدْنُوْهُ)) "اسے قریب آنے دو"۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے حکم سے مجمع چھٹ گیا ہوگا اور راستہ بن گیا ہوگا' لہٰذا وہ تیر کی طرح سیدھا آیا اور آپؐ کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ "پس اس نے اپنے دونوں گھٹنے رسول اللہ ﷺ کے دونوں گھٹنوں سے ملا دیے"۔ آنجناب ﷺ بھی دوزانو تشریف فرما ہوں گے اور وہ بھی دوزانو ہو گئے' لہٰذا دونوں کے گھٹنے ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ۔ اس جزو کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں' یعنی "اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے زانوؤں پر رکھ دیں" یا "اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنحضور ﷺ کے دونوں زانوؤں پر رکھ دیں"۔ اس لیے کہ فَخِذَيْهِ میں ضمیر "هُ" دونوں طرف ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت میں وضاحت ہے: عَلٰى رُكْبَتَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ "اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں رسول اللہ ﷺ کے گھٹنوں پر رکھ دیں"۔ وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ "اور اس نے کہا: اے محمد (ﷺ)"۔ ایک روایت میں "يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" کے الفاظ ہیں کہ اُس نے کہا: "اے اللہ کے رسول!" اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ "مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے!" ایک روایت میں ہے: حَدِّثْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ یا حَدِّثْنِيْ بِالْاِسْلَامِ "میرے لیے بیان فرمایئے کہ اسلام کیا ہے!"

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا)) "تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تُو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور تُو نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو"۔ قَالَ: صَدَقْتَ "اُس شخص نے کہا: آپؐ نے درست فرمایا"۔ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْاَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ "تو ہمیں تعجب ہوا اُس شخص پر کہ

رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ تصدیق بھی کر رہا ہے!'' یہ انداز تو استاد کا ہوتا ہے کہ شاگرد سے سوال پوچھتا ہے' اور اگر وہ درست جواب بتائے تو اُس کی تصدیق کرتا ہے' اسے شاباش دیتا ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے اور سمجھ گئے کہ اس معاملے میں آپؐ کی اجازت شامل ہے۔

قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ ''پھر اُس نے کہا کہ اب مجھے بتایئے کہ ایمان کیا ہے!'' قَالَ : ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ' وَمَلَائِکَتِہٖ' وَکُتُبِہٖ' وَرُسُلِہٖ' وَالْیَوْمِ الْآخِرِ' وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو یقین رکھے اللہ پر' اُس کے فرشتوں پر' اُس کی کتابوں پر' اُس کے رسولوں پر' قیامت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر (کہ جو خیر یا شر کسی پر وارد ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے)''۔ قَالَ: صَدَقْتَ ''وہ شخص بولا: آپ (ﷺ) نے ٹھیک فرمایا۔''

قَالَ: فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ ''پھر اس نے کہا کہ مجھے احسان کے بارے میں بتایئے''۔ قَالَ: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ' فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) ''آپؐ نے فرمایا: (احسان یہ ہے) کہ تم اس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ ایک روایت میں ((اَنْ تَخْشَی اللّٰہَ تَعَالٰی)) ''کہ تُو اللہ تعالیٰ سے ڈرے'' اور ایک روایت میں ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰہِ)) ''کہ تُو عمل کرے اللہ کے لیے (یا محنت کرے اللہ کے لیے) کے الفاظ آئے ہیں۔''

قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ ''(پھر) اس نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے''۔ قَالَ : ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ!)) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس سے (قیامت کے بارے میں) پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا''۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فِیْ خَمْسٍ مِنَ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلاَّ ھُوَ)) ''یہ غیب کی ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں'' اور پھر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ لقمان کی آخری آیت تلاوت کی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿٣٤﴾﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کے پاس قیامت کا علم ہے (کہ وہ کب آئے گی)۔ اور وہی بارش برساتا ہے' اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے۔ اور کسی انسان کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور (اسی طرح) کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ بے شک اللہ ہی ہر چیز کا علم رکھنے والا (اور) ہر شے سے باخبر ہے۔''

قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا؟ ''اُس شخص نے پوچھا: تو مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے!'' قَالَ : ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: (جب تم دیکھو) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے''۔ اکثر کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد سرکش ہو جائے گی۔ بیٹیاں جو عام طور پر اپنے والدین کا زیادہ ادب کرنے والی ہوتی ہیں' والدین کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھتی ہیں' ان کا حال یہ ہو جائے گا گویا اپنی ماؤں کی مالکہ ہیں' مائیں ان سے ڈریں گی کہ ان کی کسی غلط بات پر انہیں ٹوک دیا تو معلوم نہیں وہ کیا ردِّعمل ظاہر کریں گی۔ ((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ)) ''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں' ننگے بدن' محتاج' بکریاں چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے''۔ یہ صورت حال آج عالمِ عرب میں صد فیصد موجود ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں حضرت جبرائیلؑ کے پانچویں سوال کا بھی ذکر ہے: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ ''یارسول اللہ! بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے' تنگدست کون لوگ ہیں؟'' قَالَ : ((اَلْعَرَبُ)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: وہ عرب ہوں گے''۔ یہ صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے۔ دبئی کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے! سو سال پہلے یہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا' پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے' پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ پورے عرب کا یہی معاملہ تھا۔ تقریباً ستر اسّی برس سے یہ صورتِ حال مکمل

طور پر تبدیل ہوگئی ہے' جب سے تیل دریافت ہوا ہے۔ اب یہ خوشحالی کہاں تک پہنچ گئی ہے' اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ عرب کے صحرا گل وگلزار کا نقشہ پیش کررہے ہیں۔ آپ اگر ابوظہبی کے ایئرپورٹ سے ابوظہبی شہر جائیں تو درمیان میں آپ کو ایسا نقشہ نظر آئے گا گویا یہ چمن زار ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ہری بھری گھاس اور پھول ہیں اور سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے پشتے بنا دیے گئے ہیں تاکہ اس سے آگے صحرا کی طرف نگاہ نہ پہنچے۔ اس طرح بہت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ پھر یہ کہ دبئی میں سیون سٹار ہوٹل ہے۔ دبئی' جدہ' ریاض وغیرہ کی ساحلی سڑکیں اتنی عالی شان' آراستہ و پیراستہ اور خوبصورت ہیں کہ اس قدر حسین مناظر میں نے امریکہ میں بھی نہیں دیکھے۔ میرے خیال میں دبئی باقی عرب کے بعد اُبھرنا شروع ہوا لیکن اب سب سے آگے ہے۔

متحدہ عرب امارات (UAE) میں مجھے گئے ہوئے اب تو ایک طویل عرصہ ہوگیا ہے' کیونکہ تیرہ چودہ سال سے میرے وہاں داخلے پر پابندی ہے۔ اس پابندی سے پہلے ایک مرتبہ مَیں وہاں گیا ہوا تھا اور ایک بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بلند و بالا عالی شان بلڈنگ تھی جسے گرایا جارہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا افتاد ہے کہ اسے گرا رہے ہیں؟ ابھی تو یہ شہر آباد ہوا ہے' کوئی پرانی عمارت تو ہے نہیں! کہنے لگے کہ اس کے قریب ایک اس سے اونچی عمارت بن گئی ہے' لہٰذا اب اس عمارت کو گرا کر از سرِ نو مزید اونچی عمارت بنانی ہے۔ گویا عمارتوں کو اونچا کرنے میں وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کررہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے فرماتے ہیں: ثُمَّ انْطَلَقَ ''پھر وہ شخص چلا گیا''۔ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ''تو مَیں کچھ دیر متردّد سا رہا''۔ میرے ذہن میں یہ الجھن رہی کہ یہ سائل کون تھا۔ ثُمَّ قَالَ لِيْ: ((يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ؟)) ''پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا: اے عمر! تمہیں معلوم ہوا یہ سائل کون تھا؟'' قُلْتُ : اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ''میں نے کہا: اللہ اور اُس کا رسول (ﷺ) بہتر جانتے ہیں''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول یہی تھا کہ آپؐ کے سوال دریافت فرمانے پر وہ کہتے تھے: ''اللہ اور اُس کا

رسول بہتر جانتے ہیں''۔ قَالَ : ((فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ' اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ)) ''یہ جبرائیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

یہ اختتامی حصّہ حضرت عمرؓ کی روایت میں بہت ہی مختصر اور نامکمل ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہی وہ شخص واپس گیا حضرت عمرؓ بھی وہاں سے کسی ضرورت کے تحت روانہ ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں جو واقعہ پیش آیا وہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ دوسری روایت کے مطابق ذرا سا توقف کے بعد وہ شخص چلا گیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((رُدُّوْهُ)) ''اسے واپس میرے پاس لاؤ''۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ((اِلْتَمِسُوْهُ)) ''اسے تلاش کرو''۔ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا ''تو انہیں کوئی شے نہیں ملی''۔ اُس آدمی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبرائیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے''۔ اس کے بعد اور الفاظ بھی ہیں جو مسند احمد میں ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ جَاءَ نِيْ قَطُّ اِلَّا وَاَنَا اَعْرِفُهٗ اِلَّا تَكُوْنُ هٰذِهِ الْمَرَّةُ)) ''اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' جب کبھی بھی جبرائیلؑ میرے پاس آئے میں اُن کو پہچان لیتا تھا' سوائے اِس مرتبہ کے''۔ حضرت جبرائیلؑ ایک تو فرشتے کی شکل میں تشریف لاتے' اُس وقت غیر مرئی ہوتے' صرف آواز سنائی دیتی تھی۔ ان کی آواز بھی لفظی نہیں تھی' بلکہ گھنٹیوں کی آواز کی طرح ہوتی تھی۔ (جیسے تار گھر میں غرغر ہوتا تھا اور اسی سے پھر پیغام بنا لیا جاتا تھا۔) جبرائیلؑ جو پیغام لے کر آتے تھے وہ الفاظ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک پر اُتر جاتا تھا۔ لیکن متعدّد مواقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے جس کا ایک واقعہ یہاں آپ کے سامنے آیا۔ حضرت جبرائیلؑ عام طور پر ایک خوبصورت صحابی حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے' لیکن رسول اللہ ﷺ پہچان جاتے تھے کہ یہ دحیہ نہیں ہیں' بلکہ دحیہ کی شکل میں حضرت جبرائیلؑ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((مَا جَاءَ نِيْ فِيْ صُوْرَةٍ اِلَّا عَرَفْتُهٗ غَيْرَ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ)) ''حضرت

جبرائیلؑ جس شکل وصورت میں بھی میرے پاس تشریف لاتے تھے میں انہیں پہچان لیتا تھا سوائے اس مرتبہ کے۔''

یہ بھی جان لیجیے کہ آپؐ نے جو فرمایا کہ ''یہ جبرائیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے'' تو اس ضمن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی آئے ہیں: ((اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْئَلُوْا)) ''جبرائیلؑ اس لیے آئے تھے کہ انہوں نے چاہا کہ تم وہ چیزیں جان لو جن کے بارے میں تم نے سوال نہیں کیا''۔ یعنی دین کی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں تمہیں سوال کرنا چاہیے تھا لیکن تم نے نہیں کیا' لہٰذا حضرت جبرائیلؑ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے آئے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ صحابہؓ نے کہا: مَا رَاَیْنَا رَجُلًا اَشَدَّ تَوْقِیْرًا لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ ھٰذَا ''ہم نے کسی انسان کو نہیں دیکھا کہ وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی عزت کرتا ہو جتنی کہ وہ شخص کر رہا ہے''۔ کَاَنَّہٗ یَعْلَمُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ''ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے۔'' یعنی آپؐ کے مرتبے اور آپؐ کی نبوت ورسالت کو خوب پہچانتا ہے۔

آپ نے اس واقعہ کی ابتدا بھی دیکھ لی اور انتہا بھی۔ اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جو الفاظ ہیں: فَلَبِثْتُ مَلِیًّا ''تو مَیں کچھ دیر بڑا متردّد رہا''۔ تو اس بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ہوسکتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں حضرت عمرؓ کی حاضری دو تین دن بعد ہوئی ہو' کیونکہ یہ معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابیؓ دونوں مشترکہ طور پر ایک دکان چلاتے تھے اور حضرت عمرؓ کا ان کے ساتھ ایک معاہدہ تھا کہ ایک دن دکان پر تم بیٹھو گے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہوں گا اور اگلے دن میں دکان پر بیٹھوں گا اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض حاصل کرو گے۔ تو شاید اگلے دن آپؓ اپنے اس معاہدے کی وجہ سے نہیں آئے اور دوسرے دن ہوسکتا ہے انہیں کوئی اور مصروفیت ہو۔ اب جب آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے چہرے پر پڑھ لیا کہ یہ متردّد سے ہیں' کسی تشویش میں ہیں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی پوچھا: ((یَا

عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟)) ''اے عمر! تمہیں معلوم ہوا کہ یہ سائل کون تھا؟'' تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: قُلْتُ: اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ''میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ قَالَ: ((فَاِنَّہٗ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ)) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ جبرائیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔''

اس حدیث میں جو چار سوال آئے ہیں جن کے رسول اللہ ﷺ نے جوابات دیے ہیں' ان میں اہم ترین پہلے دو سوال ہیں' یعنی اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ روایات میں سوالات کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ ابن عمرؓ کی روایت میں پہلا سوال ایمان کے بارے میں اور دوسرا سوال اسلام کے بارے میں ہے' جبکہ اس روایت اور دوسری اکثر روایات میں پہلا سوال اسلام کے بارے میں ہے اور دوسرا سوال ایمان کے بارے میں۔ بہرحال اسلام اور ایمان کے بارے میں یہ سوالات بہت اہم ہیں' جن کی وضاحت بعد میں ہو گی۔ تیسرا سوال جو ''احسان'' کے بارے میں ہوا' وہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ روحانیت کے بارے میں ہے اور ہمارے ہاں تصوّف اس کا موضوع بن گیا ہے۔ اس بارے میں بھی آپ ﷺ نے یہاں فرما دیا ہے کہ دین میں روحانیت کے ضمن میں صحیح روش کیا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ بعد میں دین میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں وہ تین گوشوں سے ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو تبع تابعی تھے' بہت نیک اور مجاہد انسان تھے' ان کا ایک شعر ہے:

وھل افسد الدِّین الا الملوك
واحبار سوء ورھبانھا

''دین میں فساد تین طرح سے آتا ہے (یا آیا ہے): ایک بادشاہوں اور سلاطین کے ذریعے سے' دوسرے علماءِ سوء کے ذریعے سے اور تیسرے راہبوں کے ذریعے سے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں بھی فساد آ چکا تھا۔ اور آج کے دَور میں تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ

اَیْدِی النَّاسِ﴾ (الروم:٤١) ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے''۔ اُس دَور کے لوگوں نے محسوس کر لیا کہ اِس فتنہ وفساد کا ذریعہ یہ تین گروہ ہیں۔ ایک تو وہ بادشاہ وسلاطین جو اپنے مفادات کے لیے دین میں تحریف کرواتے ہیں۔ دوسرے دین فروش اور فتویٰ فروش علماء' جو اپنے دین اور اپنے علم کو کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں' اور تیسرے یہ راہب۔ رہبانیت جب آتی ہے تو دین کے اندر فتور اور فساد پھیلاتی ہے۔ انہی تین گروہوں کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

یعنی اے مسلمان! آج تیرا آئینۂ قلب دھندلا گیا ہے تو اس کی وجہ وہ زخم ہیں جو تجھے تین اطراف سے لگے ہیں۔ یہ زخم لگانے والے تین قسم کے لوگ ہیں: ایک پیشہ ور مذہبی مُلّا' دوسرے بادشاہ' تیسرے پیری مریدی کرنے والے۔ موجودہ حالات اس کی مکمل عکاسی کر رہے ہیں' اِلّا ماشاءَ اللہ۔

چوتھا سوال نبی اکرم ﷺ سے قیامت اور علاماتِ قیامت کے بارے میں ہے۔ اس حدیث میں جو دو علاماتِ قیامت بیان ہوئی ہیں وہ آج روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ گئی ہیں' یعنی اولاد کی سرکشی اور نادار لوگوں کا خوشحال ہو کر محلات کی بلندی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنا۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ)) (۱)

''میری بعثت میں اور قیامت میں اتنا قُرب ہے جتنا اِن دو انگلیوں (شہادت والی انگلی اور درمیانی انگلی) کے مابین ہے۔''

یعنی میرے بعد اب نہ کوئی نبی و رسول آئے گا اور نہ کوئی اُمت آئے گی' بلکہ اب قیامت

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق ' باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کھاتین۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب تخفیف الصلاة والخطبة۔

ہی آئے گی۔ گویا آپ ﷺ کی بعثت ہی فی نفسہٖ علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ اس کے بعد پھر چھوٹی بڑی علامتیں ہیں۔ کتبِ احادیث میں علاماتِ قیامت کی احادیث پر مشتمل پورے پورے باب باندھے گئے ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

پانچواں سوال جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کیا کہ یہ: ''**اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ**'' کون لوگ ہیں کہ بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے اور تنگ دست ہونے کے باوجود قیامت کے قریب اتنے خوشحال ہو جائیں گے کہ بڑی بڑی عمارات میں ایک دوسرے پر مسابقت کی کوشش کریں گے؟ اس سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ عرب ہوں گے۔ اب جزیرہ نمائے عرب کا مشرقی ساحل اور مغربی ساحل بعینہٖ یہ نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ البتہ جنوبی ساحل کے ساتھ صحرا ہے جہاں آبادی ہے ہی نہیں' اسے ''الرُبع الخالی'' کہتے ہیں۔ یہاں زندگی کا وجود نہیں ہے۔ یہاں کی ریت بھی ایسی ہے کہ اس پر کوئی شے ٹھہر ہی نہیں سکتی' بلکہ نیچے دھنستی چلی جاتی ہے' جیسے دلدل میں ہوتا ہے کہ آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو پھر اس کا باہر نکلنا محال ہوتا ہے۔ ایسے صحراؤں کو ''Quick Sands'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں قومِ عاد کا مسکن تھا۔ قومِ عاد کی بڑی زبردست تہذیب تھی۔ اسی قوم میں شدّاد تھا جس نے اپنی جنت بنائی تھی۔ اب شدّاد کا وہ شہر بھی دریافت ہو گیا ہے جو اِسی ریت کے اندر دبا ہوا ہے۔ اس میں بڑی مضبوط فصیل کے اوپر بہت مضبوط ستون کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿**اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨**﴾ (الفجر) ''کیا تم نے (اے پیغمبرؐ!) دیکھا نہیں کہ تمہارے ربّ نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ' جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟''

اب آیئے اس طرف کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں جو دو اہم سوال آئے ہیں ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے بارے میں' ان کی اہمیّت کا پس منظر کیا ہے۔ اکثر اوقات قرآن مجید

کے عام پڑھنے والوں کو ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے بارے میں اُلجھن ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان اور اسلام زیادہ تر مترادف الفاظ کے طور پر آتے ہیں۔ مسلم کو مؤمن کہہ دیں' مؤمن کو مسلم کہہ دیں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریں وہ یکساں خوشبو دے گا۔ چنانچہ جو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہے اور اس کے دل میں ایمان ویقین بھی ہے تو آپ اسے مؤمن کہہ دیں یا مسلم کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ جس کی آغاز میں تلاوت کی گئی ہے' اس میں نہ صرف یہ کہ ''اسلام'' اور ''ایمان'' مترادف نہیں ہیں بلکہ ایمان بمقابلہ اسلام آیا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (الحجرات:١٤)

''یہ بدّو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے' (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' لیکن یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یہاں پر ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' آیا ہے ''مَا اٰمَنْتُمْ'' نہیں آیا۔ یہ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر ماضی سے پہلے ''مَا'' آ جائے تو یہ بھی نفی ہے لیکن اس نفی میں شدّت اور تاکید نہیں ہوتی' لیکن اگر مضارع سے پہلے ''لَمْ'' آ جائے تو یہ تاکیداً نفی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' کا ترجمہ کیا ہے ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے''۔ یہاں ایک تضاد کی سی شکل بن گئی ہے کہ ایمان اور اسلام مترادف ہیں یا ایک دوسرے کی ضد؟ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں بدّوؤں کا اسلام تو قبول کیا جا رہا ہے بایں الفاظ: ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''لیکن تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں'' لیکن ایمان کی پُر زور نفی کی جا رہی ہے کہ: ﴿لَمْ تُؤْمِنُوْا﴾ ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے'' اور: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''اور ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اسلام اور ایمان کے علاوہ قرآن حکیم میں کچھ اور الفاظ بھی ہیں جو باہم مترادف بھی آئے ہیں اور باہم متضاد بھی' جیسے ''نبی'' اور ''رسول''۔ اِن کے بارے میں علماءِ

ثابت ہو جاتی ہے کہ گناہِ کبیرہ سے گویا ایمان کی نفی ہوتی ہے۔

یہ وہ چیز ہے جس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے سے بہت بڑی گمراہی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسلام میں سب سے زیادہ گمراہ فرقہ ''خوارج'' اسی بنیاد پر گمراہی کا شکار ہوا۔ انہوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے اور جب کافر ہے تو گویا مرتد ہے' لہٰذا اس کی جان اور مال مباح ہے' اسے قتل کر دیا جائے اور اس کا مال لے لیا جائے' وہ مالِ غنیمت ہوگا۔ اس کی عورتیں مباح ہو جائیں گی' وہ لونڈیاں بن جائیں گی۔ یہ خوارج کا فتنہ بہت خطرناک فتنہ تھا۔ یہ فتنہ حضرت علیؓ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا اور بعد میں بڑھتا چلا گیا۔ ان لوگوں کو جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ اصل میں انہی احادیث سے ہوئی تھی۔ حالانکہ بعض احادیث میں یہ اسلوب گناہِ کبیرہ سے بھی کمتر گناہوں اور کوتاہیوں کے لیے بھی آیا ہے۔ ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ قِيْلَ وَمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''پوچھا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! کون؟'' فرمایا: ((اَلَّذِيْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ))(۱) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں ہے''۔ اب یہاں کسی گناہِ کبیرہ کا ذکر تو نہیں ہے' بلکہ صرف بداخلاقی کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنے اخلاق میں اتنا گرا ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا پڑوسی بے چین اور پریشان ہے' تو ایسے شخص کے بارے میں آپ ﷺ تین دفعہ قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کر رہے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ایمان کی نفی کے معنی لازماً کفر نہیں ہیں' جیسا کہ خوارج نے سمجھ لیا' بلکہ کفر اور ایمان کے مابین ایک مقام ''اسلام'' کا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص مسلمان شمار ہوگا۔ چوری کرتے ہوئے بھی مسلمان ہے' شراب پیتے ہوئے بھی مسلمان ہے اور زنا کرتے ہوئے بھی مسلمان ہے۔ عین اُسی حالت میں جان نکل جائے تو بھی اس کی نماز جنازہ

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یأمن جارہ بوایقہ۔ یہ حدیث صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

پڑھی جائے گی۔ اگرچہ اس کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کی جائے گی۔

اسی طرح قرآن مجید کے بعض مقامات پر دو ایمانوں کا ذکر ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ میں فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اِس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے جب تم مسلمان ہو تو ایک درجے میں مؤمن بھی ہو' لیکن اصل ایمان کچھ اور ہے جس کی ابھی ضرورت ہے۔

اسلام‘ ایمان اور احسان (۲)

۱۵جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ (الحُجُرٰت)

پچھلی نشست میں ہم نے ’’حدیثِ جبریلؑ‘‘ کے مطالعہ کا آغاز کیا تھا۔ اس میں ہم نے پوری حدیث مبارکہ کا متن اور ترجمہ پڑھا اور خاص طور پر اس کے ابتدائی اور اختتامی حصے کو واقعاتی انداز میں تفصیل سے پڑھا۔ آج ہم اللہ کی توفیق سے اس کے اصل متن پر گفتگو کریں گے۔ یہ اصل متن بالعموم چار سوالات پر مشتمل ہے‘ یعنی اسلام کیا ہے؟ ایمان کیا ہے؟ احسان کیا ہے؟ اور قیامت کب قائم ہوگی یا اس کی علامات کیا ہیں؟ البتہ ایک روایت ایسی بھی ہے جس میں پانچواں سوال بھی ہے۔ اس ضمن میں مَیں آپ کو بتا چکا ہوں کہ احادیثِ نبویہؐ کے ضمن میں لفظی فرق کا ہونا بالکل منطقی اور معقول بات ہے۔ احادیث لفظاً محفوظ نہیں ہیں‘ البتہ معناً محفوظ ہیں۔ بہرحال ان میں سے پہلے دو سوالات جو اہم ترین ہیں‘ یعنی اسلام اور ایمان‘ آج ان پر گفتگو ہوگی۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ ’’مجھے بتایئے اسلام کیا ہے!‘‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰــہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ‘ وَتُقِیْمَ الصَّلَاۃَ‘ وَتُؤْتِیَ الزَّکَاۃَ‘ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ‘ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا)) ’’اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اس کے رسول ہیں‘ اور تو نماز قائم کرے‘ زکوٰۃ ادا کرے‘ رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے سفر کی

استطاعت حاصل ہو (اس کے وسائل اور ذرائع تمہارے پاس موجود ہوں)''۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں لفظ ''گواہی'' آیا ہے ''ایمان'' نہیں آیا۔ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں: ((اَنْ تَشْهَدَ)) کہ تُو گواہی دے یعنی زبانی اقرار کرے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دوسرا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ ''مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے!'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهٖ، وَكُتُبِهٖ، وَرُسُلِهٖ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) ''کہ تُو ایمان لائے (دل سے تصدیق کرے) اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر، اور تُو ایمان لائے اچھی بُری تقدیر پر''۔ یہاں لفظ ''ایمان'' آ رہا ہے کہ تو ایمان لائے، دل سے تصدیق کرے اِن اِن چیزوں پر۔

یہاں ایک بات نوٹ کیجیے کہ یہ حدیث پانچ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے (جن کا پچھلی نشست میں ذکر ہو چکا ہے)۔ ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر تین صحابہؓ کی روایات میں پہلا سوال ''اسلام'' کے بارے میں اور دوسرا ''ایمان'' کے بارے میں ہے، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں پہلا سوال ''ایمان'' کے بارے میں ہے اور دوسرا ''اسلام'' کے بارے میں۔

ان پانچ صحابہؓ میں سے ایک حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک تقابلی مطالعہ ہونا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مانند فقہائے صحابہ میں سے ہیں اور قرآن مجید کے بہت بڑے عالم مانے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ایک خاص دُعا کی تھی: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاْوِيْلَ))(۱) ''اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا تفقہ (گہرا فہم) عطا فرما اور قرآن کی تاویل کی تعلیم دے''۔ جان لیجیے کہ ایک ہے قرآن مجید کی تفسیر اور ایک ہے تاویل۔ تفسیر یہ ہے کہ قرآن مجید کے ہر ہر لفظ کے معنی اور اُن

---

(۱) مسند احمد، ح ۲۲۷٤۔

کا باہم ربط بیان کرنا جبکہ تأویل ہے مضمون کو پہچان لینا کہ اصل میں سیاق وسباق کس مضمون پر دلالت کر رہا ہے۔

اب یہاں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عمرؓ کی روایات میں لفظی فرق ملاحظہ کیجیے! حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے کہ جبرائیلؑ نے کہا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ ''مجھے بتائیے کہ اسلام کیا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا)) ''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور تُو نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج ادا کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو''۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب جبرائیلؑ نے کہا: حَدِّثْنِيْ بِالْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے!'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْهَكَ لِلّٰهِ)) ''اسلام یہ ہے کہ تُو اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (سرِ تسلیم خم کر دے)''۔ یہ لفظ اسلام کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام کے معنی ہی ہیں سرنڈر کر دینا' اطاعت قبول کر لینا۔ لیکن نوٹ کیجیے کہ اس روایت میں عبادات یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا ذکر نہیں ہے جو حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے' البتہ اس سے پہلے جو الفاظ آئے ہیں وہ بہت جامع ہیں کہ ''اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دو''۔ اس میں ساری عبادات خود بخود شامل ہو جاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے مطابق حضرت جبرائیلؑ دریافت فرماتے ہیں: اِذَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَنَا مُسْلِمٌ؟ ''(اے نبیؐ! مجھے بتائیے) اگر میں یہ کام کر دوں (جو آپؐ نے بتائے ہیں) تو پھر میں مسلمان شمار کیا جاؤں گا؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ فَقَدْ اَسْلَمْتَ)) ''جب تم یہ شرائط پوری کر دو تو تم گویا اسلام میں آ گئے۔''

اس کے بعد حضرت جبرائیلؑ فرماتے ہیں: فَحَدِّثْنِيْ مَا الْاِيْمَانُ؟ ''اب مجھے

بتائیے ایمان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِکَةِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیِّیْنَ' وَتُؤْمِنَ بِالْمَوْتِ وَبِالْحَیٰوةِ بَعْدَ الْمَوْتِ' وَتُؤْمِنَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَالْحِسَابِ وَالْمِیْزَانِ' وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ کُلِّهٖ خَیْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) ''ایمان یہ ہے کہ تُو ایمان لائے اللہ پر' آخرت کے دن پر' فرشتوں پر' کتابوں پر' نبیوں پر' اور تُو موت پر یقین رکھے' اور موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھے' اور تُو جنت و دوزخ اور حساب و میزان سب کو مانے' اور تقدیر پر ایمان رکھے کہ اس کا خیر ہو یا شر سب اللہ کی طرف سے ہے''۔ جبرائیلؑ نے دریافت فرمایا: فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ فَقَدْ آمَنْتُ؟ ''جب میں یہ کر گزروں تو پھر گویا میں مؤمن ہو جاؤں گا؟ (میرا ایمان اللہ کے ہاں قبول ہوگا؟)'' تو آپؐ نے فرمایا: ((فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ فَقَدْ آمَنْتَ)) ''پس جب تم یہ کر دو تو تم گویا ایمان لے آئے''۔ اب یہاں لفظی فرق و تفاوت تو سامنے آ رہا ہے لیکن ذہن میں رکھیے کہ مفہوم میں فرق نہیں ہے۔

اب یہاں پر ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے مابین جو بحث پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کیا ہے' ایمان کیا ہے' تو اس ضمن میں چند موٹی موٹی باتیں جان لینی ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن مجید میں یہ دونوں الفاظ ''اسلام'' اور ''ایمان'' مترادفات کے طور پر بھی استعمال ہوئے ہیں اور باہم متضاد بھی۔ اسلام کا تعلق انسان کے ظاہری اعمال سے' جبکہ ایمان کا تعلق قلبی یقین سے ہے۔ اب جس شخص کو یہ دونوں حاصل ہوں' یعنی عمل میں اسلام کی پابندی ہو' شریعت کی پابندی ہو' اور دل میں اللہ پر اور تمام امورِ ایمانیہ پر یقین ہو تو اب اسے مسلم کہہ لیں یا مؤمن کہہ لیں' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جیسے انگریزی مقولہ ہے: ''Call the rose by any name it will smell as sweet'' کہ گلاب کے پھول کو نام کوئی بھی دے دو اس کی خوشبو تو وہی رہے گی۔

قرآن مجید میں اس قسم کی اصطلاحات کا دوسرا جوڑا ''نبی'' اور ''رسول'' ہے۔ یہ دونوں الفاظ مترادف بھی ہیں اور مختلف المعنیٰ بھی۔ اس ضمن میں علماء کا اصول بیان ہو چکا ہے کہ: اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا ''جب (اس قسم کے الفاظ) دونوں

ایک ہی جگہ پر آئیں تو مفہوم جدا جدا ہوگا اور جب الگ الگ استعمال ہوں گے تو مفہوم ایک ہو جائے گا۔''

دیکھئے اسلام کا تعلق ظاہر سے ہے اور ایمان کا تعلق باطن سے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا تعلق اس دنیا سے ہے اور ایمان کا تعلق آخرت سے ہے۔ اس دنیا میں کسی کے مسلمان سمجھے جانے کا دارومدار اسلام پر ہے ایمان پر نہیں' اس لیے کہ ایمان تو ایک قلبی حقیقت ہے' اس کی توثیق کیسے ہوگی؟ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ کسی کے ایمان کا یا اس کے مؤمن ہونے کا فیصلہ ہم اس دنیا میں نہیں کر سکتے۔ عمومی طور پر تو یہ باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ جس میں یہ یہ صفات ہوں وہ مؤمن ہے اور جس میں یہ یہ اوصاف ہوں وہ منافق ہے' لیکن معین طور پر ہم کسی کے بارے میں نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شخص مؤمن ہے یا فلاں شخص منافق ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا تعلق اس دنیا سے ہے اور اس میں اصل بنیاد شہادت ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں تو مذکور ہی صرف شہادت ہے' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا تو ذکر بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص ہندو تھا اور اُس نے کلمہ پڑھ لیا تو وہ اُسی وقت مسلمان ہو گیا۔ اُس نے ابھی نہ تو نماز پڑھی اور نہ روزہ رکھا۔ وہ نماز سیکھے گا تو پڑھے گا یا وقت آئے گا تب پڑھے گا۔ ایسے ہی رمضان آئے گا تو پتا چلے گا کہ اُس نے روزے رکھے ہیں یا نہیں رکھے۔ اِس وقت وہ صرف کلمۂ شہادت کی بنیاد پر مسلمان ہوا ہے۔ چنانچہ اسلام کا معاملہ شہادت پر مبنی ہے' اسلام کی جڑ اور بنیاد شہادت ہے۔ کوئی شخص ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے: ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے' چاہے قرائن موجود ہوں اور حالات یہ گواہی دے رہے ہوں کہ اُس نے دل سے کلمہ نہیں پڑھا تب بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ البتہ بعد میں اگر معلوم ہو کہ یہ بدبخت تو قرآن کو نہیں مانتا' ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہے' ختمِ نبوت کا قائل نہیں ہے' بلکہ نبوت کے اجراء کا قائل ہے' تو اب اس کی تکفیر کی جائے گی۔ یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ لیکن اگر کسی کلمہ گو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تو پھر ہم اس کے مسلمان

یا مؤمن ہونے کا انکار نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید میں اس قسم کے ایک واقعے کا ذکر بھی موجود ہے۔ مسلمان مجاہدین جب جہاد کے لیے باہر نکلتے تھے تو کہیں ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نے ان کو "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہا۔ گویا وہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اب مجاہدینِ اسلام کو خیال گزرتا کہ یہ شخص اپنا مال اور اپنی جان بچانے کے لیے اپنا جھوٹ موٹ کا اسلام ظاہر کر رہا ہے کہ وہ مسلمان ہے' لہٰذا اسے کہتے کہ تم مؤمن نہیں ہو۔ لیکن قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۹۴ میں اس چیز سے روک دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾

"اے اہلِ ایمان! جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور کسی ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے سلامتی پیش کرے (تمہیں سلام کہے یا اپنا اسلام پیش کرے) یہ نہ کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو۔"

اس لیے کہ اسلام کا دارومدار' یا یوں کہیے کہ قانونی ایمان کا دارومدار درحقیقت شہادت پر ہے۔ ایک جنگ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ایک ایسے ہی شخص کی جان لے لی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ رسول اللہ ﷺ کے بہت چہیتے اور لاڈلے تھے۔ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ آپؐ کے غلام تھے' آپؐ نے انہیں آزاد کیا اور اپنا مُنہ بولا بیٹا بنا لیا۔ بعد میں سورۃ الاحزاب کی یہ آیت نازل ہوئی کہ اس طرح کا مُنہ بولا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں رکھتا' اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو حضرت زیدؓ جنہیں زیدؓ بن محمدؐ کہا جاتا تھا دوبارہ زید بن حارثہؓ کہلانے لگے۔ بہرحال ایک جنگ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی کفار کے لشکر میں سے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ شخص حضرت اسامہؓ کی تلوار کی زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے' لہٰذا اس پر تلوار چلا دی اور سر قلم کر دیا۔ بعد میں اُسامہؓ جب رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوئے تو آپؐ نے انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا' حالانکہ حالات و واقعات

سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس شخص نے جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے اسامہ! اُس وقت تم کیا کرو گے جب قیامت کے دن یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف گواہی دینے کے لیے آئے گا کہ میرے ہوتے ہوئے تلوار چل گئی! پس کلمۂ شہادت تو ڈھال ہے۔ اس سے ایک مسلمان کے دنیا میں جو حقوق ہیں وہ سارے کے سارے حاصل ہو جائیں گے۔ چنانچہ دنیا میں کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اسلام کی بنیاد پر ہوگا' ایمان کی بنیاد پر نہیں۔ اسی لیے اسلام اور ایمان کے بارے میں الگ الگ سوال کیا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ اور ایمان کیا ہے؟ لہٰذا اسلام اور ایمان کو گڈمڈ کرنے کے بجائے علیحدہ علیحدہ رکھنا ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اسی اسلام کی بنیاد پر اسلامی تمدن اور تہذیب کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہوتا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' صومِ رمضان اور حج بیت اللہ' اسلامی تہذیب و تمدن کی علامات ہیں۔ ان سے دنیا میں اسلامی تہذیب کا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ لہٰذا نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم ہوگا' رمضان کے روزے رکھے جائیں گے' بیت اللہ کا حج کیا جائے گا۔ گویا اسلام کا تعلق اس دنیا سے ہے جبکہ ایمان کا تعلق آخرت سے ہے۔ اُخروی نجات کا دار و مدار ایمان پر ہے۔ دل میں ایمان ہوگا تو نجات ہوگی' ورنہ نہیں۔ آخرت میں جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے روبرو ہماری حاضری ہوگی' جو عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے' تو وہاں سب ظاہر ہو جائے گا کہ دل میں کتنا ایمان ہے۔ دنیا میں تو ہم نہیں جان سکتے کہ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں ہے۔ کوئی ایسا آلہ ہمارے پاس نہیں ہے' کوئی ایسا الیکٹرو کارڈیوگرام ابھی تک ایجاد نہیں ہوا جو یہ بتادے کہ دل میں ایمان ہے یا نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل میں تو ہے! لہٰذا قیامت کے دن نجات کا دار و مدار ایمان پر ہے۔ اور یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ دُنیا میں اسلام کے اخلاقی اور روحانی نظام کی بنیاد بھی ایمان ہے۔ اگر دنیا میں کوئی اخلاقی اور روحانی بلندی چاہتا ہے' ترفّع چاہتا ہے' تو اس کی بنیاد ایمان ہے۔

اب میں بات کو سمجھانے کے لیے تعبیر کا ایک اور انداز آپ کے سامنے لا رہا ہوں۔ دیکھئے قانونی اسلام اور قانونی ایمان ایک ہی چیز ہے۔ اسی طرح حقیقی اسلام اور

حقیقی ایمان بھی ایک ہی چیز ہے۔ قانونی اسلام کلمۂ شہادت پر مبنی ہے اور اسی کو ہم قانونی ایمان بھی کہتے ہیں۔ حقیقی اسلام تو یہ ہے کہ ہمہ تن' ہمہ وجوہ اللہ کا بندہ بن جانا۔ یہ اسلام جہاں نقطۂ آغاز (starting point) ہے وہاں آخری درجہ (final stage) بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام جب خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے تو یہ حضرت ابراہیمؑ کے بڑھاپے کا زمانہ تھا' ان کی سو برس کی عمر تھی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تیرہ برس کے تھے۔ اُس وقت دونوں باپ بیٹا اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾ (البقرۃ:۱۲۸) ''اے اللہ! ہمیں (باپ بیٹا دونوں کو) اپنا فرماں بردار (اپنا مسلمان) بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک اپنی فرماں بردار (مسلمان) اُمت برپا کرنا!'' تو دیکھئے اتنے اونچے مقام پر پہنچ کر بھی وہ اپنے لیے یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں مسلمان بنائے رکھ! لہٰذا یہ نہ سمجھئے کہ اسلام کوئی حقیر شے ہے' معاذ اللہ۔ ہاں قانونی اسلام کا صرف کلمۂ شہادت پر دار و مدار ہے۔ اس میں ایمان و یقین کا کوئی ریفرنس نہیں ہے۔ جبکہ حقیقی اسلام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا' سرِ تسلیم خم کر دینا' پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دینا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ قانونی اسلام اور قانونی ایمان ایک ہی شے ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۹۴ ہم پڑھ چکے ہیں کہ جو شخص تمہارے سامنے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے تو تم اسے یہ نہیں کہہ سکتے: ﴿لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ ''تم مؤمن نہیں ہو''۔ یہاں ایمان کا لفظ کس لیے آ رہا ہے؟ یہ دراصل قانونی ایمان ہے جو قانونی اسلام کے مترادف ہے۔ اور حقیقی ایمان کیا ہے؟ وہ ہے دل میں یقین کا پیدا ہونا۔ ایمان کے لفظی معنی ہیں تصدیق کرنا۔ ایمان کے بعد ''بِ'' یا ''لِ'' کا صلہ آتا ہے ''آمَنَ بِهٖ'' یا ''آمَنَ لَهٗ''۔ مقدم الذکر انداز سے ایک قلبی تصدیق' یقین والی تصدیق مراد ہوتی ہے' جبکہ مؤخر الذکر انداز میں محض سرسری تصدیق ہوتی ہے کہ کسی نے آ کر آپ کو کوئی خبر دی اور آپ نے اس کی نفی نہیں کی۔ اسی لیے ایمان کی تفصیل میں آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...... الخ کے الفاظ

"بِ" کے ساتھ آتے ہیں۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ میں الفاظ آئے ہیں:﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ (آیت ۱۷۷) "نیکی بس یہی نہیں کہ تم اپنا رُخ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرلو' بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ' روزِ قیامت' فرشتوں' کتاب اور تمام نبیوں پر ایمان لائے"۔ اور:﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۵) "یہ رسول (ﷺ) اور مؤمنین ایمان لائے اُس (کتاب) پر جو اُتاری گئی اُس کی طرف اُس کے ربّ کی طرف سے۔"

جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو عمل میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ جب ایمان دل کی گہرائیوں میں جاگزیں اور راسخ ہو جائے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہو' اللہ تعالیٰ کے کسی فرمان سے سرتابی کی جائے! دراصل جب اسلام اور ایمان کی اصطلاحات کو گڈمڈ کر دیا جاتا ہے تو پھر مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں دو ایمانوں کا ذکر ہو رہا ہے' قانونی ایمان اور حقیقی ایمان۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (آیت ۱۳۶) "اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول پر نازل کی' اور اس کتاب پر جو کہ پہلے نازل کی تھی"۔ اب یہاں کہا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! ایمان لاؤ۔ تو یہ دو ایمان ہو گئے۔ مراد یہ ہے کہ قانونی ایمان تو تمہیں حاصل ہو چکا ہے' تم نے کلمۂ شہادت پڑھا' تم نے اقرار کیا: آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ۔ لہٰذا تم قانونی مؤمن تو ہو گئے' اب حقیقی ایمان لاؤ۔ یہی معاملہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ کا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب حرمتِ شراب کا آخری حکم آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک تشویش پیدا ہو گئی کہ جب شراب کی حرمت کے بارے میں قرآن مجید میں اشارات وارد ہو رہے تھے تو کاش ہم اُسی وقت اس کو چھوڑ دیتے' لیکن اب تو ہمیں شراب پیتے پچاس پچاس برس ہو گئے

ہیں' اب تو شراب ہمارے جسم کے ایک ایک خلیے کے اندر پہنچ چکی ہوگی' ہمارا تو اَب وجود ہی نجس ہو چکا ہے' یہ کیسے پاک ہوگا! تو یہاں اس تشویش کا ازالہ کیا گیا کہ نہیں' اس حکمِ قطعی کے آنے سے پہلے جو تم نے کھایا پیا ہے اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (المائدۃ)

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی جبکہ اُن کا طرزِ عمل یہ رہا ہو کہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی اور ایمان لائے' اور عمل صالح کیے' پھر مزید تقویٰ کا اضافہ کیا اور ایمان لائے' پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور احسان کی روش اختیار کی۔ اور اللہ محسنین سے محبت رکھتا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الصّف میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

تو جان لیجیے کہ پہلا ایمان ''قانونی ایمان'' اور دوسرا ایمان ''حقیقی ایمان'' ہے۔ اور اس پر بھی بس نہیں' بلکہ سورۃ المائدۃ کی متذکرہ بالا آیت میں تو اس کے بعد تیسری منزل ''احسان'' کا ذکر ہے۔ آیت کے اختتامی الفاظ پھر پڑھ لیجیے: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کی اصل محبت تو محسنین سے ہے''۔ یہ ہیں وہ تین درجے: اسلام' ایمان اور احسان۔

سورۃ الحجرات میں اسلام اور ایمان کو دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحات میں بیان کیا گیا۔ چنانچہ قانونی ایمان کو ''اسلام'' کہا گیا اور حقیقی ایمان کو ''ایمان''۔ اگر کوئی اس اصطلاحی فرق کو اچھی طرح سمجھ کر اور پیشِ نظر رکھ کر قرآن مجید کا مطالعہ کرے گا تو کہیں ٹھوکر نہیں کھائے گا۔ فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴) ''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو (اس مغالطے میں نہ رہنا)' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں' اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ یعنی ایمان تو وہ ہوگا جب وہ تمہارے دلوں میں راسخ ہو جائے گا۔ ابھی تک یہ قانونی ایمان ہے' جو اسلام کے درجے کی شے ہے۔ قانونی ایمان کی بنیاد پر تم مسلمان قرار پائے ہو۔ آگے فرمایا: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو تو اللہ تمہارے اعمال میں سے ہرگز کچھ کم نہیں کرے گا''۔ یہ ایک عجیب بات سامنے آ رہی ہے کہ ان کے ایمان کی نفیٔ مطلق ہے: ﴿لَمْ تُؤْمِنُوْا﴾ ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو''۔ اور: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ لیکن یہاں انہیں مسلمان مانا جا رہا ہے: ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''بلکہ تم یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں''۔ اور ساتھ ہی ان کے اعمال کو قبول بھی کیا جا رہا ہے: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو تو اللہ تمہارے اعمال میں سے ہرگز کچھ کم نہیں کرے گا''۔ اکثر لوگوں کو اس میں دھوکہ ہوا ہے کہ یہاں جن کا ذکر ہو رہا ہے وہ منافق ہیں۔ میں کہتا ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے' منافق کا تو کوئی عمل قبول ہی نہیں' لہٰذا یہ منافق نہیں ہیں' یہ ان کا محض اسلام ہے جو بغیر ایمان کے ہے۔

اس بات کو امام ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''الایمان'' کے اندر بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایمان کے بغیر بھی اسلام ہو سکتا ہے۔ جو شخص ابھی ایمان لایا ہے تو

ظاہر بات ہے کہ وہ مسلمان تو ہو گیا ہے' اب ایمان اس کے دل میں کب راسخ ہو گا یہ دوسری بات ہے۔ جیسے ہمارا معاملہ ہے کہ ہم پیدا ہوئے تو ہمیں داہنے کان میں اذان سنا دی گئی' بائیں میں اقامت پڑھی گئی۔ ہم دو اڑھائی سال کے ہوئے تو اپنے ماں باپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر ان کے ساتھ ہم بھی سجدے کرنے لگ گئے۔ پھر پانچ سات برس کے ہوئے تو نماز شروع کر دی۔ اس طرح اسلام تو پیدائشی طور پر حاصل ہو گیا' لیکن ایمان اگر آئے گا تو آتے آتے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُن خوش نصیبوں میں شامل فرمائے جنہیں ایمان کی دولت حاصل ہے۔ لہٰذا اسلام اور ایمان کے اندر یہ فرق لازم ہے۔

یہی معاملہ ان بدوؤں کا تھا جن سے کہا جا رہا ہے کہ تم ایمان نہیں لائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں فتح مکہ کے بعد' بلکہ کچھ غزوۂ تبوک کے بھی بعد ایمان لائے۔ اس کے بعد سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں کہ اب مشرکین کے ساتھ اہلِ ایمان کا کوئی معاہدہ نہیں ہے' سارے معاہدے ختم ہیں' اب چار مہینے کی مہلت ہے کہ مشرکینِ عرب میں سے جو کوئی ایمان نہیں لائے گا تو قتل کر دیا جائے گا۔ سورۃ التوبۃ کی یہ پہلی چھ آیات قرآن مجید کی سخت ترین آیات ہیں۔ سورۃ التوبۃ کے شروع میں آیت بسم اللہ نہیں ہے' جس کی ایک تاویل یہی کی گئی ہے کہ یہ سورت تلوار ہاتھ میں لے کر نازل ہوئی ہے۔ آیت بسم اللہ میں تو اللہ تعالیٰ کے اسمائے گرامی الرحمٰن اور الرحیم شامل ہیں' جبکہ یہاں تو اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانیت کا نہیں بلکہ اُس کے جلال کا ظہور رہا ہے' چنانچہ یہاں آیت بسم اللہ نہیں ہے۔ یہاں اعلان کیا جا رہا ہے کہ مشرکینِ عرب میں سے جو ایمان نہ لایا تو اسے اب قتل کر دیا جائے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی اصل بعثت بنی اسماعیل یعنی اہل عرب کے لیے تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ اور قانون رہا ہے کہ جس قوم کی طرف معین طور پر رسول بھیج دیا جاتا تھا وہ اگر ایمان نہ لاتی تھی تو برباد کر دی جاتی تھی' ختم کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ قومِ نوح ہلاک کی گئی' قومِ ہود ہلاک کی گئی' قومِ صالح ہلاک کی گئی' قومِ شعیب ہلاک کی گئی' سدوم و عامورہ کی بستیاں تباہ کی گئیں' آلِ فرعون

ہلاک کیے گئے۔ چونکہ آپ ﷺ اُمیّین عرب میں سے تھے اور ان پر آپؐ کے ذریعے سے اتمامِ حجت ہو چکا تھا‘ لہٰذا اس اصول کے تحت حکم نازل ہوا کہ اب اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو ان کو تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اس چیلنج کے بعد کچھ لوگ تو ایسے نکلے جو ایمان نہیں لائے اور جان بچانے کے لیے انہوں نے عرب سے ہجرت کر لی‘ جبکہ اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔ اب اُس وقت جنہوں نے اسلام قبول کیا‘ ان میں یقیناً ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے خلوصِ دل سے اسلام قبول کیا ہوگا۔ لیکن ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوں گے جنہوں نے منافقت سے اسلام قبول کیا ہوگا کہ ٹھیک ہے اب تو مجبوری ہے‘ ایمان لے آؤ اور جان بچاؤ‘ پھر کوئی موقع دیکھیں گے تو سر اٹھائیں گے‘ پھر کوئی جوابی انقلاب (Counter Revolution) لانے کی کوشش کریں گے۔ اور بعد میں ایسا ہوا بھی۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کا معاملہ بَین بَین ہو‘ یعنی نہ تو ان کے دل میں بد نیتی تھی کہ انہیں منافق کہا جائے اور نہ دل میں واقعی ایمان آیا تھا کہ مؤمن قرار دیے جائیں‘ یعنی نہ تو مؤمن ہیں اور نہ منافق‘ بلکہ ایک درمیانی معاملہ ہے کہ بغیر ایمان کے اسلام ہے۔

اب سوچئے کہ اِس وقت اُمتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت کی اصل گمراہی کیا ہے؟ یہ کہ لوگ قانونی اسلام اور حقیقی اسلام یا حقیقی ایمان کو ایک سمجھ بیٹھے ہیں کہ جب ہم مسلمان ہیں تو مؤمن بھی ہیں۔ یہی حماقت اور مغالطہ ہے۔ مسلمان ہونا اور شے ہے‘ مؤمن ہونا اور شے ہے۔ ع ”زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است!“ ہم چونکہ قانوناً مسلمان ہیں لہٰذا مغالطہ ہو گیا ہے کہ ہم مؤمن ہیں۔ ہماری ساری بے عملی اور بد عملی کا سبب یہی مغالطہ ہے اور اس پر ہمیں تشویش اس لیے نہیں ہوتی کہ ہم اس زعم میں ہیں کہ ہم بہر حال کلمہ گو ہیں‘ مسلمان ہیں‘ اور جب ہم مسلمان ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہلِ ایمان کے ساتھ جو وعدے کیے ہیں وہ ہمارے ساتھ پورے ہوں گے۔ یہ اصل مغالطہ ہے جس کا ہم شکار ہیں۔ قانونی اسلام کا تعلق حقیقی ایمان کے ساتھ جوڑ دینا غلط ہے۔ قانونی اسلام کا تعلق قانونی ایمان کے ساتھ جڑے گا‘ حقیقی ایمان کے ساتھ نہیں۔ اِس وقت اُمت کی عظیم اکثریت کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ قانونی اسلام کو یا قانونی ایمان کو حقیقی

اسلام یا حقیقی ایمان سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کے ساتھ جو وعدے بھی ہیں وہ حقیقی مؤمنین کے ساتھ ہیں۔

اس حقیقی ایمان کے اثرات وثمرات اور آثار قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے سب سے جامع مقام سورۃ الحجرات کی آخری آیات ہیں۔ متذکرہ بالا آیت سے اگلی آیت میں ایمانِ حقیقی کی نہایت جامع تعریف بیان کی گئی ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮﴾

''مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے' اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ صرف یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اب مَیں آپ کے سامنے ایک اجمالی سا نقشہ رکھنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں اس ضمن میں بہت زیادہ کلامی بحثیں ہوئی ہیں' بحث وتمحیص پر بہت زور رہا ہے' منطق کا استعمال کرنا' بال کی کھال اتارنا' یہ سارا کام ہی ہمارے ہاں ہوا ہے۔ ایمان کے لیے اقرار باللسان' تصدیق بالقلب اور عمل صالح' یہ تین چیزیں لازم وملزوم ہیں یا نہیں' اس سوال پر بڑی بحثیں' بڑے مباحثے' بڑے مناظرے اور بڑے علمی معرکے ہوئے ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر کے حامل بڑے عجیب عجیب گروہ سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ ''کرامیہ'' کا تھا۔ اگرچہ اس نام سے اب کوئی فرقہ ہمارے ہاں نہیں ہے' مگر ہمارا عمل انہی سے ملتا جلتا ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ محض اقرارٌ باللسان سے نجات ہو جائے گی' کوئی اچھا عمل کر لیا تب بھی ٹھیک ہے اور اگر نہیں کیا تو پھر بھی کوئی بات نہیں۔ ان کا یہ موقف ایک حدیثِ نبویؐ پر مبنی تھا۔ اگر کوئی پورے مجموعۂ احادیث کو سامنے رکھنے کی بجائے صرف ایک حدیث لے لے تو پھر اتنی بڑی ٹھوکر کھانے کا امکان ضرور رہتا ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ اِلَّا

دَخَلَ الْجَنَّۃَ))(۱) ''کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کہے لا الٰہ الا اللہ' پھر اسی پر اُس کی موت واقع ہو جائے' مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟ ''چاہے اُس شخص نے زنا کیا ہو اور چاہے چوری کی ہو (تب بھی)؟'' آپؐ نے فرمایا:((وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟)) ''ہاں' چاہے اُس نے زنا کیا ہو' چاہے چوری کی ہو''۔ حضرت ابوذرؓ نے پھر سوال کیا: وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟ ''چاہے اس نے زنا کیا ہو' اور چاہے چوری کی ہو؟'' آپ ﷺ نے پھر فرمایا:((وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟)) ''ہاں' چاہے اُس نے زنا کیا ہو' چاہے چوری کی ہو''۔ حضرت ابوذرؓ نے تیسری بار پھر کہا: وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ؟ ''چاہے اس نے زنا کیا ہو اور چاہے چوری کی ہو؟'' آپؐ نے پھر فرمایا:((وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ' عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ)) ''چاہے اس نے زنا کیا اور چاہے اس نے چوری کی ہو (تب بھی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا) ' چاہے ابوذر کو یہ پسند ہو یا نہ ہو''۔ اب پورے مجموعۂ احادیث کو چھوڑ کر صرف ایک حدیث کو لے لیا گیا تو اتنی خرابیاں پیدا ہوئیں۔

ایک دوسرا قول یہ ہے کہ اصل شے صرف تصدیق قلبی ہے' زبان سے اقرار بھی لازم نہیں ہے۔ بعض حالات ایسے ہو سکتے ہیں جن میں یہ بات صحیح ہو۔ چنانچہ قرآن مجید میں سورۃ المؤمن میں آلِ فرعون کے ایک مؤمن کا ذکر ہے: ﴿رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗٓ﴾ (المؤمن:۲۸) ''آلِ فرعون میں سے ایک مؤمن شخص جو اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا معاملہ فرعون کے لیے اس قدر مشکل تھا کہ اگرچہ وہ سمجھتا تھا کہ میں تو مالک الملک ہوں' قادرِ مطلق ہوں' پھر بھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اگر میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو ہوسکتا ہے کوئی بلوا ہو جائے' کوئی فساد پیدا ہو جائے' کوئی ہنگامہ پیدا ہو جائے' لہٰذا پہلے وہ درباریوں کے سامنے یہ بات رکھ رہا ہے کہ تم ذرا مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر

(۱) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب ثیاب البیض۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب من مات لا یشرك باللہ شیئا دخل الجنۃ۔

دوں۔ اِس موقع پر درباریوں میں سے ایک باعزیمت شخص جو ابھی تک اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے' کھڑے ہوئے اورانہوں نے ایسی دھواں دار تقریر کی جو بلاغت و فصاحت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔قرآن مجید میں کسی رسول اور نبی کی تقریر بھی اتنی مفصل نقل نہیں ہوئی ہے جتنی اس ''رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ'' کی تقریر نقل ہوئی ہے۔انہوں نے حاضرین کے سامنے ایسا سماں باندھا کہ فرعون کو بس کرنا پڑی اور اس نے کہا: ﴿مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ۝۲۹﴾ (المؤمن) ''میں تو تم لوگوں کو وہی رائے دے رہا ہوں جو مجھے مناسب نظر آتی ہے اور میں اسی راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہوں جو ٹھیک ہے''۔ اب دیکھئے کہ اگر اُن مؤمن آلِ فرعون کی اس واقعہ سے پہلے اسی حالت میں وفات ہو جاتی تو انہیں کیسے مسلمان مانا جاتا! لیکن یہ ایک امکانی صورت ہے جو میں نے آپ کے سامنے رکھ دی۔

اس ضمن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث بھی مروی ہے :اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَمُعَاذٌ رَدِيْفُهٗ عَلَى الرَّحْلِ ''ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آپؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے''۔اس موقع پر آپؐ نے تین بار فرمایا: ((يَا مُعَاذُ)) ''اے معاذ!'' انہوں نے تین بار ہی جواب دیا: لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ))(۱) ''جو شخص بھی دل کی گہرائی اور صداقت سے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دے گا''۔ اس حدیث میں شہادت کے ساتھ قلبی یقین کا بھی ذکر ہے' لہٰذا یہ ایمان صرف قانونی ایمان نہیں' بلکہ قلبی ایمان ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ ایسی شہادت دینے والے پر اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کو حرام کر دے گا۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب من خص بالعلم قومًا دون قوم کراھیة ان لا یفھموا۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنة قطعًا۔

اسلام‘ ایمان اور احسان (۳)

۲۲ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾ (العصر)

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ (الحُجُرٰت)

’’حدیثِ جبریلؑ‘‘ کے مطالعہ کے دوران گزشتہ نشست میں اقرارٌ باللّسان‘ تصدیقٌ بالقلب اور اعمالِ صالحہ کے ضمن میں کچھ گفتگو ہوئی تھی کہ آیا یہ تینوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں یا نہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں اس بارے میں بہت زیادہ کلامی بحثیں ہوئی ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر اور گروہ سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ ’’کرامیہ‘‘ کا تھا۔ اگرچہ یہ فرقہ اب معدوم ہو چکا ہے اور اس نام سے اس کا کوئی وجود نہیں ہے‘ لیکن مسلمانوں کے جہلاء کی اکثریت کا خیال یہی ہے جو کرامیہ کا موقف تھا‘ کہ ایمان بس اقرارٌ باللسان پر موقوف ہے‘ اگر کچھ اچھے عمل بھی ہو جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ صرف اقرارٌ باللسان ہی نجات کے لیے کافی ہے‘ عمل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی تصدیقٌ بالقلب ضروری ہے۔ اور یہ کہ اقرارٌ باللسان کے ساتھ اگر کوہِ ہمالہ کے برابر بھی گناہ ہوں تو وہ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کرامیہ کا موقف پورے مجموعۂ احادیث کو چھوڑ کر صرف ایک حدیث پر مبنی ہے جو بخاری شریف میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ان کے موقف کو بظاہر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ نبویؐ سے بھی تقویت ملتی

ہے۔ پچھلی نشست میں یہ دونوں احادیث تفصیل سے بیان ہو چکی ہیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ ہم صرف ایک حدیث سے پورا استنباط نہیں کر سکتے' بلکہ باقی سینکڑوں احادیث بھی پیش نظر رکھنی ہوں گی جن میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح کو بھی نجات کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ آغازِ خطاب میں سورۃ العصر کی تلاوت کی گئی۔ اس کا ترجمہ ہے:

''زمانے کی قسم! یقیناً انسان خسارے میں ہے۔ سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور آپس میں حق بات کی تاکید کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

اس اعتبار سے صرف اس ایک حدیث کی بنیاد پر کوئی موقف قائم کر لینا غلط ہے۔ اس ایک حدیث سے استدلال کر لینے سے تو تصدیق بالقلب اور اعمالِ صالحہ تو کیا ایمان بالرسالت بھی ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس میں تو رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ))

''کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو کہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ' پھر اسی پر اُس کی موت واقع ہو جائے' مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔''

اب یہاں تو صرف توحید ہے' رسالت کا اقرار بھی نہیں اور باقی ایمانیات یعنی آخرت' ملائکہ' کتابوں اور انبیاء علیہم السلام پر ایمان بھی سرے سے زیرِ بحث نہیں آئے۔ اس لیے اس ایک حدیث ہی کو اپنی گفتگو اور نتائج کا مبنیٰ یا مدار بنا لینا غلط ہے۔ البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جو حدیث نبویؐ مروی ہے اس میں رسالت کا اقرار بھی ہے اور اس کے الفاظ میں ہمہ گیریت بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ))

''جو شخص بھی اپنے دل کی گہرائی اور صداقت سے یہ گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ کو حرام کر دے گا۔''

اس حدیث میں ایک تو رسالت کا اقرار بھی ہے اور دوسرے ''صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ'' کے

الفاظ میں تو معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے‘ گویا ایک قیامت مضمر ہے۔ اس لیے کہ کوئی شخص اگر سچے دل سے کوئی بات زبان سے نکالے گا تو عمل بھی تو اُس کے مطابق کرے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کو ''صِدْقًا مِنْ قَلْبِہٖ'' (سچے دل سے) مانے گا تو اس کے احکام پر بھی تو چلے گا۔ اسی طرح اگر سچے دل سے اور پختہ ارادے کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا اقرار کرے گا تو آپ ﷺ کی پیروی بھی تو کرے گا۔ البتہ صرف حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہمارے استدلال کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

دوسرا طبقہ ''اشاعرہ'' کا ہے جن کے نزدیک ایمان اور نجات کے لیے زبان سے اقرار لازم نہیں ہے‘ صرف دل کی گواہی کافی ہے۔ اس ضمن میں مَیں نے آلِ فرعون کے مؤمن کی مثال دی تھی جن کے بارے میں قرآن میں آیا ہے: ﴿یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗٓ﴾ (المؤمن:۲۸) ''وہ (ایک خاص وقت تک) اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے''۔ لیکن جب وقت کے فرعون نے دربار میں قرارداد (resolution) پیش کی: ﴿ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی﴾ (المؤمن:۲٦) ''مجھے اب اجازت دو موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کرنے کی'' تو اُس وقت مؤمنِ آلِ فرعون نے کھڑے ہو کر فرعون اور درباریوں کے سامنے اعلانِ حق کیا اور اپنی مفصّل اور مؤثّر تقریر سے ایسا سماں باندھا کہ فرعونِ وقت بے بس ہو گیا۔ اس میں بھی ایک امکان کو پیش نظر رکھیے! ہو سکتا ہے کہ مؤمن آلِ فرعون نے بالعموم تو اپنے ایمان کو مصلحتاً خفیہ رکھا ہو لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رازدارانہ انداز میں بتا دیا ہو اور انہیں اس پر گواہ بنا لیا ہو! واللہ اعلم بالصواب!

اشاعرہ کے بعد ہمارے ہاں دو طبقے اور ہیں‘ یعنی مُرجئہ اور احناف (احناف سے مراد ہیں امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے پیروکار)۔ ان میں سے مُرجئہ کے نزدیک ایمان ''اقرارٌ باللسان'' اور ''تصدیق بالقلب'' دونوں کے مجموعے کا نام ہے‘ جبکہ عمل کا ایمان اور نجات سے سرے سے کوئی تعلق نہیں۔ گویا یہ اپنے عقیدے کے اعتبار سے کرامیہ کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ اور احناف جو پوری دنیا کے اندر ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں‘ ان کا موقف بھی یہ ہے کہ ایمان نام ہے تصدیق بالقلب اور اقرارٌ باللسان کا‘ اور ''عمل'' ایک

علیحدہ چیز ہے' ایک الگ کیٹیگری ہے جس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ''علیحدہ'' کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ ان کے نزدیک عمل کا تعلق ایمان سے تو نہیں ہے البتہ نجات کے ساتھ اس کا ایک تعلق ہے۔ اس بنیاد پر مُرجئہ اور احناف کے موقف میں بڑا بنیادی فرق واقع ہو جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک اگر کسی کے دل میں ایمان تھا اور اس نے دنیا میں زبان سے اس کا اقرار بھی کیا' اس شخص کے اعمال کا جب وزن کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑا گناہوں سے بھاری نکلے گا تو ایسا شخص سیدھا جنت میں جائے گا۔ لیکن اگر تصدیق بھی تھی اور اقرار بھی تھا لیکن اعمال میں گناہوں کا پلڑا نیکیوں سے بھاری ہوا تو وہ جہنم میں جائے گا' لیکن اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر اپنے ایمان کی بدولت جو اُس کے دل میں تھا' وہاں سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک عمل کا تعلق نجات سے تو ہے لیکن یہ ایمان کا حصہ نہیں ہے۔

ان کے علاوہ ہمارے ہاں چار گروہ ایسے ہیں جن کے نزدیک ایمان تین چیزوں ''اقرارٌ باللسان' تصدیقٌ بالقلب اور عملِ صالح'' کا مجموعہ ہے۔ گویا ان کے نزدیک عمل صالح بھی ایمان کا جزو ہے۔ ان میں سب سے نمایاں تو سید المحدثین امام بخاریؒ ہیں' اور باقی ائمۂ ثلاثہ ہیں' یعنی امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ علیہم۔ چنانچہ ائمۂ اربعہ میں سے بھی تین اِس رائے کے قائل ہیں کہ عملِ صالح ایمان کا جزو ہے۔

اس اعتبار سے دیگر گروہ معتزلہ' شیعہ اور خوارج ہیں۔ خوارج کہتے ہیں کہ گناہِ کبیرہ سے انسان ایمان اور اسلام دونوں سے نکل جاتا ہے' لہٰذا مرتد قرار پاتا ہے۔ اب اس کا مال اور بیوی بچے مالِ غنیمت ہیں۔ خوارج کے کفر پر تو اُمت کا اتفاق ہے کہ یہ لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ معتزلہ اور شیعہ ان کے آس پاس ہیں۔ معتزلہ کے نزدیک گناہِ کبیرہ کی بنیاد پر ایک انسان ایمان سے بھی نکل جاتا ہے اور اسلام سے بھی' لیکن کافر نہیں ہوتا' لہٰذا وہ مرتد شمار نہیں ہوگا۔ وہ مباح الدم اور مباح المال نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص ایمان سے بھی نکل گیا اور اسلام سے بھی نکل گیا تو پھر اس کا مقام کہاں ہے؟ اس لیے کہ اسلام اور کفر کے درمیان کوئی بفر (buffer)

زون تو ہے نہیں! کفر اور اسلام کی سرحدیں تو ملی ہوئی ہیں۔ کوئی شخص یا تو اِدھر ہے یا اُدھر۔ تو اس اعتبار سے معتزلہ کا موقف مبہم بھی ہے' غیر معقول بھی ہے اور غیر منطقی بھی۔ البتہ شیعہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص پھر منافق ہے۔ لیکن منافق بھی قانونی طور پر تو مسلمان ہوتا ہے۔ تو گویا معتزلہ اور اہلِ تشیّع کا موقف ایک دوسرے کے بہت قریب ہے۔

اس ضمن میں امام المحدّثین امام بخاریؒ اور ائمہ ثلاثہ کا موقف یہ ہے کہ اگرچہ ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور عمل صالح ایمان کا جزو ہے' لیکن گناہِ کبیرہ سے کوئی شخص نہ ایمان سے نکلتا ہے اور نہ اسلام سے نکلتا ہے' البتہ وقتی طور پر جبکہ وہ گناہ کر رہا ہوتا ہے' ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے اُوپر منڈلاتا رہتا ہے اور جب وہ گناہ سے فارغ ہوتا ہے تو ایمان پھر واپس آجاتا ہے۔

اب میں صرف اہل سنّت تک اپنی بات کو محدود رکھنا چاہتا ہوں' اس لیے کہ مُرجۂ' معتزلہ' اشاعرہ اور کرامیہ تو اَب ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں' ان کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل تشیّع اگرچہ موجود ہیں' لیکن ان کے بارے میں مَیں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا۔

ہمارے ہاں اہل سنت کے دو ہی طبقے ہیں' یعنی احناف اور اہلِ حدیث۔ اہلِ حدیث کے نزدیک سب سے بڑی حجت اور سب سے بڑی دلیل امام بخاریؒ ہیں اور احناف کے نزدیک سب سے بڑی دلیل امام الفقہاء امام ابوحنیفہؒ ہیں' اگرچہ فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ کے کچھ فتاویٰ کے علاوہ زیادہ تر اُن کے دو شاگردوں قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے فتاویٰ پر مشتمل ہے۔

احناف اور اہل حدیث کے الگ الگ موقف سامنے آنے کے بعد اِن کے اندر تطبیق کیا ہوگی' یہ ایک بہت باریک اور بہت اہم نکتہ ہے۔ اس تطبیق کے ذریعے یہ عقدہ (dilemma) حل ہو جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا جو موقف ہے کہ ایمان تصدیق بالقلب اور شہادت یا اقرار کا نام ہے' تو دنیا میں تو ''تصدیق بالقلب'' کی توثیق (verification) ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا اِس موقف کی رو سے دنیا کی حد تک ایمان گویا صرف اقرار پر مبنی

ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کا یہ موقف بھی بہت واضح ہے کہ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص نہ اسلام سے نکلتا ہے نہ ایمان سے' بلکہ وہ مسلمان ہی رہتا ہے۔ ان کے نزدیک جہاں تک نفسِ تصدیق کا تعلق ہے تو اس میں نہ اضافہ ہوتا ہے اور نہ کمی ہوتی ہے' بلکہ یہ جامد حیثیت میں برقرار رہتی ہے' لیکن ایمان میں جو حدّت اور شدّت ہے اس میں کمی یا بیشی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا موقف عام طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ''ایمان تو قول کا نام ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے''۔ جبکہ امام بخاریؒ کا موقف ہے: اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَعَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ ''ایمان قول اور عمل دونوں کے مجموعے کا نام ہے' یہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے''۔ تو بظاہر احوال اور بظاہر الفاظ یہ دونوں موقف ایک دوسرے کی مکمل ضد معلوم ہوتے ہیں' جو قابلِ تطبیق (reconcilable) ہیں ہی نہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ دونوں ہی صد فیصد درست ہیں۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ دونوں موقف صد فیصد درست کیسے ہوسکتے ہیں جبکہ ان کا محل اور مقام ہی جدا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فقیہہ ہیں۔ وہ ایمان کے قانونی پہلو پر بات کر رہے ہیں جس کی بنیاد پر کوئی شخص دنیا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۹۴ کے حوالے سے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ میدانِ جنگ میں بھی اگر کوئی شخص اپنے اسلام کا اقرار کرے تو آپ اُسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ''لَسْتَ مُؤْمِنًا'' (تم مؤمن نہیں ہو)' اس لیے کہ دنیا میں اسلام کی بنیاد اقرار ہے۔ اس حوالے سے گزشتہ نشست میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا واقعہ بیان ہو چکا ہے کہ ایک کافر سے اُن کا دوبدو مقابلہ ہو رہا تھا' وہ کافر آپؓ کی تلوار کی عین زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ تو کلمۂ شہادت پڑھ کر محض اپنی جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے' لٰہذا آپؓ نے تلوار چلا کر اس کی گردن اڑا دی۔ اس پر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سرزنش فرمائی کہ اے اسامہ! قیامت کے دن کیا کرو گے جب یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا؟

اس اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور دیگر فقہاء کے نزدیک نماز' روزہ' حج اور

زکوٰۃ' جو اسلام کے ارکان ہیں اور چوٹی کے اعمال ہیں' ان پر عمل نہ کرنے کی بنیاد پر بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا' البتہ ان میں سے کسی کا انکار کر دے گا تو کافر ہو جائے گا۔مختلف فقہاء کے نزدیک اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو تعزیر کے طور پر اسے جسمانی سزا دی جائے گی' اسے قید کیا جائے گا اور اسے توبہ پر مجبور کیا جائے گا۔بعض فقہاء کا موقف ہے کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے' اس لیے کہ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(۱)

''بندے اور کفر و شرک کے مابین نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لیکن یہ قتل کرنا بھی تعزیراً ہو گا' مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔جیسے شادی شدہ زانی پر حد جاری کر کے اسے رجم کے ذریعے قتل تو کیا جائے گا' لیکن اسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔چنانچہ بالعموم عمل کی بنیاد پر تکفیر نہیں ہو گی' البتہ بعض اعمال ایسے ہیں جن کے ارتکاب سے تکفیر ہو جائے گی' جیسے کوئی شخص شرکِ جلی کا مرتکب ہو رہا ہے' مثلاً کسی بُت کو سجدہ کر رہا ہے تو وہ کافر ہے۔

احناف کا جو یہ موقف ہے کہ ایمان ایک جامد حالت میں ہے جو نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر یا قانونی ایمان کی بنیاد پر دنیا میں ایک شخص کو جو قانونی مرتبہ (legal status) حاصل ہوتا ہے اس میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی ہوتی ہے۔نیک اعمال سے کسی مسلمان کا مرتبہ اونچا نہیں ہوتا اور بُرے اعمال سے نیچا نہیں ہوتا۔کوئی مسلمان اللہ کے ہاں تو اپنے فسق و فجور کی سزا پائے گا' لیکن دنیا میں اس کا مرتبہ (status) برقرار رہے گا۔قانونی اور دستوری سطح پر سب مسلمان برابر ہیں۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا بہت عالی مرتبت اور بہت اہم قول ہے کہ: اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ یعنی ''ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے''۔اس کے لیے مَیں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں۔ان میں سے ایک مؤمن اور متقی ہے' تہجد گزار ہے' شریعت کی پابندی کرتا ہے' جبکہ دوسرا فاسق و فاجر ہے' وہ یا تو نماز پڑھتا ہی نہیں یا کبھی کبھار پڑھ لیتا ہے' اور کبھی کبھی شراب بھی پی

(۱) صحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان اطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة۔ ترمذی کی روایت میں الفاظ ہیں: ((بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))

لیتا ہے۔ اب باپ کے فوت ہونے پر جب وراثت تقسیم ہوگی تو کیا متقی کو زیادہ اور فاسق و فاجر کو کم حصہ ملے گا؟ نہیں' بلکہ برابر برابر ملے گا۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کا قانونی مرتبہ (legal status) ایک جامد چیز ہے' جس میں نہ کوئی اضافہ ممکن ہے اور نہ کوئی کمی۔☆

آج کے دَور میں ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے' اور اللہ کرے کہ ایسا ہو' تو اس کے سربراہ کا انتخاب کس طریقے سے ہوگا؟ اس کے لیے مشاورت کا کیا نظام ہوگا؟ اگر انتخابات کا طریقہ اختیار کیا جائے تو رائے دہی کا حق کس کو حاصل ہوگا؟ خلافتِ راشدہ کے دَور میں تو چونکہ قبائلی معاشرہ تھا لہٰذا سربراہِ ریاست کے انتخاب کے لیے قبیلوں کے سردار مل بیٹھ کر جو مشورہ کر لیتے تھے وہی کافی ہوتا تھا۔ لیکن اب قبائلی معاشرہ نہیں ہے' اور خلیفۂ وقت یا سربراہِ ریاست کا انتخاب بھی ضروری ہے' اس لیے کہ وہ آسمان سے تو نازل نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی نبی یا رسول ہوگا' لہٰذا اس کے لیے انتخاب کا کوئی نہ کوئی طریقہ ایجاد کرنا پڑے گا۔ تو اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کے انتخاب کا حق صرف متقیوں کو ہوگا یا اس میں فاسق و فاجر مسلمان بھی رائے دے سکتے ہیں؟ لوگوں کے ذہنوں میں اس طرح کا تصور ہے کہ شاید مسجدوں میں رجسٹر کھول دیے جائیں گے اور پنج وقتہ نماز کی حاضری لی جائے گی' اور جو نمازی ہوگا اس کو ووٹ کا حق دار سمجھا جائے گا۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ قانونی اور دستوری حقوق (Legal and constitutional rights) میں متقی اور فاسق مسلمان بالکل برابر ہیں۔ جیسے فزیالوجی کا ایک قاعدہ ''All or none law'' کہلاتا ہے۔ یعنی کوئی چیز ہوگی تو پوری ہوگی اور نہیں ہوگی تو بالکل نہیں ہوگی۔ کمی بیشی والی بات نہیں ہوگی۔ اسی طرح کوئی شخص اسلام کے دائرے میں ہے تو اسے سارے قانونی حقوق حاصل ہیں اور اگر دائرۂ اسلام میں نہیں ہے تو اس کے سارے حقوق ختم ہیں۔ جو بھی اسلام کی سرحد سے باہر نکلا وہ کافر اور مرتد ہوا' اب اُس کے مسلمان کی حیثیت سے حقوق ختم ہو گئے۔ اس کے نکاح میں اگر کوئی مسلمان

☆اس موضوع پر اللہ تعالیٰ نے مجھے الحمدللہ شرح صدر عطا فرمایا ہے اور ''حقیقت ایمان'' نامی کتاب میں اس ضمن میں مفصل مباحث ضبطِ تحریر میں آ چکے ہیں۔

خاتون ہے تو اُس سے نکاح فسخ ہو گیا' اب وہ مسلمان باپ کی وراثت میں سے حصہ نہیں پا سکتا۔ تو امام ابو حنیفہؒ کا موقف قانونی ایمان کے حوالے سے ہے۔

اب ہم امام بخاریؒ کے موقف کی طرف آتے ہیں۔ امام بخاریؒ کا موقف حقیقی ایمان یا بالفاظِ دیگر یقینِ قلبی والے ایمان کی بنیاد پر ہے۔ یہ بڑی منطقی سی بات ہے کہ انسان کا عمل اِس یقینِ قلبی والے ایمان کے خود بخود تابع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ یقین ہی کیا ہوا جس کے تابع عمل نہ ہو! یقین تو بہت دور کی بات ہے' اگر کسی بات پر گمانِ غالب بھی ہوتا ہے تو بھی انسان کا عمل اُس کے تابع ہو جاتا ہے۔ مثلاً سب کو معلوم ہے کہ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں چوہا خور سانپ مشہور ہے جو چوہوں کو تلاش کر کے ہڑپ کر جاتا ہے اور وہ انسانوں کو نہیں کاٹتا' اور اگر کاٹ بھی لے تو اُس میں زہر نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے سانپ ہوتے ہیں جو زہریلے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود انسان ہر ایک سانپ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے محض اس گمان کی بنیاد پر کہ شاید یہ زہریلا ہو۔ چنانچہ یہ ایک منطقی سی بات ہے کہ انسان کا عمل اس کے ایمان کے خود بخود تابع ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی ایمان کا ذکر آیا ہے اس کے ساتھ عمل کا ذکر بھی لازماً ہوا ہے۔ جیسے سورۃ العصر کے الفاظِ مبارکہ ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝٢ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣﴾

''زمانے کی قسم! یقیناً انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور آپس میں حق بات کی تاکید کی اور صبر کی تلقین کی۔''

اسی طرح سورۃ التین کے الفاظِ مبارکہ ہیں:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٦﴾

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی' اور طورِ سینا کی' اور اِس پُر امن شہر (مکہ مکرمہ) کی'

تحقیق ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر ہم نے اسے الٹا پھیر کر
سب نیچوں سے نیچا کر دیا' سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل
کرتے رہے' تو اُن کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔"

تو اس اعتبار سے عملِ صالح حقیقی ایمان یا بالفاظِ دیگر یقینِ قلبی والے ایمان کا جزوِ لاینفک ہے۔ یہ امام بخاریؒ کا موقف ہے اور یہ بھی صد فیصد درست ہے۔ اور یہ یقینِ قلبی والا ایمان' جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' جامد نہیں ہوتا' بلکہ گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے' اور اعمالِ سیئہ کی بنا پر اِس کی نفی بھی ہوتی ہے۔ بے شمار احادیث ایسی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ فلاں گناہ کرو گے تو ایمان کی نفی ہو جائے گی۔ جیسے یہ حدیثِ نبویؐ پہلے بھی بیان ہو چکی ہے:

((لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ))

"کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی شرابی حالتِ ایمان میں شراب پیتا ہے۔"

اگر کوئی شخص زنا کر رہا ہے یا چوری کر رہا ہے یا شراب پی رہا ہے تو اُس کے ایمان کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی ہے؟ آم کے درخت پر اگر آم نہیں لگتے تو کیا فائدہ اُس درخت کا؟ اسے تو کاٹ کر اُس کی لکڑی جلالی جائے گی۔ وہ ایمان تو پھر دھیلے کا بھی نہیں ہے جس میں عملِ صالح کے برگ و بار نہ لگے ہوں' بلکہ گناہ ہی گناہ ہوں! اس حدیث میں تو بڑے گناہوں زنا' سرقہ اور شراب خوری کا ذکر ہے' لیکن ایک حدیث میں تو ایک معمولی سی کج خلقی پر بھی ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ یہ حدیث بھی بیان ہو چکی ہے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) "اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں......" اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کانپ گئے کہ کون ہے وہ بدبخت انسان جس کے بارے میں یہ بات کہی جا رہی ہے! انہوں نے دریافت کیا: وَمَنْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ؟ "اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ کون شخص ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِيْ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) "وہ شخص جس کی ایذارسانی سے اس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے"۔ یہاں آپؐ نے زنا یا چوری وغیرہ جیسے کسی کبیرہ گناہ کا

ذکر نہیں فرمایا‘ بلکہ محض بدخلقی پر تین بار اللہ عزّ وجلّ کی قسم کھا کر کہا کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہے۔
ہمارے فقہاء اِس حدیث کا ترجمہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں: ”اللہ کی قسم‘ اُس شخص کا ایمان کامل نہیں ہے......“ اس لیے کہ مطلقاً ایمان کی نفی سے امام ابوحنیفہؒ کے موقف کی نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن آپ سوچیے کہ اس حدیث میں جو زور ہے اس مفہوم سے اس کا تو دھیلہ ہو جاتا ہے! اس لیے کہ ایمانِ کامل تو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اِس حدیث کے الفاظ میں وہ زور ہے کہ آدمی کانپ جاتا ہے‘ لیکن اس ترجمے سے اس کا اصل مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اسے اس کی حالت پر برقرار رکھیے کہ ایسا شخص مؤمن نہیں ہے‘ اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔
البتہ ایسا شخص کافر بھی نہیں ہے کہ اب مرتد قرار پا کر واجب القتل ہو گیا ہو‘ بلکہ وہ قانونی طور پر مسلمان ہی ہے‘ کیونکہ وہ زبان سے اپنے اسلام کا اقرار کر رہا ہے۔ یہ تو خوارج‘ معتزلہ اور اہلِ تشیع وغیرہ کا عقیدہ ہے کہ گناہ سے انسان ایمان اور اسلام دونوں سے نکل جاتا ہے۔

یہ جو میں نے بتایا کہ اعمال کی بنیاد پر ایمانِ حقیقی کے اندر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور بعض اوقات اس کی نفی بھی ہو جاتی ہے‘ تو اس ضمن میں مَیں قرآن مجید کے تین حوالے پیش کر رہا ہوں۔ غزوۂ اَحزاب کا نقشہ ذرا ذہن میں لائیے۔ یہ بڑا سنگین وقت تھا۔ بارہ ہزار کا لشکر مدینے کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف تو خیر ”حرّات“ تھے جہاں نہ گھوڑا چل سکتا تھا نہ اونٹ‘ لہٰذا یہ سمت محفوظ تھی‘ لیکن باقی تینوں اطراف میں دشمنوں کا لشکر تھا۔ مسلمانوں پر کئی کئی دن کا فاقہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ مسلمانوں کے ایمان کی آخری درجے میں آزمائش ہوگئی۔ نتیجتاً منافقین کا نفاق ان کے دلوں سے نکل کر ان کی زبانوں پر آ گیا۔ سورۃ الاحزاب میں ان کے الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿وَإِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ (۱۲)

”اور (یاد کرو وہ وقت) جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا (صاف صاف) کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کیے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔“

ہمیں تو اللہ اور اس کے رسول نے سبز باغ دکھا کر اور جھوٹے وعدے کر کے مروا دیا!

(نعوذ باللہ) ۔اللہ کے رسول نے تو کہا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں ہوں گے☆ اور یہاں یہ کچھ ہو رہا ہے! تو جس نفاق کو وہ چھپائے ہوئے تھے وہ ان کی زبانوں پر آ گیا۔اس کے برعکس دیکھئے کہ اسی کیفیت میں اہلِ ایمان کا ردِّعمل کس قدر مختلف تھا۔اس کا نقشہ سورۃ الاحزاب میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾﴾ (الاحزاب)

''اور جب سچے مؤمنوں نے لشکروں کو دیکھا تو کہا یہی تو ہے جس کا ہم سے وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) نے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی ہی کو اور زیادہ بڑھایا۔''

یعنی اس آزمائش سے اہلِ ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو گیا اور اہلِ نفاق کا نفاق ان کی زبانوں پر آ گیا۔اہلِ ایمان کے پیشِ نظر دراصل وہ آیات تھیں جن میں اللہ تعالیٰ نے مدنی دَور کے شروع میں ہی فرما دیا تھا:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾﴾ (البقرۃ)

''اور (اے مسلمانو! کمرِ ہمت کس لو) ہم لازماً تمہیں آزمائیں گے (تمہیں بڑے بڑے امتحانوں سے گزاریں گے) کسی قدر خوف سے اور بھوک (فقر و فاقہ) سے اور مالوں' جانوں اور پھلوں کے نقصان سے ۔اور (اے نبیؐ!) بشارت دے دیجیے (ان آزمائشوں میں) صبر کرنے والوں کو۔''

آزمائش کا یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی امتحان میں فیل ہوتا ہے اور کوئی پاس ہوتا ہے۔جیسے عربی کہاوت ہے: اِنَّ فِی الْاِمْتِحَانِ يُكْرَمُ الْمَرْءُ اَوْ يُهَانُ ''امتحان کے موقع پر یا تو

☆ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر جب سراقہ بن مالک نے رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کیا اور اُن کا گھوڑا بار بار زمین میں دھنسا تو آپ ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے کہا تھا: ''اے سراقہ! میں کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں دیکھ رہا ہوں''۔چنانچہ دورِ فاروقیؓ میں فتح ایران کے بعد کسریٰ کے زیورات بھی مالِ غنیمت میں آئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسریٰ کے کنگن حضرت سراقہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں پہنائے۔

کسی کی عزت افزائی کی جاتی ہے یا اسے ذلیل کیا جاتا ہے۔''

دوسرا مقام سورۃ الانفال کی آیت کریمہ ہے:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ وَاِذَا تُلِيَتۡ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُهٗ زَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۝﴾

''یقیناً (سچے) اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل لرز جاتے ہیں جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ربّ پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔''

جب کوئی مسلمان قرآن پڑھتا ہے تو اگر وہ کج رو نہیں ہے تو اس کے ایمان میں لازماً اضافہ ہوتا ہے جس کا احساس اسے خود بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص اہل ایمان کی مجلس میں بیٹھتا ہے تو وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اس کے ایمان میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی شخص غافلین اور اوباش لوگوں کی صحبت میں کچھ وقت گزارتا ہے تو وہ خود محسوس کرتا ہے کہ اگر اس کے پاس ایمان کی کچھ پونجی تھی تو اب اس میں کمی ہوگئی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوتا ہے کہ قلبی ایمان جامد شے نہیں ہے' یہ عملِ صالح کے ساتھ بڑھتا ہے اور گناہوں کے ساتھ گھٹتا ہے' اور اگر گناہ انسان کا احاطہ کر لیں تو یہ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيۡٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝﴾ (البقرۃ)

''کیوں نہیں! جس شخص نے (جان بوجھ کر) ایک بڑا گناہ کمایا اور اُس کے گناہ نے اس کا احاطہ کر لیا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں' جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اب یہاں خلود فی النار کا ذکر ہے جو کافروں کے لیے ہے' مسلمان کے لیے تو خلود فی النار نہیں ہے۔ جیسے احناف کی رائے ہے کہ اگر ایمان موجود ہے لیکن اعمالِ صالحہ کا پلڑا ہلکا ہے اور گناہوں کا پلڑا بھاری ہے تو وہ شخص جہنم میں جائے گا لیکن اپنے گناہوں کے بقدر سزا پا کر وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ لیکن آیت مذکورہ میں چونکہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا ذکر ہے تو ثابت ہوا کہ گناہوں سے ایمان گھٹتا رہتا ہے اور جب گناہ کسی کا مکمل طور پر احاطہ کر لیں تو ایمان ختم بھی ہو جاتا ہے۔ علماء کا ایک بڑا بلیغ قول ہے: اَلْمَعَاصِیْ بَرِیْدُ

الْكُفْرِ ''نافرمانی اور گناہ کفر کی ڈاک ہوتے ہیں''۔ یعنی انسان جب مسلسل گناہ کیے جاتا ہے تو وہ گناہ اسے کفر تک لے جاتے ہیں۔

تیسرا مقام سورۃ التوبۃ کا ہے جس میں منافقین کا نقشہ بایں الفاظ کھینچا گیا ہے:

﴿وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴿۱۲۴﴾﴾

''اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو اِن (منافقین) میں سے کوئی (استہزاء کے طور پر) کہتا ہے تم میں سے کس کا ایمان اِس سورت سے بڑھ گیا ہے؟ پس جو لوگ ایمان لائے اُن کے ایمان میں اس سورت نے (فی الواقع) اضافہ کر دیا اور وہ (اس سے) بہت خوش ہیں۔''

یعنی کسی نئی سورت کے اترنے پر منافقین کے ایمان میں تو کیا اضافہ ہونا تھا جبکہ ان کے اندر ایمان موجود ہی نہیں تھا' لیکن اس سے اہل ایمان کے ایمان میں یقیناً اضافہ ہوتا تھا۔ جیسے ارشاد ہوا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ﴾ (الحدید:۹)

''وہ (اللہ) ہی تو ہے جو اپنے بندے (محمدﷺ) پر واضح آیات نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔''

اب اس حوالے سے ایک حدیثِ نبویؐ پیش خدمت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ' ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ))

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے جس اُمت میں بھی کوئی نبی بھیجا تو اُس کے اپنی اُمت میں سے کچھ اصحاب اور حواری (مددگار) ہوا کرتے تھے جو اپنے رسول کی سُنّت کو اختیار کر لیتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا

انہیں حکم نہیں ہوتا تھا۔“

یہ درجہ بدرجہ زوال ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اُمتِ محمدؐ میں بھی ہوا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعینؒ کا دَور آیا' ان کے بعد تبع تابعین کا دَور آیا' جو بہت سنہری اَدوار تھے۔ مرورِ ایام کے بعد یہ ہمارا زوال کا دَور ہے۔ ہمارے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو چکا ہے اور ہم وہ کچھ کر رہے ہیں جس کا ہمیں حکم نہیں ہوا۔ یہ جو بدعات پر مبنی رسومات ادا ہو رہی ہیں' مثلاً تیجے ہو رہے ہیں' دسویں' بیسویں اور چالیسویں ہو رہے ہیں' برسیاں ہو رہی ہیں' تو یہ کیا ہیں؟ یہ کس نے بتائی ہیں؟ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو یہ نہیں بتائیں نہ صحابہؓ نے بتائی ہیں۔ یہ عید میلاد النبیؐ جو آج منائی جا رہی ہے یہ نہ صحابہؓ نے کبھی منائی ہے اور نہ تابعین نے' تو ہم یہ کہاں سے لے آئے؟ یہ عیسائیوں کی پیروی ہی تو ہو رہی ہے۔ کرسمس ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یومِ پیدائش ہے اور ان کی عید میلاد ہے' تو ہم نے بھی ان کی دیکھا دیکھی اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عید میلاد منانی شروع کر دی۔ جیسے عیسائی کرسمس کے موقع پر کرسمس کارڈ بھیجتے ہیں ایسے ہی ہمارے لوگ بھی عید الفطر کے موقع پر سوسو روپے کا عید کارڈ خرید کر بھیجتے ہیں۔ دینی کتابیں خریدنے کے لیے تو جیب بند ہو جاتی ہے لیکن تہنیت کے کارڈ بھیجے جا رہے ہیں' سالگرہ کے کارڈ بھیجے جا رہے ہیں۔ تو ہم نے دین کے احکام ترک کر دیے ہیں' سنتیں ترک کر دی ہیں' لیکن جس شے کا حکم نہیں ہے وہ کچھ کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے فرما رہے ہیں:

((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۱)

”تو جو شخص ایسے لوگوں کے خلاف ہاتھ سے (طاقت سے) جہاد کرے گا وہ مؤمن ہے' اور جو شخص ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے گا (غلط بات کو غلط کہے گا) وہ بھی مؤمن ہے' اور جو شخص اپنے دل کے ذریعے سے ان کے خلاف جہاد کرے گا (دل میں شدید نفرت رکھے گا) وہ بھی مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔“

تو یہاں دیکھئے کہ انسان کے طرزِ عمل کی وجہ سے ایمان کی نفیٔ مطلق ہو رہی ہے۔ اگر کسی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان.....

کے پاس اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ بزورِ ناخلف اور برے لوگوں کا مقابلہ کر سکے' اور حالات اتنے خراب ہیں کہ وہ زبان کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تو کم از کم دل میں تو ان کے اعمال سے نفرت رکھے۔ اگر اس کے دل میں بھی نفرت نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ پھر وہ ایمان سے محروم ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف ہمت کر کے زبان کھولو۔ اس پر اگر تکلیف آتی ہے تو برداشت کرو۔ یہ جو فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۵۵) یہ محض شاعری تو نہیں ہے (نعوذ باللہ)' بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر طاقت حاصل کرو اور ظالموں اور جابروں کے ساتھ ٹکرا جاؤ۔

ایمان اور عملِ صالح کے بارے میں دونوں قابلِ ذکر موقف بھی آپ کے سامنے آ گئے اور ان میں تطبیق کی صورت بھی آپ کے سامنے آ گئی۔ ایک امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے جو امام الفقہاء ہیں' اور یہ ایمان کے قانونی پہلو سے متعلق ہے کہ ایمان زبانی اقرار اور دلی تصدیق کے مجموعے کا نام ہے اور عمل کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے' بلکہ عمل الگ سے ایک کیٹیگری ہے۔ اور دلی تصدیق کو بھی دنیا میں چونکہ verify نہیں کیا جا سکتا لہٰذا باقی قول رہ جاتا ہے۔ اور یہ موقف صد فی صد درست ہے۔ دوسرا موقف امام المحدثین امام بخاریؒ اور ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا ہے' جو حقیقی ایمان سے متعلق ہے اور یہ بھی صد فی صد درست ہے۔ اِن دو مسالک یعنی حنفی مسلک اور اہلحدیث مسلک کی اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت ہے۔ یہ بظاہر دو الگ الگ مسلک ہیں لیکن ان کے مابین ایک مطابقت ہے۔ اب علماء کرام کا کام ہے کہ ان کے مابین تطبیق پیدا کر کے لوگوں کو دکھائیں۔ ایک ہی کنویں کا مینڈک بن کر بیٹھ رہنے کے بجائے ہمیں چاہیے کہ دوسروں کے مسالک کا مطالعہ کریں اور غور و فکر کریں کہ ان کا موقف کس بنیاد پر قائم ہے' ان کا استدلال کیا ہے۔ اور یہ کام عوام تو نہیں کر سکتے۔ عوام کو تو اِس مشکل دَور میں دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ جیسے امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا کہنا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہوتا ہے تو اُس کے نتیجے میں وہاں دو طبقے

وجود میں آ جاتے ہیں‘ ایک مترفین (haves) اور دوسرے محرومین (have nots)۔ ایک طرف ارتکازِ دولت ہو جائے گا‘ دولت کے انبار لگ جائیں گے۔خود لاہور ہی میں اس کا مشاہدہ کر لیجیے کہ کروڑوں روپے کا ایک ایک پلاٹ ہے اور پھر عالی شان کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ڈیفنس‘ ماڈل ٹاؤن‘ گلبرگ وغیرہ میں آپ کو یہ منظر نظر آ جائے گا۔جبکہ دوسری طرف دیکھئے تو بہت بڑی تعداد میں لوگ خطِ غربت سے بھی نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔انتہائی فقر کا عالم ہے۔کچے مکان اور جھگیاں ہیں جہاں بارش آتی ہے تو اُن کی قیامت ہوتی ہے‘ سردی گرمی آتی ہے تو قیامت ہوتی ہے۔تو تقسیمِ دولت کے غلط نظام سے ہمارے ہاں مذکورہ بالا دو طبقات وجود میں آ چکے ہیں۔تقسیمِ دولت کا غلط نظام دو دھاری تلوار ہے۔جدھر پیسے کا ارتکاز ہو جاتا ہے وہاں عیاشی اور بدمعاشی ہوتی ہے‘ دولت کا بے جا اظہار ہوتا ہے‘ گویا یہ شیطان کے چیلے ہیں۔اور جہاں فقر و فاقہ ہوتا ہے تو انسان حیوانوں کی سطح پر آ جاتے ہیں‘ جیسے لدو اونٹ یا باربرداری کے جانور ہوں۔اب ان سے کیا توقع لگائی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ سے لو لگائیں گے! بقول شاعر: ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے!

اِن بے چاروں کے لیے پیٹ بھرنا تو کیا جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ایک حدیثِ نبویؐ میں تو یہاں تک فرمایا گیا ہے: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا))(۱) ”قریب ہے کہ فقر انسان کو کفر تک لے جائے!“

اس اعتبار سے مسلکوں کے مابین باہمی تطبیق پیدا کرنا بہت ضروری اور بہت عظیم کام ہے۔اس سے فرقہ واریت کی شدت کم ہو گی اور تلخی ختم ہو جائے گی۔اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

---

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الآداب۔ والسلسلۃ الضعیفۃ للالبانی: ۴۸۰ و ۱۹۰۵۔

اسلام‘ ایمان اور احسان (۴)

۲۹ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (لقمٰن:۲۲)

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (البقرۃ)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (النساء:۱۲۵)

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْۤا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (المائدۃ)

’’حدیثِ جبریلؑ‘‘ ہمارے زیر مطالعہ ہے اور اس سے قبل تین نشستوں میں اس پر گفتگو ہو چکی ہے‘ جن میں ہم نے اس کے اہم ترین حصے کا مطالعہ کر لیا ہے۔ ذرا پس منظر کو ذہن میں لے آئیے کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مسجد نبویؐ میں تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے بال انتہائی سیاہ اور کپڑے انتہائی سفید تھے‘ اس پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی اُس سے واقف تھا۔ بہر حال وہ شخص بڑھتا چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ کے عین سامنے جا کر بیٹھ گیا‘ آپؐ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیے اور آپؐ کے زانوؤں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ اس شخص نے آپؐ سے کچھ سوالات کیے جن کے آپؐ نے جوابات دیے۔ جب وہ شخص روانہ ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر!

تمہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کون تھا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ((فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ)) ''یہ جبریلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔''

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم ﷺ سے پہلا سوال کیا: يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ! ''اے محمد (ﷺ)! مجھے بتایئے کہ اسلام کیا ہے''۔ آپؐ نے جواب دیا تو جبریلؑ نے تصدیق و توثیق کرتے ہوئے کہا: صَدَقْتَ ''آپ ﷺ نے سچ فرمایا''۔ انہوں نے دوسرا سوال کیا: فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ! ''مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے!'' آپ ﷺ نے اس کا جواب دیا تو انہوں نے کہا: صَدَقْتَ ''آپؐ نے سچ فرمایا''۔ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے تیسرا سوال کیا: فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ! ''مجھے احسان کے بارے میں بتایئے''۔ آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''تمہارا اس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ ہم ''اسلام'' اور ''ایمان'' پر تو گزشتہ نشستوں میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں اور آج کی نشست میں ہمارا موضوع یہی ''احسان'' ہے۔

''احسان'' کا لفظ ''حُسن'' سے بنا ہے جو کہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ حسن کے معنی ہیں خوبصورتی' عمدگی' موزونیت۔ اور احسان کے معنی ہیں کسی کو حسین بنانا۔ حَسُنَ' يَحْسُنُ کے معنی ہیں حسین ہونا۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کی تعریف میں کہا گیا ہے: حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ ''آپؐ کی تو تمام ہی عادات نہایت حسین تھیں''۔ اور اَحْسَنَ' يُحْسِنُ کے معنی ہیں کسی کو حسین بنانا۔ ''احسان'' کو لفظی اعتبار سے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے تاکہ اس کی اصل حقیقت واضح ہو جائے' اس لیے کہ بدقسمتی سے احسان کی جگہ ہمارے ہاں ''تصوّف'' کا لفظ معروف ہو گیا ہے' اور اتنا معروف ہوا ہے کہ اس نے لفظ ''احسان'' کو گویا ہماری لغت سے ہی خارج کر دیا ہے۔

احسان کے ایک لفظی معنی ہیں کسی پر بھلائی کرنا۔ سورۃ القصص میں ہے کہ لوگوں

نے قارون سے کہا تھا: ﴿وَاَحۡسِنۡ كَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ﴾ (آیت ۷۷) ''اور تم بھی لوگوں کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اچھائی کی ہے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت مند بنایا ہے تو تم بھی لوگوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے' ان کی مدد میں اپنے مال میں سے خرچ کرو۔ تو احسان کے معنی یہ بھی ہیں کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا' بھلائی کرنا۔ لیکن ہوا یہ ہے کہ لفظ ''تصوّف'' نے آ کر احسان کے اُس اصلی اور بنیادی معنی کو ذہنوں سے بالکل نکال دیا ہے اور ہمارے ذہنوں میں احسان کے صرف یہی معنی (حسنِ سلوک) رہ گئے ہیں۔ حالانکہ تصوّف کا لفظ نہ قرآن مجید میں آیا ہے نہ حدیث میں۔ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے تقریباً دوسو برس بعد تک یہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ایک بہت بڑے مصنّف اور مفکّر و فلسفی تھے' حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کے ہیڈ تھے اور ''قرآن اور تصوّف'' کے عنوان سے ان کی کتاب بھی ہے' انہوں نے اس لفظ پر تحقیق کی ہے اور رسالہ قشیریہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ لفظ پہلی مرتبہ ۸۲۲ء (بمطابق ۲۰۰ھ) میں یعنی آنحضور ﷺ کے انتقال کے ۱۹۰ برس بعد استعمال ہوا ہے' اس لیے کہ آپؐ کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا ہے۔ ان کے خیال میں اس لفظ ''تصوف'' کے بارے میں یہ بھی اتفاق نہیں ہو سکا کہ اس کا مادہ کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ ''صفا'' سے بنا ہے' کسی کے خیال میں ''صف'' سے بنا ہے اور کسی کی رائے ہے کہ یہ ''صُفّہ'' سے بنا ہے۔ لیکن ڈاکٹر میر ولی الدین کی رائے میں یہ تمام امکانات قطعاً غلط ہیں۔ ان کے خیال میں یہ صرف لفظ ''صُوف'' سے بنا ہے' جس کے معنی ''اُون'' کے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دَور میں آ کر جن لوگوں نے روحانیت کے میدان کو اپنی جولان گاہ بنایا تو انہوں نے اُونی لباس پہننا شروع کر دیا تاکہ جسم کو چبھے اور اسے بجائے راحت دینے کے تکلیف پہنچائے۔ دراصل روحانیت اور باطنیت (mysticism) کے میدان میں' چاہے وہ Christian mysticism ہو' چاہے Hindi mysticism ہو' چاہے New Platonism ہو' یہ چیز لازم ہوتی ہے کہ اپنے نفس کو تکلیف اور ایذا پہنچاؤ۔ تو اُن کے

خیال میں اس ''صُوف'' سے لفظ ''صوفی'' بنا ہے۔ واللہ اعلم!

لفظ تصوّف کے بارے میں ایک اور تصور بھی رہا ہے' جس کی اگرچہ این میری شمل نے بڑی تردید کی ہے' لیکن میرا گمان یہی ہے کہ لفظ ''تصوّف'' کا ماخذ یونانی لفظ ''sophia'' ہے' جس کے معنی ہیں حکمت۔ چنانچہ فلاسفی (Philosophy) کا لفظ جو ہمارے ہاں معروف ہے' وہ اصل میں ''فائلوسوفی'' ہے جس کے معنی ہیں وہ حکمت جو منطق پر مبنی ہو۔ ایسے ہی تھیوسوفی (Theosophy) کا مطلب ہے حکمت دین' معرفت خداوندی کا علم یا بالفاظِ دیگر وجدان۔ یعنی ایک تو مذہب کا عوامی اور عملی پہلو ہے اور ایک ہے اس کا علمی' فکری اور باطنی پہلو۔ آج بھی کراچی میں بندر روڈ پر تھیوسوفیکل ہال ہے۔ ایسے ہی دنیا میں Theosophical Societies رہی ہیں تا کہ تمام مذاہب کے اندر جو باطنی حکمت ہے اس کو ایک قدرِ مشترک کے طور پر سامنے لایا جائے۔

بہر حال ''احسان'' کے معنی کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی ہیں اور کسی شے کو حسین بنانا بھی۔ اب میں حضرت شدّاد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ نبویؐ پیش کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ)) ''یقیناً اللہ نے ہر چیز کے بارے میں واجب کیا ہے کہ اس میں خوبصورتی پیدا کی جائے۔'' اس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال دی: ((فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ)) ''پس جب تمہیں کسی کو قتل کرنا ہو تو خوبصورتی کے ساتھ قتل کرو''۔ قتل کے اندر خوبصورتی سے یہ مراد ہے کہ اگر کوئی شخص شریعت کی گرفت میں آ گیا ہے' اس پر قتل کی حد نافذ ہو گئی ہے تو اسے اس انداز اور طریقے سے قتل کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو۔ قرونِ اولیٰ میں جبکہ اسلامی ریاست اپنی آب و تاب کے ساتھ قائم تھی' پیشہ ور جلّاد ہوتے تھے جو اپنے اس فن میں ماہر تھے اور وہ تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں گردن کو تن سے جدا کر دیتے تھے جس سے تکلیف کم سے کم ہوتی تھی۔ اب بھی سعودی عرب میں اسلامی سزائیں نافذ ہیں اور سزا کے طور پر سر قلم ہوتے ہیں تو اِس کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ پیشہ ور جلّاد تیز دھار آلے سے ایک ہی وار میں گردن اڑا دیتے ہیں۔ حدیث کے اگلے ٹکڑے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذَّبْحَ))''اور جب (کسی جانور کو) ذبح کرنے لگو تو خوبصورتی اور عمدگی سے ذبح کرو''۔اور اس کی وضاحت یوں فرمائی:((وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ فَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهٗ))(۱) ''اور تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ ذبح کرتے وقت اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے (اسے زیادہ تکلیف نہ ہونے دے)۔''اگر کُند چُھری سے جانور کو ذبح کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ذبیحے کو یقیناً بہت زیادہ تکلیف ہوگی جبکہ تیز دھار والی چھری کے ساتھ ایک ہی وار میں جانور ذبح ہو جائے گا اور اسے تکلیف کم سے کم ہوگی۔

بہرحال آپ کے سامنے احسان کے لفظی معنی آگئے ہیں۔اسی سے قرآن مجید کی اصطلاح ہے''احسانِ اسلام''یعنی اسلام میں خوبصورتی پیدا کرنا۔ایک شخص کا اسلام تو یہ ہے کہ وہ محض مارے باندھے فرائض مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ادا کر رہا ہے۔اس میں اس کی دلی آمادگی اور دلی جذبہ شامل نہیں ہے۔منہیات کے معاملے میں بھی بے دلی اور تھڑ دلے پن کے ساتھ' طبیعت کی عدم آمادگی سے محض خانہ پوری کر رہا ہے' جبکہ ایک شخص پورے اہتمام اور توجّہ کے ساتھ اور دل کی پوری آمادگی سے فرائض انجام دے رہا ہے' نواہی سے طبیعت کی پوری آمادگی کے ساتھ احتراز کر رہا ہے' نفلی عبادات پر بھی بھرپور توجہ ہے تو گویا اس کا اسلام درجۂ احسان کو پہنچ گیا ہے۔اس کے لیے میں نے''احسانِ اسلام'' کی اصطلاح استعمال کی ہے' یا اسے''سلوکِ محمدیؐ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔اسی حوالے سے میں نے آغازِ خطاب میں قرآن مجید کے مختلف مقامات سے تین آیات تلاوت کی ہیں۔ان میں سے ایک سورۂ لقمان کی آیت ہے جو مکّی سورت ہے۔فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ﴾ (لقمٰن:۲۲)

''اور جو شخص اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (اپنے آپ کو اللہ کے

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصید والذبائح وما یوکل من الحیوان' باب الامر باحسان الذبیح والقتل وتحدید الشفرۃ۔

حوالے کر دے) اور وہ محسن ہو تو اُس شخص نے فی الواقع مضبوط حلقے کو تھام لیا۔"

العُروة الوُثقٰی یعنی مضبوط حلقہ یا کنڈا پکڑنے سے کیا مراد ہے' اسے یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص بحری جہاز کے عرشے پر کھڑا ہوا اور وہ سمندر میں گر پڑے' اسے تیرنا بھی نہ آتا ہو' لیکن اس شخص کے ہاتھ میں جہاز کا کوئی کُنڈا آ جائے تو یقیناً وہ یہی سمجھے گا کہ اب یہ کُنڈا ہی اس کی جان ہے' اس کُنڈے کو اُس نے چھوڑا تو وہ ڈوب جائے گا اور اگر اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو بچنے کا امکان موجود ہے۔

اس آیت مبارکہ میں اسلام اور احسان کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس شخص کا اسلام مارے باندھے اور زبردستی کا نہیں ہے' بلکہ وہ دلی آمادگی کے ساتھ شریعت کے اوامر و نواہی پر کاربند ہے۔ اگرچہ مارے باندھے کے اسلام کو بھی قانونی حیثیت حاصل ہے۔ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھ رہا ہے تو آپ اسے قتل نہیں کر سکتے' اِلّا یہ کہ اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہو کہ اس کی بنا پر اس کی سزا قتل ہو یا یہ کہ اس کا مرتد ہونا ثابت ہو جائے' بصورتِ دیگر اسلام اس کے لیے ڈھال ہے۔ اس کے بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں کہ عین حالتِ جنگ میں بھی اگر ایک کافر یہ محسوس کرے کہ اب میں بے بس ہو گیا ہوں' لہٰذا وہ کلمہ پڑھ دے تو پھر بھی آپ اس کو اپنے گمانِ غالب کی بنا پر' کہ اس نے صرف جان بچانے کے لیے یہ حیلہ کیا ہے' قتل نہیں کر سکتے۔ اس کا کلمہ اس کے پاس ڈھال ہے۔ تو قانونی سطح پر اسلام کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے' لیکن اصل اسلام جو مطلوب ہے وہ احسان والا اسلام ہے' یعنی اس میں خوبصورتی ہو' اس میں طبیعت کی پوری آمادگی ہو۔ پورے انہماک کے ساتھ' اپنی امکانی جدوجہد کے ساتھ ان کاموں کو انجام دیا جائے۔

دوسرا مقام سورۃ البقرۃ کی آیت ہے:

﴿بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾

"کیوں نہیں' جس شخص نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا (سرِ تسلیم خم کر دیا) اور وہ ہوا محسن (یعنی اس نے بہت عمدگی اور دلی آمادگی کے ساتھ' بہتر سے بہتر

انداز میں اوامر ونواہی کا خیال رکھا) تو اس کے لیے یقیناً اس کا اجر اس کے ربّ
کے پاس محفوظ ہے۔ اور ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین
ہوں گے۔''

اس ضمن میں تیسرا مقام سورۃ النساء کا ہے' جہاں فرمایا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ......﴾ (آیت ۱۲۵)

''اور اُس شخص سے بہتر دین کس کا ہوگا جس نے اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا
(سرِ تسلیم خم کر دیا) اور وہ بھی احسان کی کیفیت کے ساتھ......''

مذکورہ بالا آیات میں بھی دیکھئے کہ اسلام اور احسان کو جوڑ دیا گیا ہے۔ حدیث زیر مطالعہ میں ''اسلام'' اور ''احسان'' کے درمیان ''ایمان'' کا ذکر ہے۔ حضرت جبریلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے پہلا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ! دوسرا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ! اور پھر اگلا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ! یہ وہی بات ہے جو سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۳ میں آئی ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٣﴾﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا
پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی جبکہ ان کا طرزِ عمل یہ رہا ہو کہ انہوں نے تقویٰ کی
روش اختیار کی اور ایمان لائے اور عمل صالح کیے' پھر مزید تقویٰ کا اضافہ کیا اور
ایمان لائے' پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور احسان کی روش اختیار کی۔ اور اللہ محسنین
سے محبت رکھتا ہے۔''

یہاں تین درجے آ رہے ہیں: اسلام' ایمان اور احسان۔ اور حدیث زیر مطالعہ میں بھی یہی تین درجے ہیں: اسلام' ایمان اور احسان۔

اب یہاں دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ نے احسان کی کیا تعریف بیان فرمائی۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے استفسار کیا: فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ!

''اب آپ مجھے احسان کے بارے میں بتایئے''۔ تو آپؐ نے جواب ارشاد فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''یہ کہ تم اِس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ انہی کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ ہیں: ((اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اِس شدّت کے ساتھ کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' اور حبرُ الأمّۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ ہیں: ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ......)) ''کہ تو عمل کرے اللہ کے لیے (یا محنت کرے اللہ کے لیے)......'' یہ تین الفاظ ذہن میں رکھیے: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ ' اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ ' اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت' جو کہ حدیثِ جبریلؑ کا مقبولِ عام version ہے' اس میں لفظ ''عبادت'' آیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں عوامی سطح پر عبادت کا محدود تصور ہے لہٰذا یہ لفظ اس حدیث کو سمجھنے میں حجاب بن گیا ہے۔ عوامی سطح پر عبادت کا تصور محض نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ تک محدود ہے' اور ''احسان'' انہی چیزوں کے ساتھ مقید ہو کر رہ گیا ہے کہ بس نماز بہتر سے بہتر ہو اور بڑی عمدگی سے پڑھی جائے۔ اس میں خشوع و خضوع ہو' تعدیلِ ارکان کا لحاظ رکھا جائے' وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہی دیگر عبادات خوش اسلوبی سے ادا کی جائیں اور بس۔ احسان کو صرف عبادات تک محدود کر دینے سے اس حدیث کے عموم میں مجوبیت پیدا ہو سکتی تھی' مگر اللہ کا شکر ہے کہ دیگر دو روایتوں کے اندر اس کا مفہوم کھل کر سامنے آ رہا ہے۔

چنانچہ اس حدیث میں عبادت کا مفہوم صرف عبادات تک محدود نہیں ہے' بلکہ یہ ہمہ گیر ہے' البتہ اس میں عبادات بھی شامل ہیں۔ دراصل عبد کے معنی غلام کے ہیں اور غلامی میں آقا کی ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت اطاعت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ غلام مملوک ہوتا ہے' ملازم (employee) نہیں ہوتا کہ اس نے اتنے گھنٹے کام کرنا ہے' باقی

اوقات میں وہ آزاد ہے۔ لہٰذا عبادت اور بندگی میں employee اور employer کا تعلق ذہن سے نکال دیجیے! ملازم تو کہہ سکتا ہے کہ آپ نے مجھے باورچی کی حیثیت سے ملازم رکھا ہے لہٰذا میں آپ کے گھر کی صفائی نہیں کروں گا۔ لیکن غلام تو اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے' لہٰذا وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں کام تو کروں گا' فلاں کام نہیں کروں گا۔ اسے تو ہمہ وقت' ہمہ تن اور ہمہ جہت اطاعت کرنی ہے۔ سورۃ الذّٰریٰت میں دوٹوک الفاظ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۝۵۶﴾ ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنّوں اور انسانوں کو مگر اپنی عبادت (ہر آن بندگی) کے لیے۔'' شیخ سعدیؒ نے اپنے ایک شعر میں اس آیت کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی!

دوسری چیز جو اِس عبادت کا لازمی حصہ ہے وہ عبادت میں ''محبت'' کا عنصر ہے۔ یعنی عبادتِ الٰہی کا مطلب ہے محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہمہ تن اور ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا۔ اس کے لیے فارسی کا ایک لفظ ہے ''بندگی'' اور ایک ہے ''پرستش''۔ ان دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت بنے گی۔ بہرحال عبادات یعنی نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ ہی عبادت نہیں ہیں' البتہ یہ عبادت میں شامل ضرور ہیں۔ یہ عظیم تر اور ہمہ گیر عبادت یعنی ہر آن بندگی کے لیے انسان کو تیار کرتی ہیں اور اس کے لیے مدد فراہم کرتی ہیں۔ اس لیے کہ عبادت یعنی ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج اسی کام کے لیے مدد فراہم کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ احسان یہ ہے کہ تم اِس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرو' یا بالفاظِ دیگر اس کیفیت میں اللہ سے ڈرو' اس کی راہ میں جدّوجہد اور بھاگ دوڑ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہ اصل میں ایمان ویقین کی انتہائی کیفیت کا نام ہے۔ ایمان درحقیقت بِالْغَیْب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے تو نہیں ہے' البتہ ہمارے پاس ضرور

ہے۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ﴾ (قٓ) ''اور ہم انسان سے اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ لیکن غیب کا ایک پردہ حائل ہے۔ دراصل حدیث زیرِ مطالعہ میں ایمان کی شدّت اور اس کی ایک جہت (dimension) بیان ہو رہی ہے کہ ایمان کی گہرائی اتنی شدید ہو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: کَاَنَّکَ تَرَاہُ ''گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو''۔ اس لیے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ کو دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مکالمے کا شرف نصیب فرمایا تو انہوں نے مکالمے کے شرف سے ہمت پا کر استدعا کی: ﴿رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ﴾ (الاعراف: ۱۴۳) ''اے پروردگار! تو مجھ کو یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں (یعنی مجھے اپنا دیدار نصیب فرما)''۔ تو جواب ملا: ﴿لَنۡ تَرٰىنِیۡ﴾ ''تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے''۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بھی اختلاف ہے کہ آپؐ نے شبِ معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں۔ قرآن مجید میں تو یہی ہے کہ: ﴿لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی﴾ (النجم) ''اُس نے اپنے ربّ کی عظیم ترین آیات کا مشاہدہ کیا''۔ لیکن بہرحال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک رائے یہ موجود ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہے' البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ نہیں ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی جب پوچھا گیا کہ کیا رسول اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا؟ تو آپؓ نے بہت خوبصورت الفاظ میں فرمایا: نُوۡرٌ اَنّٰی یُرٰی؟ ''وہ تو نور ہے' اسے دیکھا کیسے جائے گا؟'' اس لیے کہ نور کے ذریعے سے تو آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں لیکن نور کو تو نہیں دیکھ سکتے! بہرحال کَاَنَّکَ تَرَاہُ سے مراد ہے اللہ پر' اس کے وجود اور اس کی حقیقت پر اس قدر یقین ہو جائے جس قدر کسی چیز کو آنکھوں سے دیکھنے سے یقین پیدا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے جو اگلے الفاظ ہیں: ((فَاِنۡ لَمۡ تَکُنۡ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ)) ''پس اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی) تو (کم از کم یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔ اس ٹکڑے کے دو مفہوم لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ پہلے ٹکڑے

کی وضاحت ہے کہ اگر چہ تم اللہ کو نہیں دیکھ پاتے لیکن وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ لیا گیا ہے کہ یہ احسان کا ادنیٰ درجہ ہے ورنہ اونچا درجہ تو یہی ہے کہ ایمان کے اندر اتنی شدت پیدا ہو جائے گویا تم اللہ کو فی الواقع اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ لیکن اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو اس سے کم تر درجے میں یہ یقین ہو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یعنی یہ استحضار ہو کہ میں ہر آن اللہ کی نگاہ میں ہوں' اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے کہا گیا: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (الطور:٤٨) ''پس (اے نبی ﷺ!) آپ یقیناً ہماری نگاہوں میں ہیں''۔ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ بندۂ مؤمن کے لیے یہ کیفیت کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے' بہت حوصلہ افزا اور پر مسرت ہوتی ہے۔ جب وہ کوئی نیک کام کر رہا ہوتا ہے' فی سبیل اللہ کوئی کام کر رہا ہوتا ہے' دین کی کوئی خدمت سرانجام دیتے ہوئے اس کے لیے بھوک پیاس برداشت کر رہا ہوتا ہے اور تکلیف جھیل رہا ہوتا ہے تو اُس وقت یہ احساس اس کے لیے اس قدر دلجوئی کا سامان فراہم کرتا ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے' میرا مالک جس کے لیے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں' وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ع ''مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی''۔ ہم تو ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹا بیٹھے اور انہیں پتا بھی نہیں چلا۔ نہیں' بلکہ میری ساری قربانیاں' محنتیں اور بھاگ دوڑ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

بہر حال کسی بندۂ مؤمن کے دل میں یہ یقین پیدا ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے' یہ بھی درجۂ احسان پر فائز ہونے کے لیے کافی ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی آگے ایمان ویقین میں یہ گہرائی پیدا ہو جائے کہ بندۂ مؤمن کو یہ احساس ہو کہ گویا وہ خود اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے تو یہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے اس قسم کی باتیں کہی گئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپؐ فجر کی نماز کے بعد تھوڑی دیر کے لیے مسجدِ نبویؐ میں تشریف رکھتے تھے اور صحابہ کرامؓ سے کچھ گفتگو ہوتی تھی۔ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو بیان کرتا تھا۔ اس کے علاوہ سوال و جواب بھی ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک صحابیؓ سے دریافت فرمایا: ((كَيْفَ

اَصْبَحْتَ؟)) ’’آج تمہیں کیسی صبح نصیب ہوئی ہے؟‘‘ تو اُن کا جواب بڑا غیر معمولی تھا: اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا ’’مجھے تو آج سچے مؤمن کی صبح نصیب ہوئی ہے‘‘۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ((فَمَا حَقِيْقَةُ اِيْمَانِكَ)) ’’تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟‘‘ یعنی تم جو کہہ رہے ہو کہ مجھے سچے مؤمن کی صبح نصیب ہوئی ہے تو اس کی کیا حقیقت اور کیفیت ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ’’كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى عَرْشِ رَبِّيْ بَارِزًا' وَكَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى اَهْلِ الْجَنَّةِ يَتَمَتَّعُوْنَ فِيْهَا وَاِلٰى اَهْلِ النَّارِ يُعَذَّبُوْنَ فِيْهَا‘‘ (۱) ’’(میرے یقین کی کیفیت یہ ہے) گویا میں اپنے ربّ کے عرش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں' اور گویا اہلِ جنت کو جنت کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہوئے اور اہلِ دوزخ کو دوزخ میں عذاب سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں‘‘۔ لہٰذا اگر اللہ کے لیے جدّوجہد اور بھاگ دوڑ کرتے ہوئے' اللہ سے ڈرتے ہوئے استحضار اللہ فی القلب یہ کی کیفیت پیدا ہو جائے اور عبادت میں حسن اور نکھار پیدا ہو جائے تو یہ درحقیقت ’’احسانِ اسلام‘‘ یا باصطلاحِ دیگر ’’سلوکِ محمدیؐ‘‘ ہے اور یہ دل میں یقین کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔

اب یوں سمجھئے کہ ہمارے سامنے تین درجے آ گئے۔ ایمان اگر صرف زبان پر آ جائے تو یہ ’’اسلام‘‘ ہے' اگر دل میں داخل ہو جائے تو یہ ’’ایمان‘‘ ہے اور اگر یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو ’’احسان‘‘ ہے۔ دل کی گہرائیوں کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ اس کی گہرائیاں بہت اتھاہ ہیں۔ اور جسے ہم ’’دل‘‘ کہتے ہیں ایک تو یہ گوشت کا لوتھڑا ہے جس کا کام ہے خون پمپ کرنا۔ یہ پھیپھڑوں کی طرف سے صاف شدہ خون لے کر پورے جسم کی طرف دھکیل دیتا ہے اور پورے جسم سے وہ خون لے کر جس کے اندر آلائشیں وغیرہ جمع ہو گئی ہوتی ہیں' پھیپھڑوں کی طرف دھکیل دیتا ہے' تاکہ وہاں اس کی صفائی ہو جائے۔ تو یہ دل جو گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' یہ محض پمپ کے سوا کچھ بھی نہیں

(۱) الاستقامة لابن تیمیه : ۱۹٤/۱ والایمان لابن ابی شیبة: ۱۱٤۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس طرح کی گفتگو حضرت حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ سے بھی ہوئی تھی اور حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی۔

ہے۔لیکن دین کے اعتبار سے‘ قرآن کے اعتبار سے یہ اصل میں روحِ انسانی کا مرکز اور محل ہے‘ اور رُوح کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست ہے۔لہٰذا آپ اس قلب کی گہرائی ناپ نہیں سکتے۔سلطان باہو نے بہت خوبصورت بات کہی ہے: ع ''دل دریا سمندروں ڈُونگھے‘ کون دلاں دیاں جانے ہُو!'' واقعۃً یہ دل دریاؤں اور سمندروں سے بھی زیادہ گہرا ہے۔اور جب ایمان اس گہرائی میں جاگزیں ہو جائے تو یہ احسان ہے۔احسان اس سے کوئی علیحدہ اور مصنوعی شے نہیں ہے۔ایمان کی ان کیفیتوں کا ذکر سورۃ الحجرات میں موجود ہے جس کا ہم اپنی اِن گفتگوؤں میں بار بار ذکر کرتے آئے ہیں۔فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۴)

''یہ بدّو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔(اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے تم ہرگز ایمان نہیں لائے‘ لیکن یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یہاں مثبت انداز میں اسلام کا ذکر آیا ہے اور پھر منفی انداز میں ایمان کا ذکر ہوا ہے۔اور اسی سورت کی آیت ۷ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحُجرٰت)

''مگر اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو نہایت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر خوشنما بنا دیا ہے۔''

یہ وہ کیفیت ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایمان کی گہرائی کے نتیجے میں حاصل ہو چکی تھی اور یہی احسان ہے۔

باقی یہ کہ ہمارے ہاں مروّجہ تصوّف کے زیر اثر جو کیفیات آئی ہیں اس کی کیا وجہ ہے اور ''احسانِ اسلام'' جسے ہم ''سلوکِ قرآنی'' یا ''سلوکِ محمدی'' بھی کہہ سکتے ہیں‘ اس میں اور تصوف میں کیا فرق ہے‘ یہ اس بحث کا موقع نہیں ہے۔اس موضوع پر ''مروّجہ

تصوّف یا سلوکِ محمدیؐ ‘یعنی احسانِ اسلام’‘ کے عنوان سے میرا ایک بہت اہم کتابچہ ہے۔ اس میں ذرا دقیق بحثیں بھی ہوئی ہیں۔ اس کا لفظ بلفظ مطالعہ مفید رہے گا۔ اور خاص طور پر اس کا جو انگریزی ترجمہ ہوا ہے:

"The Reality of Tasawwuf, in the Light of the Prophetic Model."

اس میں کچھ اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ دراصل ہمارے ہاں جدید تعلیم یافتہ اور مرفّہ الحال لوگوں کے اندر جب کبھی دین کی طرف رُجحان پیدا ہوتا ہے تو وہ تصوّف کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تو اِس حقیقت کو اُن پر منکشف کرنے کے لیے یہ انگریزی کتابچہ بہت اہم ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے لوگوں کو احسان کی تعلیم و تربیت دی‘ ان کا تزکیہ کیا اور اُن سے قربِ خداوندی کے مراحل طے کروائے! آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طور سے یہ کام کیا تھا اور ہمارے مروّجہ تصوف میں کیا شکل پیدا ہوگئی ہے اور کس طور سے ایک علیحدہ راستہ اختیار کر لیا گیا ہے‘ اس کا ایک خاص سبب ہے جسے بیان کرنے کا اِس وقت موقع نہیں ہے۔ یہاں جبریل علیہ السلام کے تیسرے سوال ’’احسان‘‘ کی بحث ختم ہوتی ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے چوتھا سوال کیا: اَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ! ’’اب مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے!‘‘ یعنی قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا: ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) ’’جس سے قیامت کے بارے میں پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا‘‘۔ آپ ﷺ نے صاف اعتراف کیا کہ میں اس بارے میں آپ سے زیادہ نہیں جانتا۔ قرآن مجید کے اندر بہت واضح طور پر فرمایا گیا ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا﴿۴۲﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا﴿۴۳﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا﴿۴۴﴾﴾ (النّٰزعٰت) ’’(اے نبیؐ!) یہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب لنگر انداز ہوگی۔ آپ کو کیا کام اس کے ذکر سے! اس کی پہنچ (اس کا علم) تو تیرے ربّ پر ختم ہے‘‘۔ یعنی آپؐ کا کام ہے محض خبردار کرنا کہ یہ لازماً آئے گی‘ اس کے لیے تیاری کر لو۔ لیکن یہ کب آئے گی‘ اس سے

آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔تو آپؐ نے اس کا جواب دینے سے معذرت کر لی۔

اب انہوں نے پانچواں سوال کیا: فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِھَا؟''تو مجھے اس کی علامات کے بارے میں بتا دیجیے (جس سے اندازہ ہو جائے کہ وہ زمانہ اب قریب آ گیا ہے)''۔ علاماتِ قیامت ایک مستقل موضوع ہے۔کتبِ احادیث میں اشراط الساعۃ اور علامات القیامۃ کے عنوان سے باقاعدہ ابواب باندھے گئے ہیں۔اس ضمن میں کچھ تو ابتدائی اور عمومی انداز کی اور چھوٹی علامات ہیں اور دس بڑی علامتیں ہیں۔ان میں دجال کا ظہور' حضرت مہدی کا ظہور' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول' دھوئیں کا معاملہ اور خسف کا تذکرہ ہے کہ زمین تین جگہ سے دھنس جائے گی' وغیرہ۔یہ مختلف اشراط الساعۃ ہیں۔اس سوال کے جواب میں آپؐ نے دو علامات کا ذکر فرمایا ہے جو ہمارے لیے بہت چشم کشا ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((اَنْ تَلِدَ الْاَمَۃُ رَبَّتَھَا))''کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی''۔ اس کے معانی یہ ہیں کہ ایک دَور آئے گا کہ اولاد میں اتنی سرکشی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے والدین کے اوپر گویا حاکم ہو جائیں گے۔والدین ڈریں گے کہ ان سے میں نے کچھ کہہ دیا تو نہ معلوم کیا جواب دیں۔یہ کیفیت آج ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے۔اور خاص طور پر یہ بات چونکا دینے والی ہے کہ آپؐ لڑکیوں کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ لونڈیوں کا سا سلوک کریں گی۔حالانکہ لڑکیوں کا معاملہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ والدین کی زیادہ تابع فرمان ہوتی ہیں' ان کے سامنے سر جھکا کر رکھتی ہیں اور خاص طور پر ماؤں کا زیادہ ادب اور اُن سے زیادہ محبت رکھتی ہیں۔لیکن آپؐ فرما رہے ہیں کہ بیٹیاں اپنی ماؤں کے ساتھ اپنی باندیوں کا سا سلوک کریں گی۔اور یہ کیفیت بھی آج رونما ہو چکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی دوسری علامت یہ بتائی: ((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ))''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پیر رہنے والے' ننگے بدن رہنے والے' انتہائی مفلس اور قلاش' بکریوں کے چرواہے اونچی

اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے''۔ یہ وہ چیز ہے جسے آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ پچاس ساٹھ سال پہلے کے عالمِ عرب میں اور آج کے عالمِ عرب میں جو تضاد (contrast) واقع ہو چکا ہے وہ بہت نمایاں نظر آ رہا ہے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ حج کے موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے قربانی کا جو حکم دیا ہے تو اس کی حکمت یہ بھی تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کو کھانے کو کچھ میسّر آ جائے۔ ورنہ عالمِ عرب تو قرآن کے الفاظ میں ''وَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ'' یعنی ایک غیر زرخیز وادی تھی جہاں کوئی پیداوار نہیں ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دُعا کی تھی: ﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ......﴾ (ابرٰهيم:٣٧) ''اے پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے......'' یعنی اب تو ہی ان کی غذا کا بندوبست کر۔ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ قربانیوں کے گوشت پر جھپٹ پڑتے تھے' کھینچ کر لے جاتے تھے اور سکھا کر پھر سال بھر کھاتے تھے۔ پھر یہ کہ انہی قربانیوں کی وجہ سے بھیڑیں اور بکریاں پال کر بیچتے تھے اور یہی ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہوتا تھا۔ تو عالمِ عرب کی یہ صورتِ حال تھی۔ لیکن اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہاں دولت کی ریل پیل ہے' ہر قسم کی سہولت میسّر ہے' بلکہ ان کے مشرقی ساحل پر یورپ کے شہروں کو بھی مات دینے والے شہر آباد ہو چکے ہیں۔

آگے رسول اللہ ﷺ جو فرما رہے ہیں: ((يَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْيَانِ)) تو اس میں لفظ ''يَتَطَاوَلُ'' کو سمجھ لیجیے! یہ باب ''تفاعل'' سے ہے جس کی یہ صفت ہے کہ اس میں مبالغے کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور مقابلے کا بھی۔ یعنی یہ عرب نہ صرف اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے بلکہ ان اونچی عمارتوں کے بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کریں گے۔ آج یہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے کہ ایک شخص نے اگر چالیس (۴۰) منزلہ عمارت بنائی ہے تو اس کے مقابلے میں دوسرا پینتالیس (۴۵) منزلہ عمارت بنائے گا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیثِ جبریلؑ میں ایک اور سوال بھی

ہے۔حضرت جبریل علیہ السلام سوال کر رہے ہیں : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَمَنْ اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ؟ ''اے اللہ کے رسولؐ! بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے' تنگ دست کون لوگ ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:((اَلْعَرَبُ)) ''وہ عرب ہوں گے''۔ چنانچہ حدیث میں یہ پیشین گوئی بھی موجود ہے کہ وہ عرب ہوں گے۔ ویسے تو دنیا میں اور جگہوں پر بھی ترقیاں ہوئی ہیں' افلاس کے بعد دولت کی ریل پیل ہوئی ہے' اونچی اونچی اور شاندار عمارتیں بنی ہیں' لیکن عالمِ عرب میں گزشتہ چند دہائیوں میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اِنَّمَا بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) (۱) ''میں اور قیامت اس طرح ہیں جیسے یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں''۔اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد اب کوئی اُمت نہیں۔ ((اَنَا آخِرُ الْمُرْسَلِيْنَ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ)) ''میں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو''۔اب تو گویا قیامت ہی آئے گی۔اور ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آپؐ کی بعثت اور قیامت زمانے کے اعتبار سے دونوں جڑے ہوئے ہیں۔یعنی آپؐ کی بعثت کے بعد سے قیامت میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔اس موضوع پر بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں۔جامعۃ الازہر کے عالم دین پروفیسر امین محمد جمال الدین کی کتاب ''عُمَرُ اُمَّةِ الْاِسْلَام'' کا اردو ترجمہ ''اُمتِ مُسلمہ کی عمر'' ہم نے بھی شائع کی ہے۔ حدیث زیر مطالعہ میں رسول اکرم ﷺ نے جو دو علاماتِ قیامت بتائی ہیں ان کے ظہور پذیر ہونے سے قیامت کا معاملہ اب بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔آج ہر شخص ان علامتوں کو بچشمِ سر دیکھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حدیثِ جبریلؑ کو ہمارے لیے علم وحکمت کا ذریعہ بنا دے اور اِن باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کھاتین۔ وصحیح مسلم' کتاب الجمعة' باب تخفیف الصلاة والخطبة۔

حدیث

43

حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ

٦ جولائی ٢٠٠٧ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ' درود شریف اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا:

گزشتہ پانچ نشستوں میں ''حدیثِ جبریلؑ'' کا مطالعہ مکمل کر لینے کے بعد ترتیب کے اعتبار سے تو ہمیں آج کی نشست میں اربعینِ نوویؒ کی تیسری حدیث کا مطالعہ کرنا تھا' لیکن میں نے اس مجموعے میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی جس حدیث (حدیث نمبر ۴۳) کا اضافہ کیا ہے' آج آپ کو پہلے اس کا مطالعہ کرا رہا ہوں۔ اس لیے کہ حدیثِ جبریلؑ کے ساتھ اس حدیث کو بہت زیادہ مشابہت حاصل ہے۔ ایک تو اِس کے مشمولات (contents) کے اعتبار سے مشابہت ہے کہ دین کی حکمت کیا ہے' دین بحیثیت کُل کیا ہے' اس کے اجزاء کیا ہیں اور اس کے مراحل و مراتب اور منازل کیا ہیں۔ بلکہ اس لحاظ سے یہ میرے نزدیک بعض اعتبارات سے حدیثِ جبریلؑ سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے۔ دوسرے یہ حدیث جبریلؑ کے contents کے علاوہ اس کے اسلوب سے بھی مشابہت رکھتی ہے۔ حدیث جبرئیلؑ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل کا ایک واقعہ ایسی تفصیلات کے ساتھ اور اِس انداز میں بیان ہوا کہ گویا ہماری نگاہوں کے سامنے وہ نقشہ آ گیا' اور تھوڑی دیر کے لیے ہمیں یہ لذت محسوس ہوئی کہ ہم خود بھی اسی ماحول اور اسی مجلس کا حصہ ہیں۔ اسی طرح اس حدیث کے واقعاتی انداز اور پس منظر کے بیان میں اس سے بھی کہیں بڑھ کر کیفیت حاصل ہو رہی ہے۔ ان دونوں حدیثوں کے مابین ایک اور مشابہت بھی ہے' اور وہ یہ کہ یہ دونوں حدیثیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دُنیوی کے

آخری دَور کی ہیں۔ آج کی نشست میں ہم اس حدیث کے ترجمے اور چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں' جبکہ اس کے اندر جو دو اہم مضامین بیان ہوئے ہیں اُن پر تفصیلی گفتگو اِن شاءاللہ آئندہ ہوگی۔

اس حدیث مبارکہ کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کی شخصیت کا اجمالی تعارف یہ ہے کہ آپؓ ایک انصاری صحابی ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا ایک بہت اونچا مقام ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض صحابہؓ کے لیے مدح کے الفاظ افعل التفضیل کے صیغے میں ارشاد فرمائے ہیں' ان میں ایک نام حضرت معاذ بن جبلؓ کا بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَرْحَمُ اُمَّتِیْ بِاُمَّتِیْ اَبُوْبَکْرٍ' وَاَشَدُّھُمْ فِیْ اَمْرِ اللّٰہِ عُمَرُ' وَاَصْدَقُھُمْ حَیَاءً عُثْمَانُ' وَاَقْضَاھُمْ عَلِیُّ ابْنُ اَبِیْ طَالِبٍ ...... وَاَعْلَمُھُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ......))(۱)

''میری اُمت میں سے ان کے حق میں سب سے زیادہ رحیم وشفیق ابوبکرؓ ہیں' اللہ کے (دین کے) معاملے میں ان میں سب سے زیادہ سخت اور شدید عمرؓ ہیں' ان میں سب سے زیادہ باحیا انسان عثمانؓ ہیں' سب سے زیادہ صائب الرائے (صحیح فیصلے تک پہنچنے والے) علیؓ بن ابی طالب ہیں...... اور ان میں حلال اور حرام کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے معاذ بن جبلؓ ہیں......''

درحقیقت ان کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تھا تو اُس وقت ان کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو مکالمہ ہوا تھا وہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ بہرحال میں نے اُن کی شخصیت کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے تاکہ آپ کے سامنے یہ عظیم حقیقت واضح ہو جائے کہ اتنی بلند پایہ شخصیت کو کیا چیز مسلسل پریشان کر رہی تھی' جس کے بارے میں اس حدیث میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا' اور اس کے برعکس ہماری پریشانی کا سبب کون سی چیزیں ہیں۔

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب مناقب معاذ بن جبل وزید بن ثابت وابی بن کعب۔ وسنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب فضائل خباب۔

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ بِالنَّاسِ قَبْلَ غَزْوَةِ تَبُوْكَ ''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ غزوۂ تبوک سے قبل لوگوں کو لے کر نکلے''۔ یعنی تبوک کی طرف جاتے ہوئے سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا۔ فَلَمَّا اَنْ اَصْبَحَ ''تو جب صبح ہوگئی'' (یعنی فجر طلوع ہوگئی)۔ اس جملے کے پیچھے یہ چیز پوشیدہ ہے کہ اس طرح کا سفر رات کے وقت کیا جاتا تھا' اس لیے کہ دن میں صحرا کا سفر شدید گرمی اور دھوپ کی تمازت کی وجہ سے تقریباً ناممکن تھا۔ جبکہ رات کے وقت چونکہ دھوپ نہیں ہوتی تھی' بلکہ خنکی ہوتی تھی' لہٰذا جتنا بھی فاصلہ رات کو طے ہوجاتا تھا وہ غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غزوۂ تبوک کا سفر بھی رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رات کو ہی کیا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ آگے فرما رہے ہیں: صَلّٰى بِالنَّاسِ صَلَاةَ الصُّبْحِ ''تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی''۔ یعنی آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو فجر کی نماز پڑھائی۔ ثُمَّ اِنَّ النَّاسَ رَكِبُوْا ''پھر لوگ دوبارہ سوار ہوگئے''۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی چونکہ سورج کے نکلنے اور دھوپ کے تیز ہونے میں کچھ وقت باقی تھا' موسم ابھی ٹھنڈا تھا' لہٰذا فیصلہ ہوا کہ اس ٹھنڈے موسم میں جتنا سفر طے ہوجائے وہ غنیمت ہے' جبکہ تمازت زیادہ ہوجانے کی صورت میں سفر ممکن نہیں رہے گا اور سورج ڈھلنے تک کہیں نہ کہیں آرام کرنا پڑے گا۔

فَلَمَّا اَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ نَعَسَ النَّاسُ فِيْ اَثَرِ الدُّلْجَةِ ''تو جب سورج طلوع ہوگیا تو لوگ شب بیداری کے اثرات کے تحت اونگھنے لگے''۔ ہر شخص کو اِس کیفیت کا تجربہ ہے کہ صبح کے وقت جو نسیم سحر چلتی ہے وہ تو گویا باقاعدہ تھپکیاں دے دے کر سلاتی ہے' اور اگر رات جاگ کر گزاری ہو تو نیند کا غلبہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کو یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے اس طبعی تقاضے کا مقابلہ کرتے ہوئے مسجد میں فجر کی نماز پڑھ کر اپنے مصلے پر بیٹھا اللہ کا ذکر کرتا رہے اور جب سورج پوری طرح طلوع ہوجائے تو دو رکعت نماز ادا کرے اور پھر اپنے گھر جائے۔ اس کی بہت زیادہ فضیلت بتائی گئی ہے۔ وَلَزِمَ مُعَاذٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتْلُوْ اَثَرَهٗ ''اور حضرت معاذؓ

نے اپنے لیے لازم ٹھہرا لیا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے کو"۔ آپ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے آپؐ کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ آپؐ ان سے کہیں الگ نہ ہو جائیں۔ وَالنَّاسُ تَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ عَلٰى جَوَادِ الطَّرِيْقِ "اور اکثر لوگوں کا حال یہ ہو گیا کہ ان کی سواریاں انہیں لے کر راستے کی پوری چوڑائی میں پھیل گئیں"۔ راستے کی کوئی حدود تو متعین نہیں تھیں کہ دونوں اطراف میں کوئی باڑ لگی ہو اور بس ان کے اندر ہی سواریوں نے چلنا ہو۔ بلکہ یہ صحرا کا نقشہ ہے۔ اِدھر اُدھر پہاڑ ہیں اور درمیان میں کشادہ وادی ہے جس کے اندر اونٹنیاں اپنے سواروں کو لے کر آزادانہ چل رہی ہیں اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئی ہیں۔ تَأْكُلُ وَتَسِيْرُ "وہ اونٹنیاں کچھ کھاتی بھی ہیں اور کچھ چلتی بھی ہیں"۔ زمین پر کوئی چارہ ہے تو وہ کھا رہی ہیں یا کوئی کیکر وغیرہ کا درخت ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مقصد کے لیے لمبی گردن دے رکھی ہے' وہ ان درختوں کے پتے اور کانٹے کھا رہی ہیں۔ اور سوار چونکہ اونگھ رہے ہیں' ان کا اونٹنیوں پر کنٹرول تو ہے نہیں لہٰذا ان کو آزادی حاصل ہے۔

فَبَيْنَمَا مُعَاذٌ عَلٰى أَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ "پس اسی دوران میں کہ حضرت معاذؓ اللہ کے رسول ﷺ کے نقش قدم کی پیروی کر رہے تھے"۔ اپنی اونٹنی کو آپ ﷺ کی اونٹنی کے قریب رکھ رہے تھے۔ وَنَاقَتُهٗ تَأْكُلُ مَرَّةً وَتَسِيْرُ أُخْرٰى "جبکہ ان کی اونٹنی کبھی کچھ کھانے لگ جاتی اور کبھی چلنے لگ جاتی"۔ یعنی کبھی رک کر کہیں کچھ چر چگ لیتی اور پھر چل پڑتی۔ عَثَرَتْ نَاقَةُ مُعَاذٍ "اچانک حضرت معاذؓ کی اونٹنی نے (کسی چیز سے) ٹھوکر کھائی"۔ فَكَبَحَهَا بِالزِّمَامِ فَهَبَّتْ "پس انہوں نے اس کی لگام کھینچی (اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی) تو وہ بدک گئی"۔ حَتّٰى نَفَرَتْ مِنْهَا نَاقَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ "یہاں تک کہ اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی"۔ چونکہ دونوں اونٹنیاں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں تو جب حضرت معاذ کی اونٹنی بدکی تو آپ ﷺ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ ثُمَّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَشَفَ عَنْهُ قِنَاعَهٗ "اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے اوپر سے پردہ ہٹایا"۔ اونٹنی کے اُوپر ہودج کسا ہوا تھا جس کے اندر آپ ﷺ

استراحت فرما رہے تھے۔لیکن جب آپ کی اونٹنی بدکی تو آپؐ نے اپنے ہودج کا پردہ ہٹایا۔فَالْتَفَتَ فَاِذَا لَیْسَ مِنَ الْجَیْشِ رَجُلٌ اَدْنٰی اِلَیْهِ مِنْ مُعَاذٍ ''تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ پورے لشکر میں سے حضرت معاذؓ سے زیادہ کوئی بھی آپ ﷺ سے قریب نہیں ہے''۔ پورا لشکر منتشر ہو گیا تھا۔سواریاں اپنے سواروں کو لے کر تمام راستے کی وسعت میں پھیلی ہوئی تھیں۔آپ ﷺ نے دیکھا کہ معاذ قریب ہیں۔ فَنَادَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: ((یَا مُعَاذُ)) ''تو آپ ﷺ نے انہیں پکار کر ارشاد فرمایا: اے معاذ!'' قَالَ لَبَّیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ ''انہوں نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں حاضر ہوں''۔ قَالَ: ((اُدْنُ دُوْنَكَ)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: اور قریب آ جاؤ''۔فَدَنَا مِنْهُ ''تو حضرت معاذؓ (اپنی اونٹنی کو لے کر) آپؐ کے اور قریب ہو گئے''۔ حَتّٰی لَصِقَتْ رَاحِلَتُهُمَا اِحْدَاهُمَا بِالْاُخْرٰی ''یہاں تک کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسری کے ساتھ مَس کرنے لگیں''۔ یعنی حضور ﷺ کی اونٹنی اور حضرت معاذؓ کی اونٹنی ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کھا رہی تھیں۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((مَا كُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا كَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے تو یہ گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ لوگ ہم سے اتنے فاصلے پر ہوں گے!''

اس جملے کے پیچھے ایک حقیقت مخفی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی مسلمانوں کے مابین ایک خاص حیثیت ہے۔آپؐ اللہ کے نبی و رسول ہیں' مسلمانوں کے سپہ سالار ہیں۔ آپؐ کو اکیلا چھوڑ دینا حکمت اور مصلحت کے سراسر خلاف تھا۔ہر وقت آپ ﷺ کے ساتھ پہرا ہونا چاہیے تھا' تا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آ سکے۔اور اسی سفر سے واپسی پر ایسا ایک واقعہ پیش آیا بھی ہے۔تبوک سے واپسی پر ایک روز عین دوپہر کے وقت' جبکہ دھوپ تیز ہو گئی تھی' سارا لشکر اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گیا۔ جسے جہاں کوئی سایہ نظر آیا وہ وہاں چلا گیا' تا کہ قیلولہ کر لے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ایک درخت کے سائے میں استراحت فرمانے لگے اور اپنی تلوار اُس درخت کی ٹہنی کے ساتھ لٹکا دی۔آپ ﷺ لیٹے ہوئے تھے اور آپؐ کے آس پاس کوئی نہ تھا۔اتنے میں ایک کافر کا وہاں سے گزر ہوا۔اس نے

اس موقع کو غنیمت جانا اور آپ ﷺ ہی کی تلوار نیام سے نکال لی۔ آپ ﷺ کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ کافر تلوار سونتے سر پر کھڑا ہے۔ اُس نے کہا: اے محمدؐ! اب مجھے بتاؤ تمہیں کون مجھ سے بچا سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَللّٰہُ)) ''مجھے اللہ تعالیٰ بچا سکتا ہے''۔ یعنی اگرچہ حالات میرے لیے بالکل ناموافق ہیں' میں لیٹا ہوا ہوں اور تم کھڑے ہو' میں غیر مسلح ہوں جبکہ تمہارے ہاتھ میں تلوار ہے۔ بظاہر حالات و واقعات اور مادی اسباب سارے تمہارے ہاتھ میں ہیں' لیکن اصل مسبّبُ الاسباب تو اللہ ہے۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اللہ کا لفظ ایسے نکلا کہ اس کافر پر کپکپی طاری ہو گئی اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ آپ ﷺ نے تلوار اٹھالی اور فرمایا: ''اب تم بتاؤ تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا: كَرِيْمٌ وَابْنُ كَرِيْمٍ ''آپ تو ایک نہایت شریف انسان ہیں اور ایک نہایت شریف انسان کے بیٹے ہیں''۔ یہ گویا انتہائی خوشامد کے کلمات تھے جو اُس کافر اور مشرک نے کہے۔ کَرِیْم کا لفظ عربی زبان میں بہت اونچا مقام رکھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت ہی صاحبِ مروّت' صاحبِ شرافت اور بہت ہی سخی شخص۔ اسی سے پھر افعل التفضیل کا صیغہ ہے اَکْرَم۔ اسی لیے ہم آنحضور ﷺ کو ''نبی اکرم'' بھی کہتے ہیں۔ بہر حال آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تم جاؤ' لیکن ایک وعدہ کرو کہ مسلمانوں کے خلاف کبھی جنگ میں شریک نہیں ہو گے۔ آپ ﷺ نے اسے یہ نہیں کہا کہ ایمان لاؤ' کیونکہ یہ تو ایک جبری ایمان ہو جاتا اور دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس کافر نے کہا میں وعدہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں کبھی شریک نہیں ہوں گا اور جا کر لوگوں سے کہا: جِئْتُكُمْ مِنْ اَكْرَمِ النَّاسِ ''میں اِس وقت تمہارے پاس شریف ترین انسان کے پاس سے آ رہا ہوں''۔

میں نے ضمناً یہ واقعہ اس لیے بیان کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے کیوں حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ: ((مَا كُنْتُ اَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا كَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ)) ''میں تو یہ نہیں گمان کر سکتا تھا کہ لوگ ہم سے اتنے فاصلے پر ہوں گے''۔ اب یہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جو بات کہی اِس میں ہمارے لیے ایک

سبق ہے۔ اگر ظرف میں کمی ہوتو یہ وقت ہوتا ہے اپنے لیڈر کے سامنے دوسروں کے مقابلے میں اپنی ترجیح قائم کرنے کا یا بالفاظِ دیگر نمبر بنانے کا۔ ہم میں سے کوئی ہوتا تو ایسے موقع پر یہی کہتا کہ حضور! لوگوں کو احساس ہی نہیں ہے' کچھ خیال ہی نہیں ہے' لوگ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں گویا خود بخود اپنی بڑائی آ جاتی ہے کہ دیکھئے میں تو بالکل آپ ﷺ کے ساتھ ہوں' میں نے اپنے آپ کو آپ ﷺ کے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ لیکن یہاں عام آدمی نہیں' بلکہ حضرت معاذ بن جبلؓ ہیں جو دوسروں کی طرف سے معذرت پیش کر رہے ہیں۔ فَقَالَ مُعَاذٌ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ نَعَسَ النَّاسُ فَتَفَرَّقَتْ بِھِمْ رِکَابُھُمْ تَرْتَعُ وَتَسِیرُ'' تو حضرت معاذؓ نے کہا: اے اللہ کے نبیؐ! لوگ اونگھ رہے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سواریاں انہیں لے کر متفرق ہوگئی ہیں' کچھ چر چگ بھی رہی ہیں اور کچھ چل بھی رہی ہیں''۔ یعنی صبح کے وقت اونگھنے کی وجہ سے لوگوں پر جو غفلت طاری ہوگئی ہے اس وجہ سے وہ غیر ارادی طور پر آپ ﷺ سے دور چلے گئے ہیں۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((وَاَنَا کُنْتُ نَاعِسًا)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں خود بھی اونگھ رہا تھا''۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو کوئی سپر ہیومن' مافوق الفطرت انسان کے طور پر پیش نہیں کیا' بلکہ فرمایا کہ میں خود بھی اونگھ رہا تھا۔ یہ نوٹ کرنے کا خاص اور بہت اہم مقام ہے۔ اس میں سب کی طرف سے وہ معذرت بھی قبول ہوگئی جو حضرت معاذؓ نے پیش کی اور آپؐ نے اپنی بات بھی بتا دی کہ ٹھیک ہے یہ بشری تقاضے ہیں' جو میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں دو انتہائیں ہیں۔ ایک انتہا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو امتیازی شان ہے اس کو بڑھاتے بڑھاتے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے برابر بلکہ اُس سے بھی اونچا مقام دے دیا گیا۔ اور ایک انتہا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شان کو (معاذ اللہ) گھٹاتے گھٹاتے اپنے جیسا انسان سمجھ لیا گیا۔ بلاشبہ قرآن مجید میں یہ الفاظ تو آئے ہیں کہ: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ......﴾ (حٰمٓ السجدۃ:٦) ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک بشر ہوں......'' چنانچہ ایک اعتبار سے تو آپ

ہماری ہی طرح کے بشر تھے' اسی گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے' اسی طرح کا خون آپ کے جسم میں دوڑ رہا تھا' آپ ﷺ کو اگر زخم لگا ہے تو جسم سے خون نکلا ہے' آپ ﷺ کو بھوک بھی لگتی تھی اور پیاس بھی۔ تو معلوم ہوا کہ جو عام بشری تقاضے ہیں یہ سب آپ کے ساتھ تھے' لیکن ساتھ ہی آپ ﷺ خود فرماتے ہیں: ((اَیُّکُمْ مِثْلِیْ)) ''تم میں سے کون ہے مجھ جیسا؟'' رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ''صومِ وصال'' سے منع کیا تھا۔ صومِ وصال یہ ہے کہ جو روزہ رکھا وہ شام کو افطار نہیں کیا' بلکہ وہی روزہ رات بھر آگے چلتا رہا۔ پھر اگلا دن بھی روزے کی حالت میں گزرا اور اگلے دن شام کو روزہ افطار کیا۔ تو یہ دو دن کا ''صومِ وصال'' ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود تو دو دن کا' بلکہ کبھی کبھی تین دن کا صومِ وصال بھی رکھتے تھے' لیکن صحابہؓ کو سختی سے منع کرتے تھے۔ تو کسی نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ حضور! آپ خود تو صومِ وصال رکھتے ہیں اور ہمیں روکتے ہیں؟ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ' اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِ))(۱) ''تم میں سے کون ہے مجھ جیسا؟ میں تو اس حال میں اپنی رات گزارتا ہوں کہ میرا ربّ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے''۔ تو ہمیں اِن دو انتہاؤں کے مابین رہنا ہوگا۔ آپ ﷺ بشر تو ہیں' لیکن ہر لحاظ سے ہم جیسے بشر نہیں ہیں۔ اور یہ کہ آپ ﷺ اپنی تمام تر جلالت شان کے باوجود اللہ کے بندے ہی ہیں' اللہ کے برابر ہرگز نہیں ہیں! جیسے کسی عارف باللہ نے کہا:

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی
وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ

''بندہ تو بندہ ہی رہتا ہے چاہے کتنی بلندی پر چلا جائے (ساتویں آسمان پر پہنچ جائے) اور ربّ تو ربّ ہی رہتا ہے چاہے کتنا نزول فرمالے (آسمانِ دنیا پر آجائے)۔''

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

بہرحال﴿اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ ''میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں'' یہ بھی ایک حقیقت ہے اور: ((اَيُّكُمْ مِثْلِيْ)) ''کون ہے تم میں میرے جیسا؟'' یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ اس حدیث میں آپ ﷺ اپنی طبع بشری کا تقاضا بیان کر رہے ہیں کہ: ((وَاَنَا كُنْتُ نَاعِسًا)) ''میں خود بھی اونگھ رہا تھا''۔

فَلَمَّا رَاٰى مُعَاذٌ بُشْرٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِلَيْهِ وَخَلْوَتَهٗ لَهٗ ''پس جب حضرت معاذؓ نے دیکھا کہ اس وقت حضور اُن سے خوش ہیں اور ان کے لیے موقع بھی تنہائی کا ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ تیس ہزار کے لشکر میں سے ایک ہی شخص آپ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے تو انہیں دیکھ کر آپ کو خوشی ہوئی ہوگی اور اُن کے لیے آپؐ کے قلب مبارک میں یقیناً محبت کا ایک عنصر پیدا ہوا ہوگا۔ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِيْ اَسْأَلُكَ عَنْ كَلِمَةٍ قَدْ اَمْرَضَتْنِيْ وَاَسْقَمَتْنِيْ وَاَحْزَنَتْنِيْ ''آپؓ نے (موقع کو غنیمت جانتے ہوئے) کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپؐ سے ایسی بات پوچھوں جس نے مجھے مریض بنا کر رکھ دیا ہے' مجھے بیمار کر دیا ہے اور مجھے شدید رنج و غم سے دوچار کر دیا ہے''۔ میں اس کی فکر میں گھلا جا رہا ہوں۔ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ: ((سَلْنِيْ عَمَّ شِئْتَ)) ''تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے پوچھو جو بھی تم چاہو''۔ اب اُس وقت چونکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں بشاشت تھی' دریائے سخاوت جوش میں تھا' تو آپ ﷺ نے انہیں گویا کھلا لائسنس دے دیا کہ جو چاہو پوچھ لو۔ اب ہم یہاں اپنا اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا موازنہ کر لیں کہ آپؓ کس چیز کی فکر میں گھلے جا رہے تھے' بیمار اور غمزدہ ہو رہے تھے' جبکہ ہماری پریشانیوں اور تفکرات کا محور کیا ہے!

فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيَ الْجَنَّةَ لَا اَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ غَيْرَهَا ''اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے وہ عمل بتا دیجیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے' اس کے سوا میں آپؐ سے اور کوئی بات نہیں پوچھوں گا''۔ آپؓ صحابیٔ رسول ہیں' بلکہ فقہاءِ صحابہؓ میں ان کا شمار ہے' نبی اکرم ﷺ سے انہیں ((اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ)) کی سند بھی مل چکی ہے' مگر پھر بھی وہ یہ گارنٹی نہیں سمجھتے کہ میں تو جلیل القدر صحابیٔ رسول ہوں لہٰذا میری

جنت تو پکی ہے۔ بلکہ انہیں بھی یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ کیسے جنت کے حق دار بنیں۔ وہ بھی محاسبۂ اُخروی اوراُخروی قانونِ مجازات سے بے خوف نہیں ہیں۔ جبکہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں تو محاسبۂ اُخروی کی فکر ہی نہیں ہیں۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ بس سیدھے جنت میں جائیں گے۔

قَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ ﷺ: ((بَخٍ بَخٍ' لَقَدْ سَاَلْتَ بِعَظِیْمٍ' لَقَدْ سَاَلْتَ بِعَظِیْمٍ [ثَلَاثًا])) ''اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: بہت خوب' بہت خوب۔تم نے بہت عظیم بات پوچھی' تم نے بہت عظیم بات پوچھی [یہ بات آپ ﷺ نے تین بار دہرائی]''۔آپؐ نے حضرت معاذؓ کی تحسین فرماتے ہوئے تین بار فرمایا کہ تم نے بہت عظیم بات کے بارے میں سوال کیا ہے۔اس لیے کہ جس شخص کو آخرت کی فکر دامن گیر ہو جائے تو اس کی دُنیوی پریشانیاں اور تفکّرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ ......))(۱)

''جس شخص نے اپنے تمام تفکّرات کو ایک ہی فکر کے اندر گم کر دیا' یعنی آخرت کی فکر کے اندر' تو دنیا کے سارے تفکّرات کے ضمن میں اللہ اسے کفایت کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ اس کے سارے مسائل حل کر دے گا۔ یعنی تم اللہ کے بن جاؤ تو اللہ تمہارا بن جائے گا۔ جب اللہ تمہارا بن جائے گا تو پھر تمہیں کسی چیز کی فکر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اللہ کے بنو تو سہی!

رسول اللہ ﷺ آگے فرما رہے ہیں: ((وَاِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَيْرَ)) ''اور یہ بات آسان ہے اُس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خیر کا ارادہ کر لیا ہو''۔ یعنی اے معاذ! اگر تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے اور تمہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی ہے تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے گویا تمہارے لیے سند ہے کہ اُس نے تمہارے لیے خیر کا ارادہ فرمایا ہے۔ فَلَمْ يُحَدِّثْهُ بِشَیْءٍ اِلَّا قَالَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حِرْصًا

(۱) مشکوٰۃ المصابیح' کتاب العلم' الفصل الثالث' بحوالہ ابن ماجہ والبیہقی۔

لِکَیْمَا یُتْقِنَہٗ عَنْہُ ''تو آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ سے کوئی بات نہیں فرمائی مگر یہ کہ اسے تین مرتبہ دہرایا' اس خواہش کے تحت کہ وہ اسے اچھی طرح یاد کر لیں''۔ آپ ﷺ نے ہر بات کو تین تین بار دہرایا تا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ذریعے آپ ﷺ کی بات جوں کی توں لوگوں تک پہنچ جائے اور اس کا ایک لفظ بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔

اب یہاں رسول اللہ ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سوال کا جو جواب دے رہے ہیں تو اس ایک جملے میں کُل دین کی جامع تعبیر آ گئی ہے۔ آگے چل کر آپ ﷺ نے اسی دین کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بیان فرمایا ہے۔ اس طرح اس حدیث کی حدیث جبریلؑ کے ساتھ ایک اور مشابہت بھی بن رہی ہے' اس لیے کہ وہاں بھی تین چیزوں اسلام' ایمان اور احسان پر زور دیا گیا ہے۔ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَتُقِیْمُ الصَّلَاۃَ وَتَعْبُدُ اللّٰہَ وَحْدَہٗ لَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا حَتّٰی تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰی ذٰلِکَ)) ''تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! تم پختہ ایمان رکھو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر' اور نماز قائم کرو اور اکیلے اللہ کی بندگی اور پرستش کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوئے' یہاں تک کہ اسی حالت میں تم کو موت آ جائے''۔ یعنی یہ تین کام کرنے سے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

نوٹ کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلی بات جو فرمائی ہے وہ ایمان کی ہے' اسلام کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام تو نقطۂ آغاز ہے' جبکہ اصل شے تو ایمان ہے۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ)) ''تم پختہ ایمان رکھو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر''۔ دوسری بات فرمائی: ((وَتُقِیْمُ الصَّلَاۃَ)) ''اور نماز قائم کرو''۔ اللہ پر ایمان کو تازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ تیسری بات فرمائی: ((وَتَعْبُدُ اللّٰہَ وَحْدَہٗ لَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا)) ''اور اکیلے اللہ کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتے ہوئے''۔

یہاں لفظ ''عبادت'' اور ''شرک'' آئے ہیں۔ عبادت کا مفہوم صرف نماز روزہ تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس پر تفصیلی گفتگوئیں ہوتی رہی ہیں کہ عبادتِ الٰہی کا مطلب ہے انتہائی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ کی ہمہ وقت' ہمہ جہت اور کامل اطاعت

وفرماں برداری کرنا۔ دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت ہو۔ جیسے فرمایا گیا:﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة:١٦٥) ''اور جو لوگ (سچے) مؤمن ہیں ان کو شدید محبت ہے اللہ سے''۔ عبادت کے لیے فارسی کا ایک لفظ ہے ''بندگی'' اور ایک ہے ''پرستش''۔ ان دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت بنے گی۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ:﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں''۔ تو یہاں عبادت سے مراد محض عبادات یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ بھی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شامل ہیں مگر عبادتِ الٰہی صرف انہی چیزوں تک محدود نہیں ہے۔

یہاں عبادت کے بعد دوسرا لفظ ''شرک'' آیا ہے کہ: ((لَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا)) ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ''۔ یہاں بھی نوٹ کیجیے کہ شرک بھی صرف بُت پرستی کا شرک نہیں ہے کہ بت پرستی چھوڑ دو تو شرک ختم ہو گیا' بلکہ نفس پرستی بھی تو بہت بڑا شرک ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:﴿اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثیة:٢٣) ''(اے نبی ﷺ!) کیا آپ نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟'' تو خواہشِ نفس بھی تو معبود ہو جاتی ہے۔ اگرچہ نفس کی نماز تو کوئی نہیں پڑھتا مگر نفس کی اطاعت تو کر رہے ہیں! اندر سے نفس کا جو تقاضا ابھرتا ہے تو یہ دیکھے بغیر کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے' شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز ہے' بسروچشم اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تو گویا نفس انسان کا معبود بن گیا۔ اسی طرح مال کی محبت میں اس درجے سرشار ہو جانا کہ اس کے حصول میں حلال اور حرام کی تمیز ختم ہو جائے' تو یہ مال کی بندگی ہے اور ایک درجے کا شرک ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ)) (١)

''ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہو گیا) دینار و درہم کا بندہ۔''

تو یہاں بھی آپ ﷺ ''عبد'' کا لفظ لائے ہیں کہ کہنے کو تو تم اللہ کے بندے بنے پھرتے

(١) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔

ہو جبکہ حقیقت میں تم مال کے بندے ہو۔ دیکھئے ہندو لکشمی دیوی کی پوجا کرتا ہے کہ وہ اسے مال عطا کردے' جبکہ ہم براہِ راست مال کے پجاری ہیں۔ہم نے صرف لکشمی دیوی کو درمیان میں سے ہٹایا ہے' باقی ہمارا اور ہندوؤں کا اصل معبود تو مال ہی ہے۔ لکشمی دیوی تو درمیان میں محض واسطہ ہے۔تو شرک محض بُت پرستی کا نام نہیں ہے' بلکہ شرک اور بھی بہت سے ہیں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ایک عرصہ قبل ''حقیقت واقسامِ شرک'' کے موضوع پر ایک ایک گھنٹے کی چھ تقاریر کی تھیں[(۱)] کہ شرک عقیدے کا بھی ہے' عمل کا بھی ہے اور شرک انفرادی بھی ہے' اجتماعی بھی ہے۔آج کا سب سے بڑا شرک اجتماعی شرک یعنی انسانی حاکمیت (Human Sovereignty) ہے۔اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا کہ ''اَلْمَلِكُ'' تو صرف اللہ ہے لیکن یہاں انسان خود خدا بن کر بیٹھ گیا ہے۔بقول اقبال: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

مادہ پرستی بھی بہت بڑا شرک ہے۔آج انسان کا سارا توکّل اللہ کی ذات کے بجائے اسباب و وسائل پر ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:﴿......اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ۝۲﴾(بنی اسراءیل) ''......کہ میرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز نہ سمجھ بیٹھنا''۔اسی طرح ریاکاری کو شرکِ خفی قرار دیا گیا ہے۔فرمانِ نبویؐ ہے:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ))[(۲)]

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے

(۱) محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی یہ چھ تقاریر کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ضروری ایڈیٹنگ کے بعد پہلے ماہنامہ میثاق میں فروری ۲۰۰۶ء سے جولائی ۲۰۰۶ء کے دوران ''حقیقت واقسامِ شرک'' کے عنوان سے شائع ہوئیں اور اب اسی عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے افراد اِن سے بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۲) مسند احمد۔

لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ دیا وہ شرک کر چکا۔''

عربی زبان میں فعل ماضی پر ''قَدْ'' آجائے تو یہ ماضی قریب یا present perfect tense کا معنی دیتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ''میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں'' تو اس میں ایک شبہ ہے کہ وہ یہ کام کر سکے گا یا نہیں' لیکن اگر وہ یہ کہے کہ ''میں یہ کام کر چکا ہوں'' تو اس میں تو اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس حدیث میں تین مرتبہ ''فَقَدْ اَشْرَكَ'' فرمایا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ بات بڑی باریک بینی سے واضح فرما دی ہے کہ دکھاوے کی خاطر نماز پڑھنے والا' روزہ رکھنے والا اور صدقہ کرنے والا بلا شک وشبہ شرک میں مبتلا ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم نماز پڑھ رہے ہو اور تم دیکھو کہ کوئی شخص تمہیں دیکھ رہا ہے لہٰذا تم سجدہ طویل کر دو تو تمہارا یہ عمل شرک شمار ہوگا۔ اس لیے کہ عام حالات میں اگر تمہارا سجدہ تین سیکنڈ کا ہو رہا تھا اور اب پانچ سیکنڈ کا ہو گیا ہے تو یہ مزید دو سیکنڈ کا سجدہ کس کے لیے ہے؟ اب اس ایک سجدے کے گویا دو مسجود ہو گئے' ایک اللہ تعالیٰ اور دوسرا وہ شخص جسے دکھایا جا رہا ہے۔ تو ایمان اور بندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا اور شرک کی تمام کیفیتوں سے بچنا' یہ ہے ایک جملے میں نجات کا نسخہ: ((تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا)) ۔

آگے فرمایا: ((حَتّٰى تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ)) ''یہاں تک کہ اسی حالت میں تمہاری موت واقع ہو جائے''۔ یعنی اگر تمہارا اللہ اور یومِ آخرت پر پختہ ایمان ہے' اور تم اللہ کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے تمام لوازمات کے ساتھ نماز ادا کرتے رہو' صحیح معنوں میں اللہ کی بندگی کرو اور شرک کی تمام حالتوں اور کیفیات سے مجتنب رہو اور زندگی بھر تمہاری یہی کیفیت رہے' شیطان یا تمہارا اپنا نفس تمہیں کوئی اڑنگا نہ لگا دے کہ تم منہ کے بل گر جاؤ' تو تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ اربعین نوویؒ کی حدیث نمبر ۴ جو اِن شاء اللہ ہمارے زیر مطالعہ آئے گی' اس میں اصل مضمون یہی ہے کہ ایک شخص ساری عمر اچھے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے' لیکن موت کے قریب آ کر

اچانک ایسا پلٹا کھاتا ہے کہ سب کیا کرایا غارت چلا جاتا ہے اور جہنم اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص ساری عمر برے کام کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم کے قریب پہنچ جاتا ہے' لیکن آخری ایام میں ایسے عمل کرتا ہے کہ جنت میں چلا جاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ یہاں فرما رہے ہیں: ((حَتّٰی تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰی ذٰلِکَ)) ''یہاں تک کہ اسی کیفیت میں تم پر موت آ جائے۔''

فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَعِدْلِیْ' فَاَعَادَهَا لَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ''حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا حضور! ذرا مجھے دوبارہ یہ بات فرما دیجیے' تو آپ ﷺ نے ان کے لیے یہ بات تین بار دہرائی''۔ ثُمَّ قَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ یَا مُعَاذُ)) ''پھر اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں بتاؤں......'' اب یہاں دیکھیے کہ دریائے سخاوت جوش میں آیا ہوا ہے اور آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ اے معاذ! اگر تم چاہو تو میں تمہیں مزید کچھ بھی بتاؤں۔ اور وہ کیا ہے: ((بِرَاْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ)) ''اس دین کی جڑ اور بلندترین چوٹی کے بارے میں (کہ دین کی جڑ اور چوٹی کیا ہے)''۔ اب یہاں سے حکمت دین کا موضوع شروع ہو رہا ہے کہ دین کے اجزاء کون کون سے ہیں۔

فَقَالَ بِاَبِیْ وَاُمِّیْ اَنْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِیْ ''تو حضرت معاذ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبیؐ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مجھے ضرور بتائیے!'' انہیں اور کیا چاہیے تھا۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ ان کو بونس مل رہا ہے کہ جو کچھ پوچھا تھا اس سے آگے کی بات سامنے آ رہی ہے۔ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ رَاْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) ''تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: یقیناً دین کی جڑ یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود نہیں سوائے تنہا اللہ تعالیٰ کے جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ ایمان کی بات نہیں ہوئی' بلکہ شہادت کی بات ہوئی ہے جو اسلام کی جڑ ہے۔ آگے فرمایا: ((وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلَاةِ وَاِیْتَاءُ الزَّکَاةِ)) ''اور اس دین کو قائم

رکھنے والی اور اس کی شیرازہ بندی کرنے والی چیز ہے نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا''۔((وَاَنَّ ذِرْوَۃَ السَّنَامِ مِنْہُ الْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))''اور اس کی بلند ترین چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ گویا یہ ایک درخت ہے جس کی جڑ ہے شہادت۔ اور اس کا تنا' جس کے اوپر یہ درخت کھڑا ہے' وہ ہے نماز کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اور اس کی چوٹی ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے دین کو ایک درخت کی مثال سے تین حصوں میں تقسیم کر کے واضح فرما دیا۔ قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک درخت کی مثال بیان فرمائی ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ﴿۲۴﴾﴾(ابرٰھیم) ''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے دیکھا نہیں کیسے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی ایک پاکیزہ کلمے کی جیسے ایک پاکیزہ درخت ہو جس کی جڑ (زمین میں) مضبوطی سے قائم ہوتی ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہوتی ہیں؟''

اب اس جہاد کے ضمن میں ایک خاص بات جو سامنے آ رہی ہے وہ مشکلات الحدیث میں سے ہے۔ قرآن وحدیث کے بعض مضامین جو مشکل ہیں' جن کا افہام وتفہیم آسان نہیں ہے اور عام لوگوں نے ان کو سمجھنے میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں' ان میں سے ایک مقام یہ بھی ہے۔ آپ ﷺ فرما رہے ہیں: ((وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ)) ''اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ وہ نماز قائم کریں' زکوٰۃ ادا کریں اور گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ)) ''پس جب وہ یہ کام کر گزریں تو وہ محفوظ ہو گئے' اور انہوں نے اپنی جانیں اور مال محفوظ کر لیے سوائے شریعت کے حق کے (یعنی سوائے اس کے کہ ان پر کوئی شرعی حق واقع ہو جائے) اور اُن کا حساب اللہ عزیز وجلیل

کے سپرد ہے''۔ یعنی مسلمان ہونے کے لیے تو یہ چیزیں کافی ہیں' یعنی نماز' زکوٰۃ اور شہادتین' اس سے امان حاصل ہو جائے گی' لیکن اگر کسی پر کوئی شرعی حد قائم ہو جائے تو وہ نافذ ہوگی' مثلاً چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا' غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے گا' وغیرہ۔

یہاں یہ اہم بات نوٹ کر لیجیے کہ لوگوں سے جنگ کرنے کا متذکرہ بالا حکم عام حکم نہیں ہے' بلکہ یہ خاص مشرکین عرب کا معاملہ تھا۔ اس ضمن میں سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات کو سمجھنے میں بھی اکثر لوگوں کو بہت مغالطہ ہوا ہے۔ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل مقامات میں سے ہے' جس کو بہت کم لوگوں نے صحیح طور پر سمجھا ہے اور اس سے غیروں کو اعتراض کرنے کا موقع ملا ہے۔ ان آیات میں جو حکم وارد ہوا ہے کہ ایمان لاؤ' یا پھر قتل کر دیے جاؤ گے' تو دشمنوں نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اسلام تو تلوار کے ذریعے سے پھیلا ہے۔ حالانکہ یہ خاص بنی اسماعیل یعنی اُمیین کے لیے حکم تھا جن کی طرف رسول اللہ ﷺ کی اصل بعثت ہوئی تھی' کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ اللہ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک خاص سنّت رہی ہے کہ جس قوم کی طرف معیّن طور پر کسی رسول کو بھیج دیا جاتا اور وہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے اتمامِ حجت کر دیتے' لیکن پھر بھی وہ قوم ایمان نہ لاتی تو وہ ہلاک کر دی جاتی۔ قرآن مجید کے اندر ایسی قوموں کے حالات و واقعات موجود ہیں۔ قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون' یہ سب قومیں اسی قانون کے تحت ہلاک کی گئیں۔ سورۃ التوبۃ کی اِن آیات میں بھی معین طور پر بنی اسماعیل کے لیے حکم نازل ہوا کہ تمہیں چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے' اس کے اندر ایمان لے آؤ' ورنہ تمہارا قتل عام ہوگا۔ اگرچہ بالفعل اس کی نوبت نہیں آئی' اس لیے کہ زیادہ تر لوگ ایمان لے آئے اور باقی عرب کو چھوڑ کر چلے گئے۔ تو اِس حدیث میں جو بات بیان ہو رہی ہے وہ عام نہیں ہے' بلکہ اسی خاص پس منظر میں بیان ہو رہی ہے اور یہ حکم اُمیّین عرب کے لیے معیّن ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اُمیّین عرب کے لیے خاص تھی اور باقی اہلِ عالَم کے لیے عام تھی۔ از روئے

الفاظِ قرآنی:

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ......﴾ (الجمعۃ:۲)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اُمیین میں ایک رسول خود انہی میں سے......''

آگے جو رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں: ((وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) ''اور اُن کا حساب اللہ عزیز وجلیل کے ذمہ ہے'' تو اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دل سے ایمان لا رہا ہے یا یونہی جان بچانے کے لیے ایمان لا رہا ہے یہ اللہ جانے اور وہ جانے' میرے ہاں اس کا اسلام قبول کر لیا جائے گا۔ اور ہم یہ بات تفصیلاً جان چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے اسلام یا اپنے ایمان کا زبان سے اقرار کر رہا ہے' چاہے اس کے دل میں جو کچھ بھی ہو' تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جان بچانے یا اسلامی ریاست میں حقوق حاصل کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہے' بلکہ وہ قانونی طور پر مسلمان ہے اور اس کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو ایک سچے اور پکے مسلمان کے ہیں۔

اس حدیث پر گفتگو آئندہ نشست میں جاری رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم اور تفقہ عطا فرمائے اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

حکمتِ دین کا ایک عظیم خزانہ (۲)

۱۳ اور ۲۰ جولائی ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
(الصّف)

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصّف)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ (الانفال:۳۹)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبة)

ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

گزشتہ نشست میں ہم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث کا مطالعہ شروع کیا تھا۔ بعض اعتبارات سے اس حدیث کا جو اہم ترین حصہ ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ اس پر ہماری گفتگو کا صرف آغاز ہوا تھا۔ آج ہمیں اِن شاء اللہ العزیز اس

گفتگو کی تکمیل کرنی ہے۔ پہلے ہم حدیث کے آخری حصے کا ترجمہ مکمل کرتے ہیں۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ مَا شَحَبَ وَجْهٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْهِ دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ بَعْدَ الصَّلٰوةِ الْمَفْرُوْضَةِ كَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) ''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا (اور تکان کی وجہ سے نڈھال نہیں ہوا) اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا' کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر''۔ فرض نماز سب سے اونچا عمل ہے اور اس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ چوٹی کا عمل ہے۔ ہمارے دین میں مختلف عبادات و اعمال کے اندر جو اصل نسبت و تناسب ہے وہ ہمیں پیش نظر رکھنا چاہیے کہ فرائض کا کیا درجہ ہے' جہاد فی سبیل اللہ کا کیا مقام ہے' دین کی دعوت و تبلیغ' درس و تدریس اور تعلّم و تعلیم قرآن کا کیا درجہ ہے اور تہجد و دیگر نفل نمازیں ادا کرنا اور رات کا زیادہ تر حصہ اللہ کی عبادت اور ذکر و اذکار میں گزارنا' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔

((وَلَا ثَقَّلَ مِیْزَانَ عَبْدٍ كَدَابَّةٍ تُنْفَقُ لَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) ''اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا جس پر اُس نے راہِ خدا میں سواری کی''۔ جنگوں کے دوران تیر وغیرہ صرف انسانوں کو ہی نہیں لگتے تھے بلکہ حیوانوں کو بھی لگتے تھے اور وہ بھی زخمی یا ہلاک ہوتے تھے۔ تو فرمایا جا رہا ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ جنگ کے دوران جو جانور استعمال کر رہا ہوتا ہے' اس کا ثواب بھی اللہ کے ہاں اُس مجاہد کے اعمال نامے اور میزانِ عمل کو بہت وزنی بنا دیتا ہے۔ آج کل تو خیر جنگوں میں گھوڑوں اور تیروں کا استعمال کم ہی ہوتا ہے اور ان کی جگہ جدید اسلحہ نے لے لی ہے۔

اب آیئے اس حدیث مبارکہ کے اہم ترین موضوع ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی طرف جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرما رہے ہیں: ((وَاَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) ''اور یقیناً دین کے اونچے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا

عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔ یہ وہ بات ہے جو ہمارے ذہنوں سے بالکل اوجھل ہو گئی ہے۔ ایک تو اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو اسلام کے پانچ ارکان بتائے ہیں ان میں ''جہاد'' کا ذکر ہی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِیْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ))

(متفق علیه)

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

تو ہم نے اس حدیث مبارکہ پر اکتفا کر لیا' جبکہ اس میں جہاد کا ذکر ہی نہیں۔ پھر یہ کہ جہاد کو قتال کے معنی میں لے کر ہم نے اسے ایک تو بہت زیادہ محدود کر دیا ہے اور دوسرے اس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ غلط فہمیاں صرف دشمنوں کی پیدا کی ہوئی اور پھیلائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اپنوں نے بھی پیدا کی ہیں جو زیادہ بنیادی ہیں اور انہی کی بنا پر دشمنوں کو جہاد کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔(۱)

درحقیقت جہاد فی نفسہٖ ایک طویل عمل ہے اور اس کو میں ایک سہ منزلہ عمارت سے تعبیر کرتا ہوں' جس کی ہر منزل کے مزید تین حصے ہیں۔ اس تعبیر کے حوالے سے گویا تین بڑے بڑے جہاد ہیں' اور ہر ایک کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا جہاد ہے اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کرنا۔ اس کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس امارہ کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ ہمارے دین میں اسے ''افضل الجہاد'' کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) ''کہ تم اللہ کی فرماں

(۱) ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے موضوع پر میرا ایک مفصل خطاب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کا مطالعہ کیجیے اور اسے عام کیجیے' ان شاء اللہ کافی حد تک غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

برداری میں اپنے نفس کے خلاف جہاد کرو"۔ یعنی اسے اللہ کا مطیع بناؤ۔ دوسرے یہ کہ شیطانِ لعین اور اس کے چیلے چانٹوں کے خلاف جہاد کرنا۔ اس کے چیلے چانٹے جنات میں سے بھی ہیں جو غیر مرئی (invisible) ہیں' نظر نہیں آتے اور انسانوں میں سے بھی ہیں جو شیطان کے بھی کان کترتے ہیں۔ تیسرے نمبر پر ہے بگڑے ہوئے معاشرے کے خلاف جہاد۔ یہ بگڑا ہوا معاشرہ آپ کو برائی کی طرف دھکیلتا ہے۔ اس معاشرے کے دباؤ کو جھیلتے ہوئے اس کے خلاف جنگ کرو۔ خود اس کی رو میں نہ بہہ جاؤ بلکہ اس کا رُخ موڑ دو۔ ان تینوں عناصر کے خلاف جہاد کریں گے تب ہی اللہ کے دین کو اپنے اوپر نافذ کر سکیں گے اور اپنے آپ کو اللہ کا بندہ بنا سکیں گے۔

دوسرا بڑا جہاد ہے اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ۔ اس کے لیے جان و مال کھپے گا اور وقت لگے گا۔ سب سے پہلے دین کو خود سمجھیں گے تب ہی دوسروں کو سمجھا سکیں گے۔ یہ ایک طویل المیعاد مرحلہ (long life process) ہے۔ اس کی بھی پھر آگے تین سطحیں ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ (النحل:۱۲۵) "(اے نبیؐ!) بلایئے اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ' اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان کے ساتھ مجادلہ کیجیے بھلے طریقے سے"۔ ایک ہے سوسائٹی کی بلند ترین سطح یعنی معاشرے کے فہیم عناصر (intellectuals) کو دعوت و تبلیغ۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہاں صرف وعظ و نصیحت سے کام نہیں چل سکتا' بلکہ دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے قرآن اپنے مخالفین سے دلیل طلب کرتا ہے کہ: ﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴿۱۱۱﴾﴾ (البقرۃ) "(اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو"۔ تو ایسے ہی دوسروں کو بھی حق ہے کہ آپ سے یہی مطالبہ کریں۔ تو اس کے لیے تو ضروری ہے کہ انسان دین کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں اُتر چکا ہو اور جدید زمانے کے جو غلط نظریات ہیں ان کی تہہ میں اتر کر انہیں سمجھ چکا ہو' اس کے بغیر تو یہ کام ممکن نہیں۔ دعوت و تبلیغ کی دوسری سطح ہے عوام الناس۔ یہاں محض اچھی وعظ و نصیحت کام کر جائے گی۔

آپ ان سے خلوص کے ساتھ بات کریں گے تو یہ مان جائیں گے۔ چونکہ عام لوگوں کے ذہن صاف تختی کی مانند ہوتے ہیں لہٰذا آپ جو چاہیں لکھ دیں۔ ان کے دماغوں میں خناس نہیں ہوتا' غلط فلسفے نہیں بھرے ہوتے۔ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ بقول ''از دل خیزد بر دل ریزد''۔ البتہ یہ کہ آپ کا عمل آپ کی دعوت و تبلیغ کی شہادت دے رہا ہو۔ مخاطب یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ شخص مجھ سے جو بات کہہ رہا ہے اُس پر خود بھی عمل کر رہا ہے۔

تیسری سطح پر وہ لوگ آتے ہیں جو خود تو گمراہ ہیں ہی' دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے انہیں باقاعدہ تنخواہیں ملتی ہیں' چاہے وہ قادیانی مبلغ ہوں' عیسائی مبلغ ہوں' بابی ہوں' چاہے کوئی اور ہوں۔ ان سے مناظرہ کرنا ہوگا اور اس کے لیے بہت ماہر ہونا پڑے گا۔ اس کی ایک تازہ مثال شیخ احمد دیدات مرحوم ہیں اور زندہ مثال ڈاکٹر ذاکر نائیک ہیں۔ اور ایک زمانے میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے جنہوں نے پادری فنڈر کو شکست دی تھی جو پھر دم دبا کر بھاگا تھا' ورنہ شاید پورے ہندوستان کے مسلمان عیسائی ہو جاتے۔ اس لیے کہ اس نے کلکتہ سے دہلی تک ہر بڑے شہر میں علماء سے مناظرہ کیا اور انہیں ہر جگہ شکست دی۔ پھر دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس نے کھلا چیلنج کیا کہ مسلمانو! میں کلکتہ سے چل کر یہاں آیا ہوں اور میں نے ہر شہر میں تمہارے مولویوں اور علماء کو شکست دی ہے اور اب میں پورے مسلم انڈیا کو کھلا چیلنج کر رہا ہوں۔ اس موقع پر اگر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ میدان میں آ کر اُس کو نہ ہراتے تو منظر نامہ بدل سکتا تھا۔ اب یہاں دیکھئے کہ علماء نے شکستیں کیوں کھائیں؟ اس لیے کہ انہوں نے کبھی بائبل پڑھی ہی نہیں تھی۔ اور بائبل پڑھنا تو دور کی بات ہے' قرآن مجید بھی صحیح طرح سے نہیں پڑھا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ہاں تو فقہ چلتی تھی۔ انہوں نے صرف فتویٰ دینا ہوتا تھا اور فتویٰ دینے کے لیے فقہ کا علم کافی ہوتا ہے' جبکہ فقہ کا زیادہ مواد حدیث سے ہوتا ہے' قرآن سے تو کم ہے۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ان کا اشتغال اتنا نہیں تھا جتنا کہ ہونا چاہیے۔ جبکہ عیسائی مبلغین تو بہت سے علوم پڑھ کر اور سمجھ کر آتے تھے اور عربی و فارسی کے ماہر ہوتے تھے۔

تیسرا بڑا جہاد ہے اقامتِ دین کی جدّوجہد۔ اس میں پہلا مرحلہ ہے دعوت دیتے رہنا۔ یعنی بس تبلیغ کرتے رہو۔ تمہیں کوئی مارے تو سہہ لو اور جوابی کارروائی نہ کرو۔ بارہ برس تک مکہ مکرمہ میں یہی حکم تھا کہ ﴿ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ ﴾ ''اپنے ہاتھ بندھے رکھو!'' جدید اصطلاح میں اسے کہیں گے Passive Resistance (صبر محض)۔ دوسرا مرحلہ یا دوسرا جہاد ہے Active Resistance (اقدام)۔ یعنی اب پورے نظام کو چیلنج کرو۔ اورآخری مرحلہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ کے اندر آ جاؤ' یہ قتال فی سبیل اللہ ہے' جو جہاد کی نویں اور بلند ترین منزل ہے۔ تو جہاد و قتال کے درمیان فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اب دیکھئے جہاد و قتال کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد ہے اللہ کے دین کو غالب کرنا' محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ﴾ (الصف:۹) ''وہی ہے (اللہ تعالیٰ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو 'الہدیٰ' اور 'دینِ حق' دے کر تا کہ اسے تمام کے تمام دین پر غالب کر دے''۔ اس نظام کے نیچے چاہے کوئی یہودی رہے' کوئی عیسائی رہے' کوئی ہندو رہے اور چاہے کوئی مجوسی رہے' لیکن نظام اللہ کا ہو گا اور ان کو چھوٹا ہو کر رہنا ہو گا۔ سورۃ الصّف کی دو آیات ملاحظہ کیجیے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝١٠ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝١١ ﴾

''اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں بتاؤں وہ تجارت (وہ کاروبار) جو تمہیں دردناک عذاب (یعنی جہنم) سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ جہاد کے بغیر جہنم سے چھٹکارا پانے کا خیال ایک اُمیدِ موہوم ہے' یہ محض ایک بے بنیاد تمنا (wishful thinking) ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ جہاد کے بغیر تو نجات ہے ہی نہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نفس کے خلاف تو چوبیس

گھنٹے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ بندۂ مؤمن کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ جہاد نہ ہو رہا ہو۔ مثلاً ایک شخص نے عین فجر کے وقت اذان کی آواز سن لی' آنکھ بھی کھل گئی' لیکن نفس نے کہا ذرا سو جاؤ۔ پس اس نے کروٹ لی' نیند آئی اور نماز چھوٹ گئی' جبکہ ایک بندۂ مؤمن ایسے موقع پر اپنے نفس کے خلاف ڈٹ جاتا ہے' جہاد کرتا ہے اور اٹھ کر باجماعت نماز ادا کر لیتا ہے' اور خاص طور پر شدید سردی کے موسم میں جبکہ وضو کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ پس ایک بندۂ مؤمن برابر جہاد کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر تو نجات ہی نہیں۔

بہرحال دین کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اسی سورۃ الصف کی آیت ۴ میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝۴﴾

''یقیناً اللہ کو محبوب تو وہ بندے ہیں جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

یعنی یکجا ہو کر' صفیں باندھ کر اور دلیری کے ساتھ میدانِ جنگ میں اترتے ہیں تاکہ دشمن ان کی صفوں میں کوئی رخنہ نہ ڈال سکے۔ اس طریقے سے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا قتال فی سبیل اللہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جب یہ مرحلہ شروع ہو گیا تو فرمایا گیا کہ دیکھنا کہیں درمیان میں نہ رک جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا سانس پھول جائے اور تمہاری ہمتیں جواب دے جائیں' بلکہ فرمایا گیا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال: ۳۹) ''اور ان کے خلاف جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ وفساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کا ہو جائے''۔ سب سے بڑا فتنہ وفساد یہ ہے کہ انسان (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے' خود حاکم بن کر بیٹھ جائے۔ آج کے دَور کا سیکولرزم اور عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کا تصور سب سے بڑی بغاوت اور سب سے بڑا شرک ہے۔ ہمارے ہاں اپنے آپ کو بڑے بڑے موحّدین کہلوانے والے یہ نہیں جانتے کہ آج کے دَور کا

اصل شرک کیا ہے۔ آج بت پرستی کا شرک تقریباً معدوم ہو چکا ہے۔ ہندوؤں میں بھی نچلے درجے کے لوگ ہیں جو مندروں میں جا کر گھٹنے ٹیکتے ہیں اور بتوں کی ڈنڈوت کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہندوؤں میں سے کوئی ایسا نہیں کرتا۔ آج کل عیسائیوں میں سے بھی بہت کم ہیں جو چرچ میں جاتے ہوں گے۔ امریکہ میں تو پھر بھی کچھ ہیں' یورپ وغیرہ میں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہر حال آج کے دَور کے اصل شرک کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔

قتال فی سبیل اللہ' جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل اور چوٹی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ دین کل کا کل اللہ کا ہو جائے' سارا نظام اللہ کے تابع ہو جائے' چاہے وہ سیاسی نظام ہو' معاشی نظام ہو' معاشرتی نظام ہو اور چاہے وہ دیوانی قانون ہو' فوجداری قانون ہو اور عائلی قوانین ہوں۔ ہر شے اللہ کے دین کے تابع ہو جائے۔ اور یہ قتال جاری رہے گا جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو جائے۔

حدیث زیرِ درس کا جو دوسرا اہم موضوع ہے اور قرآن مجید میں بھی جس کا حکم ہے کہ اب مشرکینِ عرب کا قتل عام کر دیا جائے' اس کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ اس قتال فی سبیل اللہ کی آخری شکل ہے' جس کو جدید جنگی اصطلاح میں کہا جاتا ہے: ''Mopping up operation''۔ یعنی بحیثیتِ مجموعی فتح حاصل ہو جانے کے بعد اب چھان بین کی جائے کہ ابھی کوئی مزاحمت باقی تو نہیں ہے۔ اور یہ آپریشن جیسا کہ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں' خاص اُمیین عرب یعنی مشرکین عرب کے لیے تھا' کسی اور کے لیے نہیں تھا۔ اور اُن کے لیے صرف دو متبادل راستے تھے کہ یا تو ایمان لے آؤ یا شہر چھوڑ کر چلے جاؤ' ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس لیے کہ حضرت محمد ﷺ خاص اُمیین عرب میں سے تھے' اور آپؐ نے انہی کی زبان میں اُن پر اتمامِ حجت کر دیا تھا' اللہ تعالیٰ نے انہی کی زبان میں اپنی کتاب قرآن حکیم نازل کر دی تھی' لہٰذا ان کے لیے اب کوئی عذر باقی نہیں تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا کہ ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے' البتہ شہر چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ لیکن باقی دنیا کے لیے یہ حکم نہیں تھا۔ جب اُمیینِ عرب کے لیے یہ اعلان ہو رہا تھا اور سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات نازل ہو رہی تھیں تو وہاں یہودی بھی موجود تھے'

مگران کے لیے یہ حکم نہیں تھا کہ تم یا تو ایمان لے آؤ' ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ ان کے لیے حکم ان الفاظ میں نازل ہوا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴿٢٩﴾﴾ (التوبۃ)

''جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے اُن لوگوں کے خلاف جو اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے' یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

دوسری اقوام کے لیے ہمیشہ ہمیش کے لیے تین صورتیں ہیں' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فوجیں جہاں بھی گئی ہیں انہوں نے یہی تین شکلیں سامنے رکھی ہیں کہ ایمان لے آؤ تو تم ہمارے برابر کے بھائی ہو جاؤ گے' ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ ہمارے حقوق زیادہ ہیں اور تمہارے کم' بلکہ ''اَلْمُسْلِمُ كُفُوٌ لِكُلِّ مُسْلِمٍ'' کا اصول لاگو ہوگا۔ تمہارے اور ہمارے سیاسی' دستوری اور قانونی حقوق برابر ہوں گے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتے تو دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے دین کا غلبہ برداشت کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کرو اور چھوٹے بن کر رہو۔ اس صورت میں تم چاہے یہودی بن کر رہو' نصرانی بن کر رہو' اور چاہے ہندو' سکھ' پارسی' مجوسی وغیرہ بن کر رہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہارے سینیگاگز' چرچز' معبدوں اور مندروں کی حفاظت کی جائے گی۔ تمہیں پرسنل لاء کی پوری آزادی دی جائے گی۔ اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے تمہارے لیے کاروبار اور ملازمت کرنے کی اجازت ہوگی۔ ہر چیز کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ غالب دین اللہ کا ہوگا۔ یہاں یہ بھی جان لیجیے کہ اُمیین عرب کے لیے الفاظ تو انتہائی سخت تھے کہ:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا

الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ﴾ (التوبۃ:۵)

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی تم انہیں پاؤ' اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص کے قتل کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اکثر اُمیّین یعنی بنی اسماعیل ایمان لے آئے اور جو ایمان نہیں لائے وہ جزیرہ نمائے عرب کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی اپنے باپ کی طرح اپنی ہٹ کا پکّا تھا۔ اُس نے کہا میں تو ایمان نہیں لاؤں گا۔ لہٰذا وہ حبشہ کی طرف ہجرت کے ارادے سے بحری جہاز میں سوار ہوگیا۔ جیسے کبھی مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ بحیرۂ قلزم میں طوفان کی وجہ سے جہاز ہچکولے لینے لگا تو عکرمہ بن ابوجہل اور دوسرے سب مشرکین نے اللہ کو پکارا کہ اے اللہ! ہمیں اس مصیبت سے نکال لے۔ عین اُس وقت اُس نے سوچا کہ ہم اس برے وقت میں لات' منات' عزیٰ' ہبل وغیرہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کو پکار رہے ہیں تو گویا ہماری فطرت میں اور دلوں میں تو اللہ ہی ہے اور یہ اللہ کے بندے محمد (ﷺ) بھی اسی اللہ ہی کی دعوت تو دے رہے ہیں! تو بھاگ کر کہاں جانا؟ لہٰذا وہ وہیں سے واپس لوٹ کر اسلام لے آئے اور صادق الایمان ثابت ہوئے۔ مسیلمہ کذّاب کے خلاف جہاد کیا اور دیگر کئی معرکوں میں شریک ہوئے اور شہادت کا بلند رتبہ حاصل کیا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بھی ہے کہ پاکستان میں چترال کے ساتھ ایک علاقہ ''کافرستان'' ہے اور اس کے ساتھ ملتا ہوا افغانستان کا ایک علاقہ ''نورستان'' ہے۔ نورستان کے ایک شیخ جو مہدویت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ مہدی ہم میں سے ہی ہوں گے' بیان کرتے ہیں کہ ہم نورستان کے رہنے والے بھی قرشی ہیں اور کافرستان کے رہنے والے بھی قرشی ہیں۔ ہمارے آباء و اَجداد عرب سے اُس وقت نکلے تھے جب سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں اعلان ہوا تھا کہ مشرکین عرب کے لیے چار مہینے کی

مہلت ہے‘ اس میں ایمان لے آئیں ورنہ قتل کیے جائیں گے‘ یا پھر عرب کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ لوگ عرب کو چھوڑ کر بھاگے۔ لیکن جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ بڑھتا گیا اور مسلمان علاقے فتح کرتے کرتے ایران تک پہنچ گئے تو یہ لوگ بھی آگے بڑھتے بڑھتے اِن پہاڑی علاقوں تک پہنچ گئے اور یہ علاقہ کافرستان کہلانے لگا۔ جب افغانستان کی بنیاد پڑی تو یہ لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ ہندوستان میں رہ گیا‘ جو اَب پاکستان میں ہے‘ اور ایک حصہ افغانستان میں چلا گیا‘ جس کا نام بدل کر نورستان رکھ دیا گیا۔ ہندوستان میں تو انگریزوں نے انہیں کچھ نہیں کہا اور یہ کافر ہی رہے‘ مگر افغانستان میں والیٔ کابل امیر دوست محمد خان نے انہیں الٹی میٹم دے دیا کہ ایمان لاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ چنانچہ یہ لوگ ایمان لے آئے۔ ان کی معاشرتی رسومات ابھی تک مشرکینِ مکّہ سے ملتی جلتی ہیں۔

آیت مذکورہ میں جو فرمایا جا رہا ہے کہ ”پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو“ تو یہ وہی بات ہے جو حدیث زیرِ درس میں آ رہی ہے کہ:

((وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلَاۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ))

”مجھے اِس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ جاری رکھوں یہاں تک کہ لوگ نماز قائم کریں‘ زکوٰۃ ادا کریں اور اس بات کی شہادت دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ‘ جو تنہا ہے‘ اس کا کوئی شریک نہیں۔ جب وہ یہ باتیں کر لیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا‘ مگر ہاں جو شریعت کی زد میں آ جائے‘ اور اس کے بعد اُن کا حساب اللہ بزرگ و برتر کے سپرد ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا‘ حالانکہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی رائے دے

رہے تھے کہ فی الحال اندرونِ ملک عرب حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذا ان کے خلاف محاذ نہ کھولا جائے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ کا انکار صرف اس شکل میں کیا تھا کہ ہم زکوٰۃ آپ کو نہیں جمع کروائیں گے' بلکہ اپنے طور پر تقسیم کریں گے' مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جہاد کیا اور سرخرو ہوئے۔ اسی طرح آپؓ نے مسیلمہ کذّاب اور دوسرے جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف جہاد کیا' اس لیے کہ وہ مرتد ہوگئے تھے اور واجب القتل تھے۔

اب یہاں دیکھئے کہ اِس قتال فی سبیل اللہ کا مقام کیا ہے۔ حدیث زیرِ مطالعہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا شَحَبَ وَجْہٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْہِ دَرَجَاتُ الْجَنَّۃِ بَعْدَ الصَّلَاۃِ الْمَفْرُوْضَۃِ کَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا ثَقَّلَ مِیْزَانَ عَبْدٍ کَدَابَّۃٍ تُنْفَقُ لَہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

''اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا' کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجاتِ جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر' اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا جس پر اُس نے راہِ خدا میں سواری کی۔''

چنانچہ دینِ اسلام میں سب سے اونچا مقام قتال فی سبیل اللہ اور بالآخر اللہ کی راہ میں جان دے دینا ہے' جس کی شدید تمنا اور آرزو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں موجزن تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنی اس خواہش کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ' ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب تمنی الشھادۃ' وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

''میری بڑی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں۔''

بعد کے زمانوں میں ہمارے ہاں اس کی جگہ کچھ دوسری چیزوں نے لے لی۔ یعنی اللّٰہ' اللّٰہ کی ضربیں' مراقبے' چلّے اور ان کے ذریعے کچھ روحانیت حاصل کرنا۔ اس سے قتال فی سبیل اللہ اور بالآخر اللہ کی راہ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دینا سب پس منظر میں چلے گئے اور نتیجتاً ہم مغلوب ہوتے چلے گئے۔ ایک مرتبہ خلافت راشدہ کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد دوبارہ آج تک خلافت کا نظام قائم نہیں ہو سکا۔ بس اتنا ہوا کہ دو یا سوا دو سال کے لیے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دورِ مبارک میں اس کی ایک جھلک سی ظاہر ہوئی' اور وہ بھی ایک شخصی سی بات تھی۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کو اچانک حکومت مل گئی تھی۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی جہاد نہیں کیا تھا' کوئی جماعت نہیں بنائی تھی' جہاد فی سبیل اللہ کے مراحل میں سے نہیں گزرے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ صحابی نہیں ہیں' تابعی ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نواسے ہیں۔ بہرحال اس کے بعد آج تک خلافت کا نظام دوبارہ نہیں آیا' اس لیے کہ ترجیحات بدل گئیں۔ روحانیت کے نام سے ایک اور ہی تصور ذہنوں میں راسخ ہو گیا۔ صوفیائے کرام اور بڑے بڑے اولیائے عظام رحمہم اللہ علیہم کے بارے میں قصے مشہور ہیں کہ انہوں نے چالیس چالیس برس تک جنگلوں میں رہ کر ریاضت کی۔ واللہ اعلم! ایک امام فقیہہؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس برس تک عشاء کے وضو کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اب معلوم نہیں یہ روایت صحیح ہے یا غلط ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث تو یہ ہے کہ میں رات کو سوتا بھی ہوں اور کھڑا رہ کر عبادت بھی کرتا ہوں۔ آپؐ کی سنت تو یہ ہے۔

اس روحانیت کے لیے بھی دین میں گنجائش ہے' مگر اس وقت جب اللہ کا دین قائم ہو جائے۔ ایک بار اللہ کا دین قائم ہو جائے تو اب اس دین کو آگے پھیلانا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جب آپ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ آؤ نکلو میدان میں تو آپ کو نکلنا پڑے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام اور ایران میں جہاد و قتال ہو رہا

تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ مطالبہ آ گیا کہ فلاں محاذ پر دس ہزار آدمی چاہئیں۔ مسجد نبویؐ میں اعلان کیا گیا تو دس ہزار آدمی نکل آئے جنہیں محاذ پر روانہ کر دیا گیا۔ باقی اپنے گھروں کے اندر ہیں اور ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ گویا قتال فی سبیل اللہ فرضِ کفایہ کے درجے میں تھا۔ باقی لوگ گھروں میں بیٹھے نوافل پڑھ رہے ہوتے تھے' تلاوتِ قرآن اور وظائف و اَوراد میں مصروف رہتے تھے اور اس کے ذریعے سے اپنی روحانیت کو ترقی دیتے تھے' جو بالکل درست تھا۔

ایک حدیث نبویؐ کی رُو سے اللہ کے قرب کے حصول کے دو ذریعے ہیں: تقرّب بالفرائض اور تقرّب بالنوافل۔ ان میں سے اہم ترین درجہ تقرب بالفرائض کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ اس کا بندہ فرائض کے ذریعے سے اس سے قرب حاصل کرے۔ لیکن نوافل کے ذریعے سے بھی تقرب حاصل ہوتا ہے اور اس کا بھی بہت اونچا مقام ہے' بشرطیکہ فرض کی تکمیل ہو چکی ہو۔ اگر آپ نے فرض تو ادا کیا نہیں اور نوافل کے ڈھیر لگاتے جا رہے ہوں تو وہ نوافل کیسے قبول ہوں گے؟ لیکن ہمارے ہاں یہی ہوا کہ دین غالب نہیں تھا' لیکن دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اعمال کی فہرست سے نکال دیا گیا اور نوافل کے ذریعے سے' چلّوں کے ذریعے سے اور دیگر اَوراد و وظائف کے ذریعے سے روحانیت پر زور رہا۔ سب مانتے ہیں کہ سلوک کے جتنے بھی طریقے رائج ہیں جن سے خانقاہی نظام بنایا گیا ہے' یہ سب غیر مسنون ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ طریقے مفید نہیں ہیں۔ مفید ضرور ہیں' ان سے انسان میں ایک روحانی کیفیت اور روحانی برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے جسمانی ورزش سے انسان کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں' اسی طرح روحانی ورزش کے ذریعے سے انسان کی روح کے اندر تقویت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں' لیکن ہمارے لیے اُسوہ ہے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریق کار' اور وہ ہے جہاد اور قتال فی سبیل اللہ۔ نفلی روزوں کی طرح اس میں بھی بھوک برداشت کرنی پڑتی ہے اور پیاس بھی۔ غزوۂ تبوک کے لیے جاتے ہوئے کس قدر بھوک کا عالَم تھا! تو نفلی روزوں کے ذریعے انسان جو کیفیت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ جہاد کی صعوبتیں جھیلنے سے بھی لازماً حاصل ہوتی ہے اور اس سے بھی روحانی ترقی

حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک بندۂ مؤمن محاذِ جنگ پر پہنچا ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ صبح مقابلہ پیش آنا ہے اور ایک لاکھ مسلح فوج سے ہماری تین ہزار فوج کو سامنا کرنا ہے تو وہ بندۂ مؤمن جس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑائے گا اور دعائیں کرے گا تو کیا گھر بیٹھے کسی شخص کو ایسا تضرع اور خشوع وخضوع حاصل ہوسکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔ تو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا راستہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ ہے۔

صحیح ترین جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کے لیے کچھ شرائط اور لوازم ہیں۔ پہلے ایمانِ حقیقی دلوں میں راسخ کیا جائے' اور اس کا ثبوت ہوگا شریعت پر عمل۔ جس جس حکم پر عمل ہوسکتا ہے وہ تو ہو! اس کے بعد ہے تنظیم۔ یعنی ایسے لوگوں کو بیعت کے ذریعے سے جوڑا جائے' ان کا تزکیہ کیا جائے۔ اللہ کی رضا اور آخرت کی فلاح کے سوا کوئی اور امنگ دل میں ہے تو اسے نکال کر اور دل کو صاف کیا جائے۔ یہ سب پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں پھر صحیح جہاد فی سبیل اللہ کی منزل آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بارہ برس تک مکّہ مکرمہ کے اندر یہی کچھ کیا تھا۔ انہوں نے تکالیف جھیلیں' ماریں کھائیں' ان میں سے بعض کے جسم کے ٹکڑے کر دیے گئے' زندہ جلا دیے گئے لیکن انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ آپ ﷺ کی کامیابی کے رازوں میں سے سب سے بڑا راز یہی ہے۔ حضرت سمیہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نگاہوں کے سامنے شہید کیے گئے۔ جب ابوجہل ان پر تشدد کر رہا تھا تو آنحضور ﷺ فرما رہے تھے: ((اِصْبِرُوْا یَا آلَ یَاسِرَ' فَاِنَّ مَوْعِدَکُمُ الْجَنَّۃُ)) ''اے یاسر کے گھر والو! صبر کرو' تمہارے وعدے کی جگہ جنت ہے''۔ ایسے موقع پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم نہیں دیا کہ ابوجہل کے ٹکڑے کر دو۔ اسی طرح آپ ﷺ نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو بھی نہیں چھیڑا' بلکہ بارہ برس تک اسی کعبہ کا طواف کرتے رہے۔ اس لیے کہ طواف تو وحی سے پہلے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا تھا اور پھر آغازِ وحی کے بعد بارہ برس تک پورے مکی دور میں جاری رہا اور کعبہ شریف میں نمازیں ادا کی گئیں جبکہ دائیں بائیں بت موجود تھے۔ بہرحال اگر ہم اسلامی انقلاب کے لیے رسول اللہ ﷺ کا منہج اختیار نہیں کریں گے تو لال مسجد اور جامعہ حفصہ جیسے واقعات ہوتے رہیں گے۔ صرف جذبے اور

خلوص سے بات نہیں بنے گی جب تک آپ ﷺ کا اسوہ ہمارے سامنے نہ ہو۔ کسی شاعر نے کیا عمدہ بات کہی ہے: ؎

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

رسول اللہ ﷺ کے منہج سے ہٹ کر اختیار کیا گیا کوئی راستہ منزل تک نہیں پہنچے گا۔ البتہ نیک نیتی اور خلوص کا اجر وثواب اللہ کے ہاں مل جائے گا۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے اور بہت شدّومدّ کے ساتھ ہے۔ اسی لیے تو غیروں کو قرآن مجید پر شدید اعتراض ہے اور وہ اس سے کانپتے ہیں۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ برطانیہ کے بہت بڑے لیڈر اور وزیرِ اعظم گلیڈسٹون نے برٹش پارلیمنٹ میں قرآن مجید کا نسخہ لہرا کر کہا تھا کہ جب تک یہ کتاب دنیا میں موجود ہے امن قائم نہیں ہوسکتا۔ اور اب انہوں نے 'نعوذ باللہ' اوراقِ قرآن کو گٹر کے اندر بہا کر اپنی خباثت اور دلوں کے اندر موجود خوف کا اظہار کیا ہے۔ ایسے ہی ایک مرتبہ کلکتہ ہائی کورٹ نے بھی ایک فیصلہ دے دیا تھا کہ قرآن مجید کو بین کر دیا جائے۔ ظاہر ہے وہ اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں کرا سکتے تھے' اس لیے کہ وہاں بیس بائیس کروڑ مسلمان موجود ہیں جن کی غیرتِ دینی ہماری غیرتِ دینی سے سوگنا زیادہ ہے۔ اسی کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس کے سلسلے میں مسلمانوں کے عائلی قوانین میں تھوڑی سی ترمیم کی تھی۔ وہ اس طرح کہ اسلامی قانون تو یہ ہے کہ کسی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو وہ دورانِ عدت اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہے۔ لیکن شاہ بانو کی درخواست پر کلکتہ ہائی کورٹ نے فیصلہ دے دیا کہ جب تک مطلقہ عورت دوسری شادی نہ کر لے یا فوت نہ ہو جائے اس کا نان نفقہ اس کے سابقہ شوہر کے ذمے رہے گا۔ کورٹ نے اگرچہ شریعت کی کوئی چیز کاٹی نہیں تھی' البتہ شریعت میں اضافہ ضرور کیا تھا' لہٰذا اس پر وہاں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمانوں کا پرسنل لاء بورڈ بنا۔ ساری دینی جماعتوں نے جمع ہو کر تحریک چلائی اور سینکڑوں لوگوں نے جانیں دیں۔ بالآخر وزیر اعظم راجیو گاندھی کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور اس نے لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں دوٹوک انداز میں کہا کہ آئندہ

ہندوستان کی سپریم کورٹ سمیت کوئی عدالت مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی' اور یہ بھی کہا کہ اس سے پہلے میں نے اسلام کی سماجی تعلیمات کا مطالعہ نہیں کیا تھا' لیکن اب میں نے مطالعہ کیا ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ جو حقوق اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں وہ دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیے۔ مولانا علی میاںؒ نے اپنی کتاب میں یہ سارا واقعہ نقل کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اصل جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ کی کچھ شرائط' کچھ لوازم اور کچھ مراحل ہیں۔ البتہ ایک اور قتال ہوسکتا ہے جو جائز ہے' اسے سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے ایک مسلمان ملک ہے' اگرچہ اس میں خالص اسلامی نظام نہیں ہے' اس پر اگر کوئی دوسرا ملک حملہ کرتا ہے تو اپنے دفاع میں کھڑے ہو جانا ایک طرح کا جہاد ہے۔ اس لیے کہ اب تمام مراحل سے گزرنے کا موقع نہیں ہے۔ کیونکہ ختم کردو یا ختم ہو جاؤ والی صورتِ حال ہے۔ البتہ یہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے' کیونکہ وہ مراحل نہیں آئے جو جہاد فی سبیل اللہ کی لازمی شرط ہے۔ اسی لیے روس کے خلاف جہادِ افغانستان جہاد فی سبیل اللہ نہیں تھا' لیکن وہ جہاد جائز ضرور تھا۔ اور اس میں جس نے جان دی ہے وہ شہید ہے' واللہ اعلم! اسی طرح کوئی بڑا ملک ہے اور اس کے کسی ایک حصہ کے اندر مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ اس سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں' آزادی چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی مرضی سے' اسلامی اصولوں کے مطابق اپنا نظام چلائیں' جیسا کہ اِس وقت فلپائن' کمبوڈیا اور کشمیر میں ہو رہا ہے' تو یہ بھی جائز ہے اور اِس میں جان دینا بھی شہادت ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں ہندوستان کے ایک خاص پس منظر میں کشمیر کے حوالے سے وہاں پر اگر سیاسی تحریک چلائی جاتی تو وہ بہتر ہوتی۔ لیکن جہادِ کشمیر بہرحال ناجائز نہیں ہے۔ اپنی آزادی کی خاطر لڑنا' یعنی جہاد فی سبیل الحریت' جائز ہے۔ اس کے لیے تربیت' تزکیہ' تنظیم وغیرہ ایسے مراحل ضروری نہیں ہیں۔ لیکن وہ جدوجہد جس کے ذریعے آپ کسی ملک میں اسلام کو غالب کرنا چاہتے ہیں' وہ اگر عین نبی اکرم ﷺ کے اُسوہ کے مطابق ہو گی اور جہاد کی تمام شرائط اور لوازم کو پورا کر کے اور تمام مراحل میں سے گزر کر ہو گی تو وہ پھر صحیح معنوں میں قتال فی سبیل اللہ قرار پائے گی۔

مغربی دنیا کو مسلمانوں کے جذبۂ جہاد اور ذوقِ شہادت سے ہمیشہ سے خوف رہا ہے۔ انہیں تو زندگی بہت عزیز ہے اور وہ موت سے خائف ہیں' لیکن بندۂ مؤمن کو شہادت بہت زیادہ عزیز ہے: ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

اس لیے مغربی دنیا نے بہت عرصہ پہلے اسکیمیں شروع کیں کہ مسلمانوں میں ایسی تحریکیں اٹھائی جائیں جو جہاد کو باطل قرار دیں۔ بدنامِ زمانہ غلام احمد قادیانی آنجہانی درحقیقت اسی فکر اور اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ اُس بدبخت نے نبوت کا دعویٰ کیا اور قتال کو حرام قرار دے دیا کہ ع ''دین کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!'' جبکہ ایک حدیث نبویؐ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِیَ اللّٰهُ اِلٰی اَنْ یُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِی الدَّجَّالَ))(۱)

''جہاد اُس وقت سے جاری ہے جب سے مجھے اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا ہے اور جاری رہے گا یہاں تک کہ میری اُمت کا آخری حصہ دجال کے خلاف جنگ کرے گا۔''

اب اس ایک حدیث میں جہاد اور قتال دونوں آ گئے۔ جیسے سورۃ الصّف میں جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ دونوں آ گئے۔ احادیثِ نبویؐ میں قیامت سے قبل جن جنگوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے ان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ پہلے رومیوں سے جنگیں ہوں گی' چنانچہ وہ ہو رہی ہیں۔ عیسائی مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بہت بڑی جنگ ہوگی جس میں عیسائی اسّی جھنڈے لے کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گے اور ہر جھنڈے کے نیچے بارہ ہزار فوج ہوگی۔ احادیث کی رو سے آخری مرحلے میں یہودی مدمقابل آئیں گے۔ آپ غور کیجیے کہ عراق کے خلاف خلیج کی پہلی جنگ میں یہودیوں کو سامنے نہیں لایا گیا۔ حالانکہ اتنا بڑا اتحاد بنایا گیا تھا جس میں عراق کے خلاف تقریباً سارے عرب ممالک بھی شامل ہو گئے تھے' لیکن اسرائیل سے کہہ دیا گیا تھا کہ تم میدان میں نہ آنا' تم بیٹھے رہو' تمہاری حفاظت

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الجهاد' باب فی الغزو مع ائمة الجور۔

کا ذمہ ہم لیتے ہیں۔ اگر تمہیں صدام کے سکڈ میزائل سے خطرہ ہے تو اس کو فضا ہی میں ختم کرنے والے پیٹریاٹ میزائل ہم تمہیں دے دیتے ہیں' لیکن تم سامنے مت آنا۔ اور اب بھی یہی ہوا ہے۔ عراق اور افغانستان پر جارحیت کے لیے کتنا بڑا اتحاد بنایا گیا ہے! افغانستان پر حملے میں تو واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین اتحاد وجود میں آیا ہے۔ اس میں سارا عالمِ کفر جمع ہو چکا ہے۔ صرف برطانیہ اور بقیہ یورپ ہی نہیں بلکہ چائنا اور روس جو امریکہ کے حریف ہیں' افغانستان کی جنگ میں اِن دونوں کی مرضی بھی شامل تھی اور آج بھی ہے۔ لیکن احادیث نبویہؐ کی رو سے اس کے بعد ایک آخری مرحلہ آئے گا جب تمام یہودی مسلمانوں کے مقابلے میں صف آراء ہو جائیں گے اور یہودیوں کا لیڈر ہوگا المسیح الدجال۔ اس موقع پر پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا جو دجال کو قتل کریں گے۔ اُس وقت تک اُمت مسلمہ کے اندر جہاد و قتال کا سلسلہ جاری رہے گا' اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں ہے!

بہرحال یہ بتانا اور جاننا مقصود ہے کہ دین کی اقدار کیا ہیں۔ کون سی چیز پہلے اور کون سی بعد میں ہے۔ روحانی اقدار بھی مطلوب ہیں' رات کی نماز بھی نہایت پسندیدہ عمل ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ غلبۂ دین کی جدوجہد بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح فہم اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

حدیث 3

ارکانِ اسلام

۲۷ جولائی ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البيّنة)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہما قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ :

((بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِقَامِ الصَّلَاةِ، وَاِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (۱)

ابوعبدالرحمٰن' سیدنا عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

معزز سامعین کرام!

آج جو حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے' جس کا متن اور اردو ترجمہ میں نے آپ کے سامنے بیان کیا' یہ متفق علیہ ہے' یعنی اس کی صحت پر امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ

(۱) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب بنی الاسلام علی خمس ـ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان اركان الاسلام

دونوں کا اتفاق ہے اور ایسی حدیث مجموعۂ احادیث میں سب سے زیادہ مستند اور صحت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہے —— ہمارے ہاں کتب احادیث کے حوالے سے ''صحاحِ ستّہ'' کی اصطلاح بہت معروف ہے' یعنی چھ ایسے مجموعہ ہائے احادیث (صحیح البخاری' صحیح مسلم' سنن الترمذی' سنن ابی داوٗد' سنن ابن ماجہ اور سنن النسائی) جو صحیح احادیث پر مشتمل ہیں —— اِن صحاحِ ستّہ میں بھی بخاری و مسلم کا درجہ سب سے بلند ہے اور ان دونوں کو ''صحیحین'' بھی کہا جاتا ہے۔ پھر وہ حدیث جس پر امام بخاری و مسلم دونوں متفق ہو جائیں تو وہ روایت اور سند کے اعتبار سے قرآنِ کریم کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے۔ گویا وہ قرآن کی طرح قطعی الثبوت ہوتی ہے اور اس پر ہم اتنا یقین کر سکتے ہیں جتنا قرآنی آیات پر کرتے ہیں۔

زیر مطالعہ حدیث کا مضمون بعینہٖ وہ ہے جو حدیثِ جبریلؑ میں بیان ہوا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ حدیثِ جبریل ''اُمُّ السُّنّة'' کہلاتی ہے۔ یعنی احادیث کے مجموعے میں اس کا وہی مقام ہے جو قرآن مجید میں سورۃ الفاتحہ کا ہے۔ سیدنا جبرائیل علیہ السلام نے جب آپ ﷺ سے سوال کیا: ((اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ)) یعنی مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے (کہ اسلام کیا ہے؟) تو اس کے جواب میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا))

''اسلام یہ ہے کہ تُو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور تُو نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان المبارک کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو۔''

ارکانِ اسلام' کُل اسلام نہیں

ان دو احادیث کا مضمون تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حدیثِ جبریل میں یہ مضمون حدیث کا ایک جزو ہے جبکہ یہ مکمل (independent) حدیث ہے۔ جہاں تک اس حدیث کے مشمولات (contents) کا تعلق ہے ان پر حدیثِ

جبریل میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے' البتہ زیر مطالعہ حدیث کا آغاز جس جملے سے ہو رہا ہے: ''بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ'' (اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے) وہ انتہائی اہم اور غور طلب ہے۔ اس حدیث مبارکہ (جس میں ارکانِ اسلام کو بیان کیا گیا ہے) کے بارے میں لوگوں کو ایک غلط فہمی اور مغالطہ ہوا ہے کہ انہوں نے ارکانِ اسلام ہی کو اسلام کی مکمل تعبیر سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ حدیث کا پہلا جملہ ہی اس تصور کی نفی کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اسلام کی بنیاد ان چیزوں پر ہے۔ اب یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ بنیاد اور شے ہے اور عمارت اور شے۔ لہٰذا یہ ارکانِ اسلام ہیں مکمل اسلام نہیں' جبکہ آج انہی ارکانِ خمسہ کو کُل کا کُل اسلام قرار دے دیا گیا ہے۔ اس تصور سے ایک بہت بڑی حقیقت نظر انداز ہو جاتی ہے اور یہ عام مغالطہ ہے جو لوگوں کو اس حدیث کے حوالے سے ہوا ہے۔

یہ حدیث بہت مشہور ہے اور اکثر مساجد میں کبھی اس حدیث کے حوالے سے بڑے بڑے چارٹ لٹکے ہوئے ہوتے تھے' جس میں ایک مسجد کی محراب کی سی شکل بنا کر اور اس میں پانچ ستون دکھا کر ارکانِ اسلام کا ایک نقشہ پیش کیا جاتا تھا۔

تخلیقِ انسانی کا مقصد: عبادتِ ربّ

قرآن مجید میں تخلیق انسانی کا مقصد عبادتِ ربّ قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا مگر صرف اس لیے کہ میری بندگی اور پرستش کریں۔''

لہٰذا مقصدِ تخلیقِ انسانیت عبادتِ الٰہی ہے اور جمیع انبیاء کرام علیہم السلام اسی کی دعوت دیتے رہے ہیں۔ قرآن مجید کی مکی سورتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ الغرض تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی دعوت ''عبادتِ ربّ'' کی دعوت تھی: ﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ﴾ (ہود: ۵۰) ''اے میری قوم! عبادت کرو اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں''۔

تمام انبیاء کرام کی طرح نبی آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی ''عبادتِ

ربّ'' ہی کی دعوت تھی:﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ) ''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا' تاکہ تم بچ سکو''۔ نبی اکرمﷺ کی دعوت اور سابقہ رسولوں کی دعوت میں ایک بنیادی فرق ہے کہ سابقہ انبیاء و رُسل ؑ کا صیغۂ خطاب ''یٰقَوْمِ'' (اے میری قوم کے لوگو!) ہوتا تھا' اس لیے کہ وہ کسی خاص علاقے اور کسی خاص قوم کی طرف مبعوث کیے جاتے تھے' جبکہ نبی آخر الزماں حضرت محمدﷺ کی دعوت کا صیغۂ خطاب تھا: ''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ'' (اے لوگو!) اس لیے کہ آپﷺ کی دعوت عالمگیر اور آفاقی ہے' یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے --- اس فرق کے باوجود سابقہ تمام انبیاء ورُسل ؑ اور نبی آخر الزماںﷺ کی دعوت ایک ہی ہے' یعنی عبادتِ ربّ کی دعوت۔

عبادت کا جامع مفہوم

اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''عبادت'' کا مفہوم کیا ہے۔ لفظ عبادت عبد سے نکلا ہے' عبد غلام کو کہتے ہیں اور غلام آقا کی ملکیت ہوتا ہے' صرف ملازم نہیں ہوتا۔ ملازم تو چند گھنٹوں یا کسی خاص ڈیوٹی کے لیے ہوتا ہے اور اس کام کو کرنے کے بعد وہ آزاد ہے' جو چاہے کرے' جہاں چاہے جائے۔ مثلاً کسی کو آپ نے اپنا ڈرائیور رکھا ہے تو وہ آپ کا کھانا تو نہیں پکائے گا۔ اسی طرح اگر کسی کو آپ نے خانساماں رکھا ہے تو وہ آپ کا ٹائلٹ صاف نہیں کرے گا۔ اگر آپ اسے کہیں گے بھی تو وہ صاف کہے گا کہ یہ میری ذمہ داری نہیں ہے' میں اس کام کے لیے آپ کا ملازم نہیں ہوں۔ جبکہ غلام کی حیثیت ایسی نہیں ہوتی۔ غلام کو ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ اپنے آقا کی اطاعت کرنا ہوتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی اور نہ اس کی کوئی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ کسی چیز کا مالک کیا بنے گا وہ تو خود مملوک ہے۔ آقا اسے جہاں سونے کو کہے گا' وہاں سونا ہوگا اور جہاں اور جس وقت جانے کو کہے گا جانا ہوگا۔ اس کا اپنا کوئی ارادہ ہے نہ پروگرام اور نہ ہی کوئی لائحہ عمل' بلکہ وہ تو آقا کے اشارۂ ابرو پر چلے گا۔ یہ ہے عبادت کا مفہوم' کہ اللہ (جو ہمارا آقا ہے) کی اطاعت میں عبدیت (غلامی) کا تصور ہر وقت ذہن میں نقش رہے۔

اسی کو فارسی میں بندگی کہا جاتا ہے۔ شیخ سعدیؒ کا مشہور شعر ہے: ؎

زندگی آمد برائے بندگی   زندگی بے بندگی شرمندگی!

یعنی ہمیں زندگی فقط بندگی کے لیے ملی ہے' اگر بندگی نہیں کریں گے تو یہ شرمندگی ہی شرمندگی ہوگی ـــــ پچھلے زمانے میں ایسے اشعار بھی مساجد میں لکھے ہوتے تھے۔

یہاں غلامی اور عبادت کا فرق بھی ذہن نشین رہے کہ غلام جو آقا کی اطاعت کر رہا ہے وہ مجبوری سے کر رہا ہے' کیونکہ اس نے اُسے خرید رکھا ہے' وہ اس کا مالک ہے اور اس نے اس کی قیمت ادا کی ہے۔ لیکن سمجھ لیجیے کہ یہ بھی عبادت نہیں ہے۔ عبادت میں کرنا تو وہی ہے جو ربّ تعالیٰ کی منشا ہے' لیکن مجبور ہو کر نہیں بلکہ محبت الٰہی کے جذبۂ مستانہ سے سرشار ہو کر اپنی جبین نیاز کو بارگاہِ الٰہی میں اس ادا سے رکھنا کہ جسم ظاہری کے روئیں روئیں سے انا عبدك ' انا عبدك کی صدائے حق بلند ہو۔ اسی لیے میں نے عبادت کے مفہوم میں بندگی کے ساتھ ''پرستش'' کا لفظ بھی شامل کیا تھا' اس لیے کہ پرستش ہوتی ہی محبت کے ساتھ ہے۔ مثلاً اگر آپ دولت کے پرستار ہیں تو آپ کے دل میں دولت کی محبت ہے' وطن پرست ہیں' قوم پرست ہیں' نفس پرست ہیں تو یقیناً ان کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے۔ لہٰذا جب بندگی اس جذبۂ اُلفت میں ڈوب کر کی جائے گی تو وہ عبادت کا مقام حاصل کرے گی۔

ایک بات سمجھ لیجیے کہ ہماری عبادت کا اس مقام و مرتبہ تک پہنچنا انتہائی مشکل کام ہے' لہٰذا اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ آپ طے کر لیں کہ مجھے چلنا اسی راستے پر ہے۔ پھر اس راہ میں نشیب و فراز آئیں گے' کہیں قدم ڈگمگائیں گے' کہیں جذبات کا غلبہ ہوگا' کبھی ناامیدی ہی ناامیدی چھائے گی اور کسی جگہ اُمید کی کرن نظر آئے گی' مگر آپ کو بندگی اور پرستش کے راستے پر مسلسل چلتے رہنا ہے۔ اگر کہیں قدم پھسل گیا تو وہیں کیچڑ میں پڑے نہیں رہنا' کبھی بھی کسی گناہ پر مصر نہیں ہونا اور ڈیرہ ڈال کر نہیں بیٹھنا۔ جب بھی کوئی ایسی لغزش سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر کے بخشوانا ہے' ورنہ ایک ہی گناہ تباہی اور ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ یہ ہے عبادت کا جامع مفہوم!

ارکانِ اسلام کی اہمیت

(۱) اقامتِ صلوٰۃ: عبادت کے اس اعلیٰ مرتبہ کو آسانی سے پانے اور اللہ کی بندگی اور پرستش کے جذبہ کو تازہ رکھنے کے لیے چار عبادات فرض کر دی گئی ہیں جن کا ذکر زیر مطالعہ حدیث میں ہوا ہے۔ یہ چاروں اسلام کے ارکان اور اسلام کی عمارت کے چار ستون ہیں۔ ان میں سب سے مقدم اور اہم نماز ہے۔ نماز کو دن میں پانچ مرتبہ فرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے مقصدِ تخلیق ''عبادتِ رب'' کو نہ بھولے۔ اس لیے کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھی جاتی ہے اور اس سورۃ کی سات آیات (انہیں ''سبع مثانی'' یعنی بار بار پڑھی جانے والی آیات بھی کہا جاتا ہے) میں مرکزی اور چوٹی کی آیت چوتھی ہے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ ﴾ چونکہ اس آیت میں ''نَعْبُدُ'' اور ''نَسْتَعِيْنُ'' فعل مضارع کے صیغے ہیں اور عربی زبان میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کو cover کرتا ہے اس لیے اس آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: ''اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔ یہ قول و قرار دن میں پانچ مرتبہ نماز کی ہر رکعت میں دہرایا جائے۔ حفیظ جالندھری نے کیا خوب کہا ہے:

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

تو انہی نقوشِ بندگی کو تازہ رکھنے کے لیے اوّلین اور اہم ترین ذریعہ نماز ہے۔

(۲) صیامِ رمضان: دوسرے یہ کہ آپ کے ساتھ نفسِ حیوانی لگا ہوا ہے جس کے تقاضے بھی حیوانی ہیں۔ ان تقاضوں میں سے سب سے اہم دو چیزیں ہیں: (۱) خوراک (۲) جنسی جذبۂ شہوت۔ زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے خوراک ضروری ہے ورنہ مر جائیں گے اور نسلِ انسانی کی بقا کے لیے جذبہ شہوت یعنی شادی بیاہ ضروری ہے ورنہ نسل ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ دونوں حیوانی داعیے (animal instincts) اتنے طاقتور ہیں کہ جب اندر سے اُبھرتے ہیں تو اندھے بہرے ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اس سے

غرض ہوتی ہے کہ کسی طرح ان کی تسکین ہونی چاہیے۔ بھوک لگتی ہے تو پیٹ کچھ کھانے کو مانگتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ جو چیز اس میں ڈالی جارہی ہے وہ حلال ہے یا حرام' بس اس کی تو بھوک مٹنی چاہیے۔ اسی طرح جب جذبۂ شہوت بھڑک اٹھے تو وہ اپنی تسکین چاہتا ہے' جائز راستے سے ہو یا ناجائز راستے سے۔

یوں سمجھئے کہ ہمارا یہ حیوانی وجود گھوڑے کی مانند ہے اور ہمارا روحانی وجود یعنی وجودِ حقیقی اس پر سوار ہے۔ اگر گھوڑا منہ زور ہے اور سوار کمزور ہے تو سوار گھوڑے کے رحم وکرم پر ہے' وہ جہاں چاہے اُسے پٹخ دے گا' جس کھائی میں چاہے اسے گرا دے گا۔ چنانچہ اس پر سواری کے لیے ضروری ہے کہ اس روحانی وجود کو طاقتور بنایا جائے' اس کی خودی اور انا کو مضبوط کیا جائے تا کہ یہ بھوک اور شہوت کی شدت کو برداشت کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے روزہ فرض کر دیا گیا کہ سارا دن بھوکے اور پیاسے رہو' چاہے سخت گرمی ہی کیوں نہ ہو۔ طلوعِ فجر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک کھانے پینے کی ہر جائز چیز بھی آپ پر حرام ہے۔ اپنی منکوحہ بیوی سے بھی روزہ کی حالت میں تعلق قائم کرنا حرام ہے۔ اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینے کے اس عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی بچ بچ کر چلتے رہو اور حیوانی وجود پر مکمل کنٹرول حاصل کرو' اسے آزاد مت چھوڑو!

<u>(۳) ایتائے زکوٰۃ</u>: یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں: ﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَيۡرِ لَشَدِيۡدٌ ۝﴾ (العٰدیٰت) ''بلاشبہ وہ (انسان) مال کی محبت میں بہت سخت ہے''۔ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے سامانِ زندگی تو ضرور چاہیے اور یہ پیسے سے حاصل ہوتا ہے' لہٰذا کسی حد تک اس کی ضرورت ہے' لیکن انسان اس سے بہت آگے بڑھ کر دولت پرست اور مال کا پجاری بن جاتا ہے۔ انسان اس کی محبت میں اندھا ہو جاتا ہے اور حلال وحرام کی پروا کیے بغیر صبح وشام مال جمع کرنے کی فکر میں رہتا ہے' بلکہ اس کے لیے ظلم اور غصب کا راستہ اختیار کرنے سے بھی نہیں کتراتا۔ اس طرزِ عمل سے روکنے کے لیے اسلام نے زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا کہ دوسروں کو اللہ کے لیے دیتے رہنے کی عادت ڈالو' زیادہ سے زیادہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔

لوگ صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہی کافی سمجھتے ہیں' حالانکہ حدیث میں ہے:

((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)) (۱)

''تمہارے مال میں (غریبوں کے لیے) زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔''

اس کو فقہی اصطلاح میں ''صدقاتِ نافلہ'' کہتے ہیں۔ زکوٰۃ چونکہ فرض ہے اس لیے وہ تو علی الاعلان دی جائے گی' جبکہ صدقاتِ نافلہ راز داری اور خفیہ طریقے سے دیے جائیں گے۔ ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے ہاتھ تک کو خبر نہ ہو' اس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے۔ اسلامی ریاست میں اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ حکومت وصول کرتی ہے اور اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ہر ایک کو انفرادی طور پر ادا کرنی ہوتی ہے۔

(۴) حج بیت اللہ: ارکانِ اسلام میں آخری رکن حج ہے' اس میں مذکورہ تینوں عبادات کی حکمتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ذکرِ الٰہی بھی ہے کہ بآوازِ بلند تلبیہ پڑھا جاتا ہے' طواف کے دوران بھی اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے' پھر شعائر اللہ کی زیارت ہے' بیت اللہ کو صرف دیکھنا بھی باعث اجر و ثواب ہے۔ اسی طرح احرام میں روزے جیسی کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں کہ چاہے بیوی ساتھ ہے پھر بھی تعلقِ زن و شو قائم نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ کہ مال بھی خرچ ہوتا ہے' حج کے لیے ایک خطیر رقم درکار رہوتی ہے۔ گویا تمام عبادات میں جامع ترین عبادت حج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کا حج اللہ کے ہاں قبول ہو جائے وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے جس طرح آج ہی اس کی ماں نے اسے جنا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ حج کے مذکورہ فوائد تبھی حاصل ہوں گے جب وہ حج حلال کمائی سے کیا گیا ہو حرام سے نہیں' وہاں احرام کی ساری پابندیوں کا لحاظ رکھا ہو اور حج کے سارے اعمال بڑی عمدگی اور اعلیٰ اسلوب کے ساتھ ادا کیے ہوں۔ اس کے ساتھ حج کے دوران کوئی بے حیائی اور گناہ کا کام بھی نہ کیا ہو' جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا:

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ﴾ (البقرۃ:۱۹۷)

(۱) سنن الترمذی: ابواب الزکوۃ' باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ

''حج کے مہینے معروف ہیں۔تو جس نے اپنے اوپر لازم کرلیا ان مہینوں میں حج کو تو (اس کو خبر دار رہنا چاہیے کہ) دورانِ حج نہ تو شہوت کی کوئی بات کرے' نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ اُمُّهٗ)) (۱)

''جو شخص اللہ کے لیے حج کرے اور اس میں بے حیائی کی بات نہ بولے اور گناہ کا کام نہ کرے تو وہ لوٹ کر آتا ہے (اور گناہوں سے اس طرح پاک ہوتا ہے) گویا اس کی ماں نے اس کو آج ہی جنا ہے۔''

بندگیٔ ربّ' خطا اور توبہ

یہ ارکانِ خمسہ بنیاد ہیں اور اس بنیاد پر استوار ہونے والی عمارت اسلام ہے' جس کا ماقبل تفصیل سے تذکرہ ہوا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمہ وقت' ہمہ تن' ہمہ جہت اللہ کی اطاعت' محبت کے انتہائی جذبے سے سرشار ہو کر کی جائے۔ ہاں کبھی غلطی ہو سکتی ہے' خطا ہو سکتی ہے تو خالص توبہ کرو' اللہ معاف کر دے گا — خالص توبہ کی تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ' توبہ نہیں۔ ایک شرط یہ ہے کہ انسان اس فعل کو عملاً چھوڑ کر عملِ صالح کی روش اختیار کرے۔ دوسری یہ کہ دل میں پکا ارادہ کر لے کہ آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ تیسری اور لازمی شرط یہ ہے کہ انسان کو اپنے کیے پر حقیقی پچھتاوا اور شرمندگی ہو کہ میں یہ کیا کر بیٹھا ہوں' یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔ توبہ کی اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان کے دل میں اپنی غلطی پر ندامت پیدا ہو جائے۔ اس بات کو علامہ اقبال نے اپنے عنفوانِ شباب میں ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا اور اس پر داد دی کہ میاں اس عمر میں یہ شعر! ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے!

(۱) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب فضل الحج المبرور۔ وصحیح مسلم' کتاب الحج' باب فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفۃ۔ واللفظ للبخاری۔

انفعال کہتے ہیں پشیمانی اور شرمندگی کو۔ عام طور پر جب کسی انسان پر پشیمانی اور شرمندگی طاری ہوتی ہے تو پیشانی پر پسینہ آ جاتا ہے۔ علامہ اقبال ان قطروں کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ کی نگاہ میں ان قطروں کی اتنی وقعت ہے کہ اللہ نے ان کو موتیوں کی طرح چُن لیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انسان فطری طور پر خطا کار ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) (۱)

''تمام بنی آدم بہت خطا کار ہیں' لیکن ان خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو بار بار توبہ کرنے والے ہیں۔''

یعنی اگر وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر یا کسی جذباتی سیلاب کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات کی وجہ سے آپ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو فوراً واپس لوٹیں اور بارگاہِ الٰہی میں توبہ کریں تو اللہ یقیناً معاف فرما دے گا۔ سورۃ النساء میں تو یہاں تک فرما دیا گیا کہ اللہ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ (النساء:۱۷)

''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو جہالت اور نادانی میں کوئی غلط حرکت کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں' پس یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

کلمۂ شہادت' اسلام میں داخلے کی بنیاد

اس حدیث میں جو ارکانِ خمسہ بیان ہوئے ہیں ان میں پہلا رکن کلمۂ شہادت اسلام میں داخلے کی بنیاد ہے' جبکہ باقی ارکانِ اربعہ (نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج)' جو اسلام کے ارکان اور چوٹی کے اعمال ہیں' ان پر عمل نہ کرنے کی بنیاد پر کوئی شخص کافر قرار نہیں

(۱) سنن ابن ماجه' کتاب الزھد' باب ذکر التوبة۔ وسنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع۔

پائے گا' البتہ ان میں سے کسی کے انکار پر کافر ہو جائے گا — مختلف فقہاء کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ کو تعزیر کے طور پر جسمانی سزا دی جائے گی' اسے قید کیا جائے گا اور اسے توبہ پر مجبور کیا جائے گا۔ بعض فقہاء کا موقف ہے کہ اسے قتل بھی کیا جا سکتا ہے' اس لیے کہ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))(۱)

''بندے اور کفر و شرک کے مابین نماز کا معاملہ حائل ہے۔''

لیکن یہ قتل کرنا بھی تعزیراً ہوگا' اُسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔ جیسے شادی شدہ زانی پر حد جاری کر کے اسے رجم کے ذریعے قتل تو کیا جائے گا' لیکن اسے مرتد سمجھتے ہوئے نہیں۔

دراصل اسلام میں داخل ہونے یا شامل رہنے کے لیے بنیاد صرف ایک چیز بنتی ہے اور وہ کلمۂ شہادت ہے۔ چنانچہ کوئی شخص ہمارے سامنے آ کر کہتا ہے: '' اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ'' تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگرچہ قرائن موجود ہوں اور حالات یہ گواہی دے رہے ہوں کہ اُس نے دل سے کلمہ نہیں پڑھا تب بھی ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

ایک جنگ میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے ایک ایسے ہی شخص کی جان لے لی تھی۔ حضرت اسامہؓ کی کفار کے لشکر میں سے ایک شخص سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ شخص حضرت اسامہؓ کی تلوار کی زد میں تھا کہ اُس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے سمجھا کہ یہ جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے' لہٰذا اس پر تلوار چلا دی اور سر قلم کر دیا۔ بعد میں اُسامہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوئے تو آپؐ نے انتہائی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اسامہ! اُس وقت تم کیا کرو گے جب قیامت کے دن یہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف گواہی دینے کے لیے آئے گا!''

قرآن کریم میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اپنے اسلام کا اظہار کرے تو اسے یہ مت کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو! سورۃ النساء کی آیت ۹۴ میں ارشاد ہوا:

---

(۱) صحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان اطلاق اسم الكفر على من ترك الصلاة۔
ترمذی کی روایت میں الفاظ ہیں: ((بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيْمَانِ تَرْكُ الصَّلَاةِ))

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾

''اے اہلِ ایمان! جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور کسی ایسے شخص کو جو تمہارے سامنے سلامتی پیش کرے (تمہیں سلام کہے یا اپنا اسلام پیش کرے) یہ نہ کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو۔''

یہ بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیثِ جبریل سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ اِن کی روایت میں ہے کہ جب جبرائیلؑ نے کہا: حَدِّثْنِيْ بِالْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْهَكَ لِلّٰهِ)) ''اسلام یہ ہے کہ تو اپنے چہرے کو اللہ کے سامنے جھکا دے (سرِ تسلیم خم کر دے)''۔ یہ لفظ اسلام کے ساتھ معنوی مناسبت رکھتا ہے' اس لیے کہ اسلام کے لغوی معنی ہی اطاعت قبول کر لینا (to surrender) ہے۔

''عباداتِ اربعہ'' میں سے دو چیزوں (نماز اور زکوٰۃ) کا ذکر سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں بھی آیا ہے۔ اس اعلانِ عام کے بعد کہ مشرکینِ عرب کو صرف چار مہینوں کی مہلت ہے' ارشاد ہوا:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (التوبۃ)

''جب عزت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو' اور ان کو پکڑ لو اور گھیر لو' اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

عبادت اور عبادات میں فرق

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں داخلے کی بنیاد کلمہ شہادت ہے اور اس کا عملی اظہار ''عباداتِ اربعہ'' سے ہوگا اور ان کی حقیقت اور روح ''عبادتِ رب'' ہے۔

''عبادت'' اور ''عبادات'' کا فرق سورۃ البینہ کی اس آیت میں بھی واضح کیا گیا ہے جو خطاب کے شروع میں تلاوت کی گئی:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝ (البیّنة)

''اور انہیں نہیں حکم ہوا تھا مگر اس بات کا کہ اللہ کی یکسو ہو کر عبادت کریں اسی کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے' اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں' اور یہی ہے ہمیشہ کا قائم دین۔''

یعنی دین ان چیزوں پر قائم ہے۔ اس آیت میں عبادت' نماز' زکوٰۃ تینوں کے درمیان ''واؤ'' آ رہی ہے۔ عربی گرامر میں اس کو واوِ عطف کہتے ہیں اور عطف دو چیزوں کے درمیان مغائرت ثابت کرتا ہے' یعنی پہلی چیز اور ہے دوسری اور ہے۔ جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں: ''قلم و پینسل''۔ اس مرکب میں قلم اور شے ہے اور پینسل اور شے۔ اسی طرح محولہ بالا آیت میں عبادت اور شے ہے' نماز و زکوٰۃ اور چیزیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اصل عبادت کچھ اور ہے اور یہ عبادات (ارکانِ اسلام) اس کو سہارا (support) دینے کے لیے ہیں۔ اگر آپ نے صرف ستون کھڑے کر لیے اور ان کے اوپر چھت ہی نہیں ڈالی تو ان ستونوں کا فائدہ؟ آج ہمارے ذہنوں سے یہ بات نکل چکی ہے کہ ان ستونوں کے اوپر اسلام اور عبادت کی چھت بھی ضروری ہے — ''عبادت'' اور ''عبادات'' کا یہ تصور اگر عام ہو جائے تو واقعہ یہ ہے کہ اُمت کی بہت بڑی اصلاح ہو جائے گی۔ ورنہ ان عبادات کی حیثیت صرف رسومات (rituals) کی رہ جاتی ہے۔ جیسے اقبال نے کہا تھا ع ''رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی!'' موجودہ دور میں یہ رسومات تو بہت بڑے پیمانے پر ہو رہی ہیں۔ تقریباً ہر سال حج کی ادائیگی کے لیے مکہ میں پچیس' تیس لاکھ لوگ جمع ہوتے ہیں' جبکہ رمضان کے آخری عشرہ میں یہ تعداد اس سے بھی بڑھ جاتی ہے' لیکن اس کا دنیا پر ماشہ بھر بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دنیا جس رنگ میں چل رہی ہے ویسے ہی چلی جا رہی ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں عالی شان مساجد تعمیر ہو رہی

ہیں لیکن نماز کی ادائیگی صرف رسومات کی حد تک رہ گئی ہے۔

آج کل ہمارا حال وہ ہو چکا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی ایک بہت ہی لرزا دینی والی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آجائے گا'' ((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ)) ''کہ اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے کچھ نہیں بچے گا'' ((وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ)) ''اور قرآن میں سے بھی سوائے اُس کے رسم الخط کے کچھ نہیں بچے گا''۔ یعنی قرآن کی صرف تحریر بچ جائے گی اور قرآن کا نظام دنیا میں کہیں نظر نہیں آئے گا۔ ((مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِنَ الْھُدٰی)) ''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی''۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! اور چوتھی بات سخت ترین ہے: ((عُلَمَاءُ ھُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے''۔ ((مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ))(۱) ''انہی میں سے فتنے برآمد ہوں گے اور انہی میں لوٹ جائیں گے''۔ یعنی فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ بدترین زمانے کی پیشین گوئی کی ہے جس کے آثار ہم آج چشمِ سر سے دیکھ رہے ہیں۔

موجودہ دور میں علاماتِ قیامت کا ظہور

حدیث جبریل میں بھی علاماتِ قیامت میں سے دو کا تذکرہ تھا اور وہ بھی آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ حدیث جبریل میں علاماتِ قیامت کے بارے میں پوچھے گئے سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَۃُ رَبَّتَھَا)) ''(جب تم دیکھو) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے''۔ اکثر محدثین کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد سرکش ہو جائے گی۔ آج ہمارے اردگرد کتنے ہی ایسے بدبخت ہیں جو اپنے والدین کو اذیتیں دیتے ہیں' ان کو گالیاں دیتے ہیں۔ دوسری علامت یہ بیان فرمائی:

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان' راوی: حضرت علی رضی اللہ عنہ۔

((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ)) ''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں' ننگے بدن' محتاج' بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے''۔ یہ صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے۔ دبئی کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے! سوسال پہلے یہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا' پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے' پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ پورے عرب کا یہی معاملہ تھا۔ حج میں قربانی کا سب سے بڑا مصرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ انہیں کچھ کھانے کو مل جائے اور یہ لوگ تگ و دو کر کے گوشت اکٹھا کرتے اور خشک کر کے سال بھر کھاتے تھے۔ تقریباً ستر اَسّی برس سے یہ صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہوگئی ہے' جب سے تیل دریافت ہوا ہے' ورنہ اس سے پہلے یہ مشرقی ساحل جہاں آج دبئی اور ابوظہبی جیسے شہر آباد ہیں' یہاں فقط جھونپڑیوں پر مشتمل بستیاں تھیں اور ان کا بکریاں چرانے اور مچھلیاں پکڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اب یہ خوشحالی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ دنیا کا پہلا سیون سٹار ہوٹل دبئی میں تعمیر ہوا ہے۔(۱)

عباداتِ اربعہ: روحانی ارتقاء کا ذریعہ

اب یہاں دو باتیں انتہائی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ حدیث زیر مطالعہ میں مذکور چار عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ نہ صرف ارکانِ اسلام ہیں بلکہ انسان کی روحانی ترقی کا ذریعہ بھی یہی ہیں۔ یہ محض قانونی شرط پوری کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر نماز میں خشوع وخضوع پیدا ہو جائے تو یہ ''معراج المؤمنین'' کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ اگر روزہ پورے اہتمام سے رکھا جائے کہ آدمی جھوٹ' فحش گوئی اور لہو ولعب سے مکمل اجتناب کرے اور اسے اپنے نفس پر مکمل کنٹرول حاصل ہو جائے تو یہ روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ اور صدقات کا معاملہ ہے کہ اگر آدمی انفاقِ مال کے سبب دولت کی پرستش سے آزاد ہو جائے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ قرآن حکیم میں انفاق کا اعلیٰ ترین درجہ یہ بیان کیا گیا ہے: ﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾

(۱) بعدازاں دبئی میں ''برج خلیفہ'' کی تعمیر بھی ہوئی' جو دنیا کی بلندترین عمارت ہے۔ (مرتب)

(البقرۃ:۲۱۹) ''اور یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کیا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جو بھی زائد از ضرورت ہو''۔ یعنی اپنی ضرورت اور گزر اوقات کے لیے رکھ لو' باقی راہِ خدا میں دے دو۔

اس مسئلہ میں تھوڑی سی باریکی ہے' کہیں کوئی مغالطہ نہ ہو جائے۔ واضح رہے کہ روپیہ پیسہ اپنے پاس رکھنا حرام نہیں ہے' بس شرط یہ ہے کہ حلال ذریعے سے کمایا گیا ہو۔ البتہ اعلیٰ روحانیت یہ ہے کہ اس میں سے صرف اپنی ضروریات کی حد تک اپنا حق سمجھو اور باقی اللہ کی راہ میں دے دو۔ تمہاری ضروریات سے زائد مال محرومین و مساکین کا ہے۔ اللہ نے ان کے مال کو تمہارے حصے میں ڈال کر تمہارا امتحان لیا ہے۔ تمہیں آزمایا جا رہا ہے کہ تم ان کو لوٹا کر سبکدوش ہو جاتے ہو یا ان کے مال پر غاصبانہ قبضہ جما کر بیٹھے رہتے ہو۔ یہ اسلام کی اخلاقی اور روحانی تعلیم ہے' ورنہ تمہارے لیے اس کا رکھنا جائز ہے' حرام نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں کوئی اختیار نہیں ہے' وہ تو زبردستی لے لی جائے گی اور زکوٰۃ کے بعد جو باقی بچتا ہے اس میں تمہیں اختیار ہے۔ تم اسے اپنے پاس بھی رکھ سکتے ہو اور یہ وراثت کے طور پر تمہاری اولاد کو منتقل بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر روحانی ترقی چاہتے ہو تو ضرورت سے زائد مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ تمہارے روحانی ارتقاء کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تمہارا مال ہے اور یہی روح کے لیے سب سے بڑی گندگی ہے۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی اسی سطح پر گزاری ہے اور کبھی بھی زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ میں جب یہ کہا کرتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی زکوٰۃ نہیں دی تو لوگ اس پر چونک جاتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن کو ادا نہ کریں — زکوٰۃ کا سوال تو تب پیدا ہوتا ہے جب آپؐ کچھ بچا کر رکھتے اور صاحبِ نصاب ہوتے۔ جب آپ ﷺ نے اپنے پاس کچھ رکھا ہی نہیں تو زکوٰۃ کاہے کی؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خاص طبقہ جنہیں فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم کہا جاتا ہے' انہوں نے اسی روحانی و اخلاقی سطح پر زندگی گزاری ہے۔ ان کے سرخیل حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ

تھے۔ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرزِ عمل نہیں تھا۔ فقراءِ صحابہؓ کے علاوہ باقی صحابہ کاروبار بھی کرتے تھے' دولت رکھتے بھی تھے اور اللہ کی راہ میں دیتے بھی تھے۔ البتہ یہ صحابہ بھی ہر وقت آمادہ رہتے تھے کہ جب بھی مطالبہ آئے گا تو سارا مال پیش کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اپنا سب کچھ لا کر دے دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر موقع پر اپنا وافر مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا شمار فقراءِ صحابہ میں تو نہیں ہے' لیکن آمادگی ہر وقت تھی کہ یہ زائد مال امانت ہے' جب بھی وقت آئے گا' حاضر کر دیں گے۔ چنانچہ یہ عبادات اللہ تعالیٰ کے راستے میں روحانی ترقی کی منزلیں اور سیڑھیاں ہیں۔ انہی سے ہو کر گزریں گے تو روحانی ارتقاء حاصل ہو گا۔

آپ کی نماز دل کی حضوری اور خشوع و خضوع کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اگر آپ نے بس نماز پڑھ لی تو فقہی اعتبار سے فرض ادا ہو گیا' لیکن اگر خشوع و خضوع اور حضورِ قلب کے ساتھ نماز پڑھی تو اس سے اعلیٰ درجے کی روحانی ترقی بھی حاصل ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ سجدہ کرو تو یوں محسوس کرو گویا اپنے ربّ کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے۔ نماز میں اس کیفیت کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرو کہ جو بھی رحمت والی آیت آئے تو فوراً اللہ سے رحمت کا سوال کرو اور عذاب والی آیت آئے تو فوراً اللہ کے عذاب سے معافی طلب کرو۔ نماز تو ایک طرح کا ڈائیلاگ ہونا چاہیے' جیسے حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میں نے صلوٰۃ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے.....'' علامہ اقبال نے اسے انائے کبیر (The Infinite Ego) اور انائے صغیر (The finite ego) کا مکالمہ قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انانیتِ کبریٰ کا بیان سورۂ طٰہٰ میں بایں الفاظ ہوا ہے:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ﴿۱۴﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۵﴾﴾

''بے شک میں ہی اللہ ہوں' میرے سوا کوئی معبود نہیں' تو میری ہی عبادت کرو' اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔''

اس کیفیت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو وہ یقیناً روحانی ارتقاء کا باعث ہے۔ نماز وہی ہے‘ لیکن ادائیگی کی کیفیت کی وجہ سے نماز نماز میں فرق ہے۔

عباداتِ اربعہ: اسلامی تہذیب وتمدّن کی بنیاد

اس ضمن میں آخری بات یہ عرض کروں گا کہ یہ جو چار عبادات زیرِ مطالعہ حدیث میں بیان ہوئی ہیں‘ اس دنیا میں اسلامی معاشرے کی تنظیم کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ‘ ایتائے زکوٰۃ‘ صومِ رمضان اور حج بیت اللہ اسلامی شعائر ہیں اور اسلامی تہذیب وتمدن کی علامات ہیں۔ ان سے دنیا میں اسلامی تہذیب کا ڈھانچہ وجود میں آتا ہے۔ مساجد اسلامی شعائر میں سے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنی جامع مساجد نہیں ہونی چاہئیں جتنی ہم نے بنالی ہیں۔ مساجد اسلامی تمدن کی علامات بتمام وکمال تب بنیں گی جب اسلامی ریاست قائم ہوگی اور دارالحکومت کی جامع مسجد میں سربراہِ ریاست امام ہوگا۔ اسی طرح صوبائی دارالحکومت کی جامع مسجد میں گورنر خطبہ دے گا‘ اور اگر کسی چھوٹے علاقے کی مسجد ہے تو وہاں بھی اس علاقے کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر حکومت کی اجازت سے خطبہ دے گا۔ یہ تو ہم نے ایک ایک محلے میں تین تین جامع مساجد بنالی ہیں‘ ایک اہل حدیث کی‘ ایک بریلوی کی‘ ایک دیوبندی کی اور پھر لاؤڈ سپیکر کے ذریعے ایک دوسرے سے بلند آوازی کے ساتھ مقابلے ہو رہے ہیں۔ بہرحال اس سب کے باوجود مساجد کا وجود غنیمت ہے جن سے دین کا ایک ڈھانچہ قائم ہوتا ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن میں مسجد معاشرت کی تنظیم کی بنیاد ہے‘ بایں معنی کہ ایک علاقے میں پنج وقتہ نماز ہو رہی ہے‘ لوگ جمع ہوتے ہیں‘ پھر جب کوئی نمازی نہیں آتا تو لوگوں کو تشویش ہونی چاہیے کہ آج فلاں صاحب نہیں آئے‘ آؤ چل کر پتا کریں۔ ان مساجد کو تو معاشرتی رابطے (social contact) کا ذریعہ بننا چاہیے۔ یہ نہیں کہ نماز کے لیے آئے‘ نہ کسی کو دیکھا نہ کسی سے کچھ پوچھا‘ نہ کسی کی کوئی مزاج پُرسی کی‘ بس سلام پھیرا اور چلے گئے۔ نبی اکرم ﷺ تو نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ جاتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے۔ دراصل ہمارے ہاں مسجد کا نظام

ان ہی چیزوں پر مبنی ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ حج دنیا کا سب سے بڑا اجتماع ہے جو اس امت کی آفاقیت کا آج بھی سب سے بڑا مظہر ہے۔ اگرچہ آج اس کی روح موجود نہیں رہی' صرف ڈھانچہ رہ گیا ہے' لیکن پھر بھی یہ مسلمانوں کی آفاقیت کا ایک بہت بڑا نشان ہے ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'' امریکہ کا بہت بڑا مسلم لیڈر مالکوم ایکس (Malcom X) جب حج کے لیے گیا تھا تو بیت اللہ کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور وہ بے اختیار پکار اٹھا تھا کہ میں نے دنیا بھر میں کہیں ایسا منظر نہیں دیکھا کہ کالے' گورے' پیلے' لال' الغرض ہر رنگ وتہذیب کے لوگ سب ایک جگہ پر ہیں اور اتنا امن ہے کہ کوئی جھگڑا نہیں' کوئی لڑائی نہیں' کوئی فساد نہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ زیر مطالعہ حدیث تین حوالوں سے بہت اہمیت کی حامل ہے:
(۱) یہ حدیث ''عبادت'' اور ''عبادات'' کے تعلق کو واضح کرنے والی ہے۔ (۲) اس حدیث میں جن چار عبادات کا تذکرہ ہے وہ ارکانِ اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی روحانی ترقی کا زینہ بھی ہیں۔ (۳) یہی چار عبادات اسلام کے شعائر اور مظاہر بن کر معاشرے کی تنظیم کی بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
4

انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقتِ انسان

۳/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ (المؤمنون)

عَنْ اَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ﷺ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ :

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ......)) (۱)

''ابوعبدالرحمٰن، سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا اور وہ صادق اور مصدوق ہیں:

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں، اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں، اور

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم وذریته۔ وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیة خلق الآدمی فی بطن امه وکتابة رزقه وأجله۔

اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے......''

معزز سامعین کرام!

میں نے آپ کے سامنے امام یحیٰ بن شرف الدین النَّووی ﷫ کی مشہور کتاب ''اربعین'' کی چوتھی حدیث کا ابتدائی حصہ پڑھا ہے۔ اس میں ایک نہایت اہم موضوع ''حقیقت انسان'' زیر بحث آیا ہے' جسے قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت دین کے اعتبار سے ذروۃ السنام کہا جا سکتا ہے۔ یہ گویا tip of the iceberg ہے۔ چنانچہ اس موضوع کو قدرے تفصیل سے سمجھنے کے لیے ہم سورۃ المؤمنون کی چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ حدیث کے اس حصے سے اس اہم موضوع ''انسان کے تخلیقی مراحل اور حقیقت انسان'' کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے' جبکہ ان آیات مبارکہ میں اس موضوع کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور انسان کے تخلیقی مراحل کا مرحلہ وار تذکرہ کیا گیا ہے۔

قرآنی علمِ جنین پر جدید ماہرین کا تحیّر

قرآن مجید میں رحم مادر میں انسانی جنین کے ارتقاء کا ذکر' کہیں تفصیل سے اور کہیں اجمالی انداز میں' بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس حوالے سے میں آپ کے سامنے عہد حاضر میں ''علم جنین'' (Embryology) کے چوٹی کے دو پروفیسرز کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ہیں یونیورسٹی آف ٹورنٹو' کینیڈا کے ڈاکٹر کیتھ ایل مور' جن کی علم جنین کے موضوع پر کئی تصانیف ہیں اور ان میں سے دو کتابیں اکثر یونیورسٹیوں میں نصابی کتب (text books) کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں۔ دوسرے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے موجد ڈاکٹر رابرٹ ایڈورڈز ہیں ـــــ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا معاملہ یہ ہے کہ کبھی عورت کی ٹیوبز بند ہوتی ہیں جس کی وجہ سے اُس کے ہاں ولادت نہیں ہوسکتی اور بعض اوقات شوہر کا معاملہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر مردانگی کی قوت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ صاحبِ اولاد نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا راستہ نکالا گیا کہ شوہر کا نطفہ اور بیوی کی بیضہ دانی میں سے بیضہ لے کر' ان کی تخم ریزی (fertilization) ٹیسٹ ٹیوب میں

کرکے' پھر اسے رحم مادر میں plant کر دیا جاتا ہے اور اس کے ذریعے اولاد حاصل کی جاتی ہے۔ چنانچہ ٹیسٹ ٹیوب بے بیز دنیا میں اب عام ہیں اور اس طریقے کا موجد پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز ہے—— پروفیسر رابرٹ ایڈورڈز اور ڈاکٹر کیتھ ایل مور دونوں نے نہایت متحیّرانہ انداز میں گواہی دی ہے کہ چودہ سو برس قبل جب dissection اور جسم کو چیر پھاڑ کر دیکھنے کا کوئی رواج نہ تھا' طب ابھی بالکل ابتدائی stages میں تھی' خورد بین (microscope) بھی ایجاد نہیں ہوئی تھی' اُس دَور میں علم الجنین کا جو صحیح اندازہ اور رحم مادر میں انسانی جنین کی درجہ بدرجہ پرورش کی جو نقشہ کشی قرآن نے کی ہے وہ حیران کن حد تک ان معلومات سے مطابقت رکھتی ہے جو خورد بین کی ایجاد کے بعد حال ہی میں انسان کے علم میں آئی ہیں۔ پھر اس پر انہوں نے سعودی عرب جا کر لیکچرز بھی دیے جن کی ویڈیوز آج بھی آپ کو مل سکتی ہیں۔

انسان کے تخلیقی مراحل: قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید میں دو سورتوں' سورۃ الحج اور سورۃ المؤمنون کا ایک جوڑا ہے جس میں خاص طور پر علم الجنین اور رحم مادر میں انسانی جنین کے ارتقائی مراحل کا تفصیل سے تذکرہ ہے۔ سورۃ الحج میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ (آیت ۵)

''اے لوگو! اگر تمہیں (مرنے کے بعد) دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں کوئی شک ہے تو (ذرا اپنی تخلیق پر غور کرو کہ) ہم نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے' پھر اس سے نطفہ بنا کر' پھر اس سے علقہ بنا کر' پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی' تاکہ تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں۔ پھر ہم جس کو

چاہتے ہیں ایک میعادِ مقرر تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں' پھر ہم تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں' پھر تم اپنی پوری قوت (جوانی) کو پہنچتے ہو' اور تم میں سے کچھ (قبل از پیری) مر جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو (بڑھاپے کی) بدترین عمر کو بھی پہنچا دیے جاتے ہیں کہ (جہاں پہنچ کر) سب کچھ جاننے کے بعد وہ کچھ نہیں جانتے۔''

اس آیت میں بڑھاپے کی عمر کو ''اَرْذَلِ الْعُمُر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا وہ حصہ ہے جب وہ پھر سے بچہ بن جاتا ہے اور جو کچھ اس نے پوری زندگی سیکھا پڑھا ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جاتا ہے' حتیٰ کہ اس کی یادداشت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اب سورۃ المؤمنون کی ان آیات کی طرف آتے ہیں جو میں نے خطاب کے شروع میں تلاوت کی تھیں۔ ان میں پہلی آیت ہے: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ﴾ ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے''۔ سُلٰلَه کہتے ہیں کسی چیز کو کھینچ لینا۔ تلوار کو میان میں سے کھینچنے کے لیے بھی فعل سَلَّ يَسُلُّ استعمال ہوتا ہے۔ کسی چیز کا عرق نکالنے کا ایک نظام ہے کہ اس کو پانی میں ڈال کر' اس کے نیچے آگ جلا کر' اور ایک لمبے process سے گزار کر عرق کشید ہوتا ہے۔ یہاں فرمایا کہ ''ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے گارے کے کشید کردہ جوہر سے''۔ ﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ ''پھر اس کو ایک مضبوط (اور محفوظ) جگہ میں نطفہ بنا کر رکھا''۔ رحم مادر کی دیوار بڑی مضبوط ہوتی ہے اور وہ نطفہ اس کے اندر مضبوطی سے جما ہوا (embeded) ہوتا ہے۔ ﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ ''پھر ہم نے نطفے کو علقہ کی شکل دی''۔ وہ نطفہ جب بڑھتا ہے تو رحم مادر کی دیوار سے ابھر کر' bulge out کر کے لٹکنے لگتا ہے' اس لیے اس حالت کو ''عَلَقَة'' یعنی لٹکی ہوئی چیز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ ''پھر اسی علقہ کو ہم گوشت کا ایک لوتھڑا بنا دیتے ہیں'' ﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا﴾ ''پھر اسی لوتھڑے کے اندر ہڈیاں بنا دیتے ہیں'' ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ ''پھر ہم ان ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں'' ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ ''پھر ہم اسے اٹھاتے ہیں ایک اور ہی تخلیق پر''۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ

الْخَالِقِيْنَ﴿۱۴﴾ ''پس بہت بابرکت ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے۔''

حدیث کی تشریح

اس آیت میں ''خَلْقًا اٰخَرَ'' کا ذکر آیا ہے۔ یہ خَلْقًا اٰخَرَ کیا ہے؟ اس کا جواب اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث میں آیا ہے۔ حدیث کے راوی حضرت ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو کبارِ صحابہ اور فقہاءِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ ''ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بات بتائی اور (جان لو کہ جنہوں نے ہمیں بتایا) وہ صادق اور مصدوق ہیں''۔ یعنی وہ سچے ہیں اور ان کی صداقت پر اللہ گواہ ہے۔

اس روایت کے شروع میں ''وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ'' کے الفاظ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کیوں کہے؟ حالانکہ اور بھی متعدد روایات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہیں، لیکن کسی اور روایت میں تمہیداً یہ الفاظ نہیں آتے، تو پھر یہاں کیوں آئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت میں ایک ایسی بات سامنے آ رہی ہے جو اُس وقت تک انسان کی ذہنی سطح اور مادی معلومات کے اعتبار سے کچھ ناقابل فہم سی تھی۔ لہٰذا اس بات کو بیان کرنے سے پہلے خاص طور پر تاکید کے انداز میں کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو، یہ کہنے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، جو سچے ہیں اور اللہ نے ان کی صداقت کی تصدیق بھی کی ہے۔

حدیث کا متن ان الفاظ سے شروع ہو رہا ہے: ((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً)) ''تم میں سے ہر شخص کی تخلیق ہوتی ہے اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں'' ((ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ وہ علقہ کی شکل میں ہوتا ہے'' ((ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ)) ''پھر اتنا ہی عرصہ (یعنی چالیس دن) وہ ایک لوتھڑے کی شکل میں ہوتا ہے''۔ جب یہ چالیس + چالیس + چالیس = ایک سو بیس دن یعنی چار ماہ مکمل ہو جاتے ہیں: ((ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ)) ''پھر اُس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے'' ((فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) ''پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے۔''

حقیقتِ انسان

اب یہاں غور کیجیے کہ چودہ سو سال پہلے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ نے یہ بات فرمائی اور اُس وقت اگر لوگوں نے ((فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) سے مراد یہ لیا کہ فرشتہ اس بے جان گوشت کے لوتھڑے (مُضْغَة) میں جان ڈال دیتا ہے' تو اُس دور کی علمی سطح کے اعتبار سے یہ بات قابل فہم ہے۔ لیکن سائنس کی ترقی اور خوردبین کی ایجاد کے بعد ہماری آج کی علمی سطح اتنی ہے کہ ہم خوردبین کے ذریعے باریک سے باریک جرثومہ بھی دیکھ رہے ہیں—— انسان کے آغاز سے متعلق سورۃ القیامۃ میں آیا: ﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴾ ''کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا؟''— آج ہمیں معلوم ہے کہ منی کی بوند جو باپ کی طرف سے آ رہی ہے' اس میں بے شمار جرثومے (spermetozoa) ہوتے ہیں اور یہ جرثومے مردہ نہیں بلکہ زندہ وجود ہیں۔ مائیکروسکوپ کے نیچے آپ خود دیکھ لیجیے وہ آپ کو بھرپور جوش وخروش کے ساتھ دوڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اسی طرح ماں کا بیضہ (ovum) جو fallopian tube سے ہو کر چلا آ رہا ہے وہ بھی مردہ تو نہیں ہے بلکہ زندہ خلیہ (living cell) ہے۔ اب مرد کے جرثومے اور عورت کے بیضہ کے ملاپ سے رحم مادر میں انسان کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ﴾ (الدھر:٢) ''ہم نے انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا''—— مرد کا نطفہ اور عورت کا بیضہ مل کر جُفتہ (zygote) بن گیا اور یہ مردہ نہیں بلکہ زندہ ہے' اس لیے کہ زندگی تو آغاز سے چلی آ رہی ہے۔ پھر یہ جفتہ بڑھ رہا ہے' نشوونما پا رہا ہے اور یہ نشوونما پانا ہی زندگی کا ایک ثبوت ہے۔ لہٰذا ((فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) کا مطلب زندگی یا جان ڈالنا نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ زندگی تو آغاز ہی سے موجود ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہو گیا کہ یہاں ''روح'' سے مراد ''جان'' نہیں کچھ اور ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جو بدقسمتی سے آج بہت سے قرآن پڑھنے والوں اور دین کا مطالعہ کرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہاں ''روح'' سے کیا مراد ہے اور پھر اس سے ''حقیقتِ

انسان'' سمجھ میں آئے گی جسے میں نے ابتدا میں قرآن مجید کے فلسفے اور حکمت دین کے اعتبار سے ذروۃ السنام سے تعبیر کیا تھا — اصل میں انسان ایک مرکب وجود ہے' اس میں ایک مکمل حیوان بھی ہے اور ایک فرشتہ یعنی ایک روحانی وجود بھی ہے۔ یہ بات بہت خوبصورت انداز میں شیخ سعدیؒ نے کہی تھی:

آدمی زادہ طُرفہ معجون است

از فرشتہ سرشتہ وز حیواں

یعنی انسان کچھ چیزوں سے مل کر بنا ہے' اس مرکب میں فرشتہ بھی پیوست ہے اور حیوان بھی۔ انسان کے بارے میں یہ عظیم حقیقت ہے' جس کو اگر نہ سمجھا جائے تو حکمتِ قرآنی کے جو غامض اور عمیق پہلو ہیں وہ سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ انسان عقیدت اور اندھے یقین کی بنیاد پر ایسے مقامات سے گزر جائے گا' لیکن عقل (logic) کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہاں رکا جائے اور غور و فکر کا حق ادا کیا جائے۔

تخلیقِ کائنات کے مراحل

آج دنیا میں تخلیقِ کائنات (Creation of the Universe) کا جو تصور ہے اس میں یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی ابتدا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک' بابائے طبیعیات نیوٹن کے دور میں تخلیق کائنات کے حوالے سے یہ تصور تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی' مادہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور یہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد آئن سٹائن کے ذریعے دنیائے طبیعیات میں انقلاب عظیم آیا اور آج محققین کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ اس کائنات کا ایک آغاز (beginning) ہے اور انہوں نے اس کو Big Bang کا نام دیا ہے۔ یعنی اربوں سال پہلے ایک بہت بڑا دھماکہ ہوا اور پھر اس سے کائنات کا آغاز ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ اب یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک اختتام (end) بھی ہے' جسے قرآن ''اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی'' سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی یہ کائنات ہمیشہ کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک خاص معینہ مدت تک رہے گی اور اس کے بعد اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

Big Bang کے نتیجے میں حرات کا وہ گولہ وجود میں آیا جو بہت چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھا‘ جن کا درجہ حرارت ناقابل تصور حد تک بلند تھا اور یہ ذرات ایک دوسرے سے دُور بھاگتے تھے۔ یہ اس مادی دنیا کی شروعات کا پہلا مرحلہ تھا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان ذرات کی حرارت میں کمی آتی چلی گئی۔ پھر یہ ذرات تیزی سے حرکت کرتے ہوئے قریب آئے اور مختلف forms میں اکٹھے ہوئے تو کہکشائیں (galaxies) وجود میں آئیں۔ پھر یہ کہکشائیں ایک دوسرے سے دور بھاگتی رہیں۔ آج بھی یہ مانا جا رہا ہے کہ کائنات ابھی پھیل رہی ہے اور کہکشاؤں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اس کی بڑی پیاری مثال دی جاتی ہے کہ اگر آپ ایک غبارے کے اوپر کچھ نقطے (dots) لگا دیں‘ اور پھر اس غبارے کو آپ جتنا پھلائیں گے‘ ان نقطوں (dots) کے مابین فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی طرح ان کہکشاؤں کے درمیان فاصلے بڑھنے سے کائنات میں وسعت ہو رہی ہے۔ نظریہ توسیع کائنات (Theory of the Expanding Universe) کے حوالے سے اقبال نے کہا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکون!

قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے: ﴿يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ﴾ (فاطر:۱) ”وہ اپنی تخلیق میں وسعت کر دیتا ہے جس قدر چاہتا ہے۔“

کہکشائیں بننے کے بعد پھر وہ دور آیا کہ جب ان کے اندر ستارے اور سیارے بنے۔ ان ستاروں میں ایک ستارہ ہمارا سورج بھی تھا‘ جس کے اندر مزید ٹوٹ پھوٹ کے نتیجے میں اس کے سیارے وجود میں آئے۔ ان ہی سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری یہ زمین ہے۔ ابتدا میں یہ سورج کی طرح آگ کا کُرہ تھا لیکن آہستہ آہستہ یہ ٹھنڈا ہوا اور ٹھنڈا ہونے سے یہ سکڑ گیا۔ اس کی وجہ سے اس پر نشیب و فراز پیدا ہوئے۔ پھر اس میں سے جو بخارات نکلے انہوں نے زمین کے غلاف ”فضا“ (atmosphere) کی شکل اختیار کی۔ پھر اس فضا میں موجود گیسز ہائیڈروجن اور آکسیجن کے باہمی ملاپ (interaction) سے

پانی وجود میں آیا اور یہ پانی ہزار ہا برس تک زمین پر برستا رہا' جس سے سمندر وجود میں آئے۔ زمین ٹھنڈی ہونے سے اس پر خاک کی ایک تہہ پیدا ہوگئی جسے ''قِشرِ ارض'' (Crust of the Earth) کہا جاتا ہے۔ پھر اس خاک اور پانی کے امتزاج سے اس کرۂ ارضی پر حیات کا آغاز ہوا جو کروڑوں سال کے ارتقائی مراحل سے گزر کر اپنے آخری نتیجہ کو پہنچی' جو آج کے نظریے کے مطابق موجودہ انسان (Homo sapiens) ہیں۔

یہ میں نے آج کا نظریہ تخلیق آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس میں پہلے حصوں کے بارے میں تو اب کوئی اختلاف نہیں ہے' البتہ نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کے بارے میں اختلافات اب بھی ہیں۔ بہرحال یہ ایک نظریہ ہے۔ اگرچہ علم الحیات (Biology) کے میدان میں اس نظریہ ارتقاء کو من وعن قبول نہیں کیا گیا' لیکن اس کو ایک حقیقت کے اعتبار سے (as a matter of fact) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی سوچ' سوشل سائنسز اور ہر چیز میں ارتقاء کا تصور موجود ہے۔

آغازِ تخلیقِ کائنات سے پہلے ارواحِ انسانیہ کی تخلیق

آج کے اس نظریہ تخلیق میں حقیقت انسان کے حوالے سے ایک اہم بات کا تذکرہ موجود نہیں ہے' وہ یہ کہ اس Big Bang یعنی مادی کائنات کی شروعات سے پہلے بھی ایک دور ہے جسے سائنس نہ دیکھ سکتی ہے' نہ جان سکتی ہے' نہ اس تک اس کی پہنچ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے ایک حرف ''کُنْ'' سے ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا جس سے اس مادی کائنات کا آغاز ہوا' اسی طرح اس سے بہت پہلے اللہ تعالیٰ کے اوّلین حرفِ کُنْ سے ایک بہت لطیف نور پیدا ہوا۔ اس کو لطیف نور کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس مرحلہ پر اس میں نہ حرارت تھی اور نہ حرکت۔ پھر اس لطیف نور سے انسانی ارواح اور فرشتے پیدا کیے گئے۔ (واضح رہے کہ یہ اس عظیم دھماکے سے پہلے (Pre Big Bang) کا معاملہ ہے۔) ارواحِ انسانیہ اور فرشتے مادہ نہیں ہیں اور ان کا تعلق اس مادی کائنات (material universe) سے نہیں ہے ـــــ اُس وقت انسانی وجود موجود نہیں تھے' صرف ارواح تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس دنیا میں قیامت تک آنے

والے آخری انسان تک کی روح موجود تھی اور اُس وقت اللہ نے ان سے ''عہد الست'' لیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ (الاعراف:۱۷۲) ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں، ہم اس پر گواہ ہیں۔''

عہد لینے کا یہ واقعہ عالم ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب جو آدمی اس بات کو نہیں مانتا وہ کیسے سمجھے گا کہ کس سے اور کس وقت یہ عہد لیا گیا تھا؟ جدید دور کے ایک مفسّر نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ ''یہ عہد انسان کی تخلیق سے قبل عالم غیب میں لیا گیا تھا''۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کا یہ جملہ تو مہمل ہے، اس لیے کہ جو شے پیدا ہی نہیں ہوئی اس سے کیسے عہد لے لیا گیا؟ عہد اور معاہدہ ہوتا ہی ان کے درمیان ہے جو موجود ہوں اور پھر اس میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ میں بقائمی ہوش و حواس (full consciousness کے ساتھ) اقرار کرتا ہوں، عہد کرتا ہوں، معاہدہ کرتا ہوں۔ میرے توجہ دلانے پر انہوں نے تسلیم کیا کہ آپ کا موقف ٹھیک ہے کہ یہ عہد اجسادِ انسانیہ کی تخلیق سے قبل ارواحِ انسانیہ سے عالم ارواح میں لیا گیا تھا۔

یہاں وہ مشہور روایت بھی نوٹ کر لیجیے جو روحِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ))(۱) ''پہلی شے اللہ نے جو تخلیق کی وہ میرا نور تھا''۔ بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کے ہاں تو یہ روایت قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہے، لیکن اہلِ حدیث مکتبہ فکر، جو روایت اور سند پر زیادہ زور دینے والے ہیں، وہ اس حدیث کو تسلیم نہیں کرتے۔

عالمِ ارواح میں وقت کا کوئی تصور نہیں

عالمِ ارواح میں، جبکہ ابھی مادی دنیا (material world) کی شروعات نہیں ہوئی تھیں، جاری وقت (serial time) کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ ارواح میں جو کچھ ہوتا ہے اس میں وقت نہیں لگتا۔ صرف ایک حرف ''کُنْ'' سے تمام ارواح انسانیہ وجود میں آ گئیں۔ البتہ عالمِ خلق میں آ کر تخلیق کے مراحل میں وقت لگتا

(۱) شرح المواقف للسیوطی: ۱۲

ہے‘ جیسے آسمان اور زمین کے متعلق آتا ہے کہ یہ چھ دنوں میں پیدا کیے گئے‘ اور وہ دن ہمارے چوبیس گھنٹوں والے دن نہیں ہیں‘ بلکہ چھ ادوار ہیں۔ اسی طرح انسان کے نطفے سے لے کر ایک بچے کے مکمل ہونے تک نو مہینے لگتے ہیں۔ الغرض عالم خلق میں تو وقت لگتا ہے لیکن عالم ارواح میں وقت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جبریل کو عرشِ معلیٰ سے یہاں آنے میں کوئی وقت نہیں لگتا‘ اس لیے کہ فرشتے اس دور کی تخلیق ہیں جبکہ ٹائم ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ time and space کا تصور تو بگ بینگ کے بعد کا ہے۔ اسی طرح حرکت کا تعلق بھی وقت کے تصور کے ساتھ ہے۔ لہٰذا یہ ارواح انسانیہ اس دور میں پیدا کی گئیں جبکہ ابھی مادی کائنات کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور پھر ان کو ایک ’’کولڈ سٹوریج‘‘ میں رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد تنزلات اور ارتقاء کا لمبا سفر شروع ہوا۔

’’تنزلات‘‘ اور ’’ارتقاء‘‘ کی اصطلاحات فلسفہ میں ایک دوسرے کے متضاد سمجھی جاتی ہیں۔ قدیم فلسفیوں نے تخلیق کائنات کے بارے میں منطق کے زور پر اپنے تصورات پیش کیے اور عقولِ عشرہ‘ نُہ افلاک‘ تنزلاتِ ستہ اور تنزلاتِ خمسہ تجویز کیے۔ ان تصورات کے مطابق سب سے پہلے وجود باری تعالیٰ سے عقلِ اوّل وجود میں آئی۔ عقلِ اول سے پھر فلکِ اول اور پھر فلکِ ثانی وغیرہ —— لیکن ان تصورات کی کوئی دلیل نہ تو قرآن یا حدیث میں ہے اور نہ ہی سائنس ان کی تائید کرتی ہے۔

انسان کا مادۂ تخلیق ’’مٹی‘‘ اور جنوں کا ’’آگ‘‘

کائنات کی تخلیق کے آغاز کے بارے میں میری سوچ مطالعہ قرآن حکیم اور سائنس کی روشنی میں بنی ہے اور آپ کو اس پورے تصور اور سائنس کے درمیان مکمل ہم آہنگی نظر آئے گی۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے نور کی تخلیق ہوئی‘ جبکہ اس نور میں ابھی نہ حرارت تھی اور نہ حرکت‘ اور پھر اس نور سے ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کی تخلیق ہوئی۔ اس کے بعد Big Bang کے نتیجے میں شدید ترین حرارت رکھنے والے ذرات وجود میں آئے۔ اس دور میں جنّات پیدا کیے گئے۔ قرآن مجید جنّات کی تخلیق کے حوالے سے کہتا ہے: ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿١٤﴾ وَخَلَقَ الْجَآنَّ

مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴿۱۵﴾ (الرحمٰن) ''اسی نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا''۔ سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ﴿۲۷﴾﴾ ''اور ہم نے انسان کو سنے ہوئے گارے کی کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا۔ اور اس سے پہلے جنات کو بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا''۔ بادِ سموم اس ہوا کو کہتے ہیں جس میں آگ جیسی تپش ہو۔ سخت لُو خاص طور پر صحرا کی لُو سے آپ اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ اس حرارت سے جنات پیدا کیے گئے۔ یہ جنات اس زمین کی پیداوار نہیں ہیں، مٹی کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک لطیف تر شے سے بنے ہیں، جبکہ ہم انسان تو مٹی سے بنے ہیں، چاہے ارتقاء (evolution) کے لمبے process کے ذریعے بنے ہوں یا ہماری بلاواسطہ تخلیق (direct creation) ہوئی ہو، لیکن ہیں تو مٹی سے۔ اس بارے میں تو قرآن اور سائنس دونوں متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ سائنس بھی کہتی ہے کہ انسان کی تخلیق مٹی (crust of the earth) سے ہوئی ہے اور قرآن بھی کہتا ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ (المؤمن:٦٧) ''(اللہ ہی وہ ذات ہے) جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا''۔ سورۂ صٓ میں فرمایا: ﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ﴿۷۱﴾﴾ ''جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہ میں ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں مٹی سے''۔ سورۃ الانبیاء میں ہر ذی حیات کے منبع حیات کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ﴾ (آیت ۳۰) ''اور ہم نے بنایا ہر زندہ چیز کو پانی سے''— چنانچہ ہر شے میں حیات کا سرچشمہ اور منبع پانی ہے اور حیواناتِ ارضی، جن میں انسان بھی شامل ہے، کا مادۂ تخلیق مٹی ہے۔ سائنس کا بھی یہی نکتہ نظر ہے کہ زمین پر سمندروں کے وجود میں آنے کے بعد سمندر کے کناروں پر، دلدلی جگہوں پر یہ ہوتا تھا کہ کبھی پانی پیچھے ہٹ جاتا اور کبھی آگے آ جاتا۔ یہ تعامل کافی عرصہ چلتا رہا اور اس کے نتیجے میں وہاں اولاً غیر نامیاتی مرکبات (inorganic compunds) اور اس کے بعد نامیاتی مرکبات (organic compunds) وجود

میں آئے۔ اور بالآخر اسی کے اندر حیات کا جرثومہ (cell) ''امیبا'' کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد حیات کا مرحلہ وار ارتقاء ہوا اور اس کے بلند ترین مرحلے پر انسان کی تخلیق ہوئی۔ میں اِس وقت اس نظریے کی نہ تو تصدیق کر رہا ہوں اور نہ تردید' بس آپ کو اتنا بتا رہا ہوں کہ قرآن اور سائنس دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسان کی تخلیق مٹی اور پانی سے ہوئی ہے۔ البتہ سائنس اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ جسدِ آدمؑ کی تخلیق کے بعد خالقِ کائنات نے اس وجود میں اپنی روح میں سے پھونکا۔

اس کے بعد یہی سلسلہ ہر انسان کے تخلیقی مراحل میں دہرایا جاتا ہے۔ البتہ یہاں ایک خلیہ سے رحمِ مادر میں بچہ نو ماہ میں پروان چڑھتا ہے' لیکن ہوسکتا ہے کہ ابتدا میں ایک جرثومے سے انسان بننے تک کا معاملہ نو ملین سال میں ہوا ہو ـــــ اس جرثومہ کے ارتقاء کے مراحل وہی ہیں جو ماقبل بیان ہوئے' لیکن اصل یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ آغاز سے ہی اس میں حیات ہے' اس لیے کہ وہ ہر مرحلہ میں زندہ ہے۔ باپ کی طرف سے آنے والا نطفہ بھی زندہ ہے' ماں کی طرف سے آنے والا بیضہ بھی زندہ ہے' **عَلقہ** بھی زندہ ہے' **مُضغہ** بھی زندہ ہے۔ پھر مرد کے نطفے اور ماں کے بیضہ کے امتزاج سے وجود میں آنے والا جُفتہ (zygote)' جسے قرآن نے ''**نطفة امشاج**'' سے تعبیر کیا ہے' وہ بھی زندہ ہے۔ پھر جب ۱۲۰ دن ہو جاتے ہیں تو اب ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' جو عالمِ ارواح سے اس انسان کی روح (جو Big Bang سے بھی کہیں پہلے وجود میں آ چکی تھی) لا کر اس کی والدہ کے رحم میں اس کا جو ہیولا وجود میں آیا ہے' اس کے اندر ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ وجود انسان کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ ہے ''حقیقت انسان''۔

دو موتیں اور دو زندگیاں' کیسے؟

اس حوالے سے میں ایک عجیب بات آپ کے سامنے بیان کرنے لگا ہوں' آپ میں سے اکثر لوگوں کے لیے شاید یہ نئی بات ہو۔ قرآن مجید میں سورۃ المؤمن میں اہلِ جہنم کی ایک فریاد نقل کی گئی ہے کہ جہنمی لوگ کہیں گے:

﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ

سَبِیۡلٍ ⑪﴾

''اے ہمارے پروردگار! تو نے ہمیں دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تو اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟''

اب یہ دو مرتبہ مارنا اور دو مرتبہ زندہ کرنا کیا ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ سب سے پہلے عالمِ ارواح میں ہماری تخلیق ہوئی اور پھر ہم سلا دیے گئے ——موت اور نیند ایک ہی شے ہے اور یہ دونوں آپس میں بہنیں ہیں' اسی لیے نیند سے بیداری کے وقت کی جو دعا نبی اکرم ﷺ سے منقول ہے اس کے الفاظ یوں ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ''تمام شکر اور حمد و ثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے'' —— اس کے بعد ہماری اس دنیا میں آمد ہوئی اور ہم اس نیند سے بیدار ہو گئے۔ اس کے بعد پھر ہماری روح قبض کر لی جائے گی۔ اس حساب سے ہمارا دو مرتبہ مرنا اور دو مرتبہ زندہ ہونا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ

میرے نزدیک اس ضمن میں سب سے بڑا المیہ (the biggest tragedy) یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ڈارون کے ارتقاء کا فلسفہ چھا گیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم اپنے آپ کو صرف ایک حیوان سمجھتے ہیں اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اپنے آپ کو نسبتاً زیادہ ارتقاء یافتہ حیوان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جتنا فرق گدھے اور گھوڑے میں ہے بس اتنا ہی فرق گوریلا اور انسان میں سمجھا جاتا ہے کہ نوعیت کا فرق نہیں ہے' بس کمیت کا فرق ہے۔ اپنے آپ کو حیوان سمجھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم اپنی اس عظمت سے مستعفی ہو چکے ہیں جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک اور خلیفۃ اللہ قرار پایا تھا۔ پھر اس سب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں سارا سبق' ساری رہنمائی حیوانوں کی زندگی سے حاصل کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے یورپ میں باقاعدہ لٹریچر فروغ دیا جا رہا ہے کہ حیوانوں میں چونکہ ماں' بیٹی' بہن' بیوی کا کوئی فرق نہیں ہوتا ہے اس لیے انسانوں میں بھی محرمات کا کوئی تصور نہیں ہے' یہ تو خواہ مخواہ ہم انسانوں نے ایسے

قانون بنالیے ہیں اور ایسی پابندیاں اپنے اوپر عائد کر لی ہیں۔ اس سب کی وجہ وہی ہے کہ ہم نے اپنی عظمت کو بھلا دیا ہے اور اب ہمیں زندگی کا سارا سبق حیوانوں سے مل رہا ہے۔

انسان کے لیے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ میرا مادی وجود تو میرا حقیر سا پہلو ہے' جبکہ میری اصل حقیقت وہ روحِ ربانی ہے جو میرے اندر پھونکی گئی ہے۔ وہ روح ربّ العالمین کی طرف سے آئی ہے اور وہیں لوٹ جائے گی: انا للہ وانا الیہ راجعون ''بے شک ہم اللہ کے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹ جائیں گے''۔ جبکہ ہمارا یہ مادی وجود مٹی سے بنا ہے اور پھر مٹی ہی میں چلا جائے گا۔ عربی کا مقولہ ہے: كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ ''ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹ جاتی ہے''۔ روح وہاں سے آئی ہے وہیں جائے گی' جسد یہاں سے آیا ہے' یہیں رہ جائے گا۔ یہ ہے انسان کی حقیقت!

نظریہ ارتقاء کا مُوجِد ڈارون نہیں ہے

اس حوالے سے آپ ایک اور بات بھی نوٹ کر لیں کہ نظریہ ارتقاء اصل میں چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) کا نظریہ نہیں ہے۔ ارتقاء کو ڈارون کا نظریہ کہنا اور ڈارون کو اس کا موجد سمجھنا ایک بڑی غلطی ہے۔ جن لوگوں کو ان موضوعات سے دلچسپی ہو وہ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں کا ضرور مطالعہ کریں: (i) زندگی' موت اور انسان: آئینہ قرآنی میں (ii) ایجاد و ابداعِ عالم سے عالمی نظامِ خلافت تک' تنزلات و ارتقاء کے مراحل —— حقیقت یہ ہے کہ حیاتِ ارضی میں ارتقاء کا تصور قدیم یونانی حکماء کے ہاں بھی موجود تھا اور اس کا نہایت واضح نقشہ صدیوں پہلے مسلمان حکماء اور علماء بھی پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ فلسفہ ارتقاء ڈارون سے لگ بھگ چھ سو برس قبل مولانا روم کی شہرۂ آفاق اور زندۂ جاوید ''مثنوی'' میں واضح طور پر دو مقامات پر موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے بڑے حکماء میں سے ابن مسکویہ نے سب سے پہلے فلسفہ ارتقاء پیش کیا۔ ڈارون نے تو ارتقاء کی صرف توجیہہ کی ہے اور اس کا جو فلسفہ ہے وہ غلط ہے' وہ تو ثابت ہی نہیں ہو سکا۔ اس کا خاص میدان علم الحیات (Biology) ہے جس میں اس نے بہت محنت کی ہے' لیکن اس میں اس کا نظریہ مانا نہیں جاتا —— میں حیوانِ انسان کی تخلیق کی حد تک

نظریہ ارتقاء کا قائل ہوں ۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہر نئی نوع (species) کے لیے اللہ کا ایک نیا حرفِ کُنْ آتا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یٰسٓ) ''اس کے امر (کی شان) تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ فرمالیتا ہے تو (بس یہ) کہتا ہے: 'ہو جا' تو وہ ہو جاتی ہے۔''

روحِ ربانی' عظمتِ انسانی کا سبب

آج کے ہمارے اس خطاب کا حاصل یہ ہے کہ انسان ایک مرکب وجود کا حامل ہے' ایک اس کا مادی وجود ہے اور ایک اس کا روحانی وجود ہے۔ انسان اصل میں اس روحانی وجود کا نام ہے جس کے سامنے فرشتے جھکائے گئے' ورنہ مادۂ تخلیق کے اعتبار سے تو جِنّات ہم سے بہت اونچے ہیں کہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان کا وجود بہت لطیف ہے کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتے اور مختلف شکلیں اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ نظامِ شمسی میں بہت دور تک چلے جاتے ہیں' جبکہ ہم تو بڑے بڑے راکٹ بنا کر بھی بڑی مشکل سے چاند تک پہنچنے کا دعویٰ کر سکے ہیں' معلوم نہیں پہنچے بھی ہیں یا نہیں! اور وہ تو آسمانوں تک کی خبر لے آتے ہیں' اس لیے کہ وہ اس دور میں پیدا ہوئے ہیں جبکہ ابھی کہکشائیں وجود میں آ رہی تھیں۔ چنانچہ خلقت کے اعتبار سے جِنّ انسان سے بلند ہیں اور انسان اس اعتبار سے بہت پست ہے۔ یہی فرق تھا جس کی بنا پر عزازیل نامی جِنّ' جو بعد میں ابلیس اور شیطانِ لعین قرار پایا' نے آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ (صٓ)

''میں اس (آدم) سے بہتر ہوں' مجھے تو نے پیدا کیا آگ سے اور اسے پیدا کیا مٹی سے۔''

مٹی پستی کی شے ہے' جیسے اقبال نے جوابِ شکوہ میں کہا ہے ع ''شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں!'' ابلیس اس روحِ ربانی کو نہیں سمجھتا تھا جو اس آدم کی عظمت کی دلیل ہے اور جس کے عز و شرف کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات کی جانب منسوب کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ دو جگہ آیا ہے:

﴿فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۝﴾

(الحجر:۲۹۔ ص:۷۲)

''پھر جب میں اس (انسان) کی تخلیق مکمل کر دوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب تم سب گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں۔''

یہ بڑے گہرے مضامین ہیں اور بدقسمتی سے آج ہم ان چیزوں سے بہت دور چلے گئے ہیں' اسی لیے سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ﴾ (الحشر:۱۹) ''اور ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔''

آج ہم اپنی عظمت سے غافل ہیں۔ ہم تو مسجود ملائک ہیں' لیکن آج ہماری سوچ یہ ہے کہ ہم حیوانوں میں سے بس ایک حیوان ہیں اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ۝۝

حدیث
(4)

ایمان بالقدر

(تقدیر پر ایمان)

۱۰/اور ۱۷/اگست ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ —— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿۳﴾ (الاعلیٰ)

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ۚ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۲۳﴾ (الحدید)

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾ (التوبۃ)

وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾ (التکویر)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ ؓ قَالَ : حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقُ :

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ وَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ ، بِكَتْبِ رِزْقِهٖ ، وَاَجَلِهٖ ، وَعَمَلِهٖ ، وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيْدٌ ، فَوَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ ! اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ

حَتّٰی مَا یَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلاَّ ذِرَاعٌ ' فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ' فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ ' فَیَدْخُلُھَا ' وَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ' حَتّٰی مَا یَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلاَّ ذِرَاعٌ ' فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ' فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ ' فَیَدْخُلُھَا)) (۱)

''ابوعبدالرحمٰن' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا اور وہ صادق ومصدوق ہیں:

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں' اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں' اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعدازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے (یعنی فرشتہ کو) اس پیدا ہونے والے کے متعلق چار باتیں' رزق' عمر' عمل اور اس کے شقی (بدبخت) یا سعید (نیک بخت) ہونے کے متعلق' لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس قسم ہے اُس اللہ کی جس کے علاوہ کوئی سچا معبود نہیں! تم میں سے کوئی آدمی اہل جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اُس پر وہ سابقہ تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو وہ سابقہ تحریر اُس پر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔''

معزز سامعین کرام!

امام نووی رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''اربعین'' کی چوتھی حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ اس حدیث کے ابتدائی حصے پر گفتگو پچھلے خطاب میں ہو چکی ہے جس میں انسان کے تخلیقی مراحل کا تذکرہ ہے۔ اس کے ضمن میں ''حقیقتِ انسان'' جیسے اہم موضوع پر

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب خلق آدم وذریتہ۔ وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ و کتابۃ رزقہ و أجلہ۔

گفتگو کرتے ہوئے میں نے یہ واضح کیا تھا کہ اس دور میں سب سے بڑا مغالطہ یہ ہوا ہے کہ ''فَیَنْفُخُ فِیْهِ الرُّوْحَ'' میں روح کے معنی ''جان'' سمجھ لیے گئے ہیں۔ یہ اس دور کی بہت بڑی غلطی بلکہ محجوبیت ہے' بایں طور کہ جب عقل پر یہ پردہ پڑا ہو تو قرآن مجید کے بہت سے لطیف حقائق سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے۔ اس حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ روح ایک مستقل علیحدہ تشخص کی حامل شے ہے' وہ جان نہیں ہے' اس لیے کہ جان کا تعلق تو جسم اور عالمِ مادی سے ہے اور یہ جان تو حیوانات میں بھی ہے۔ بلکہ آج ہمیں معلوم ہے کہ عالمِ نباتات بھی زندگی کی ایک شکل ہے۔ گھاس کا ایک تنکا بھی جب تک اپنی جڑ کے ساتھ جڑا ہوا ہے زندہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے اندر نشوونما اور افزائش (growth) ہے' جو زندگی کی علامت ہے۔

اس ضمن میں' میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ کُل کی کُل ارواحِ انسانیہ' حضرت آدم علیہ السلام کی روح سے قیامت تک پیدا ہونے والے آخری انسان کی روح سمیت' اس عالمِ مادی کی تخلیق سے بہت پہلے پیدا کی گئی تھیں۔ ان ارواحِ انسانیہ اور ملائکہ کا مادۂ تخلیق ایک ہی ہے اور وہ ہے ''نور''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((خَلَقَ اللّٰهُ الْمَلَائِكَةَ مِنَ النُّوْرِ)) ''اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا''۔ اس ضمن میں ایک مشہور حدیث کا تذکرہ بھی آیا تھا جس کو سند کے اعتبار سے محدثین تو قبول نہیں کرتے لیکن اکثر مفسرین اور متکلمین نے اس کو حدیث تسلیم کیا ہے: ((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ)) ''پہلی شے اللہ نے جو تخلیق کی وہ میرا نور تھا''۔ یہاں نُوْرِیْ سے مراد رُوْحِیْ ہے' یعنی روحِ محمدیؐ وہ نورِ محمدیؐ ہے جو بگ بینگ سے بہت پہلے وجود میں آ چکا تھا۔ بگ بینگ سے تو مادی کائنات (material universe) کا آغاز ہوا' جبکہ ارواحِ انسانیہ اور فرشتوں کا تعلق عالمِ مادی اور عالمِ خلق سے نہیں' بلکہ عالمِ امر سے ہے۔

اس اعتبار سے میں نے سورۃ الاعراف کی آیت ۱۷۲ میں مذکور ''عہد الست'' کا حوالہ بھی دیا تھا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۛ شَهِدْنَا ۛ﴾ ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں' ہم اس پر گواہ ہیں''۔ اس آیت میں کس قدر اہتمام کے

ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم سب نے اس دنیا میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا۔ اور عہد لینے کا یہ واقعہ عالم ارواح میں وقوع پذیر ہوا تھا جبکہ انسانی جسم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔اب اگر یہی معلوم نہ ہو کہ انسانی ارواح سب کی سب پہلے پیدا کر دی گئی تھیں تو یہ بات کیسے سمجھ میں آئے گی کہ کس سے اور کس وقت یہ عہد لیا گیا تھا؟ اسی حوالے سے سورۃ الکہف میں بھی ایک بڑا پیارا جملہ آیا ہے۔روزِ قیامت جب پوری نوعِ انسانی اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے پیش ہوگی' اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (آیت ۴۸) ''تحقیق تم آ گئے ہو نا ہمارے پاس جیسے کہ ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی بار''۔اب اگر روح کے علیحدہ تشخّص اور عالمِ اَرواح میں ان ارواح کی تخلیق کو نہ مانا جائے تو اس آیت میں ''كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ'' کی تشبیہ بے معنی ہو جائے گی۔

حدیث کی تشریح

زیر درس حدیث کے ابتدائی حصہ پر تفصیلی گفتگو چونکہ گزشتہ نشست میں ہو چکی ہے' لہٰذا اب ہم اس حدیث کے اگلے حصے کا مطالعہ کرتے ہیں جس کا تعلق ایمان بالقدر یعنی تقدیر پر ایمان سے ہے جو فلسفہ وحکمت دین کے مشکل ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔

حدیث کے ابتدائی حصے کے آخری الفاظ یہ تھے: ((ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ)) ''پھر اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونک دیتا ہے''۔آگے فرمایا: ((وَيُؤْمَرُ بِاَرْبَعِ كَلِمَاتٍ)) ''اور اس (فرشتے) کو حکم ملتا ہے چار باتیں لکھنے کا'' ((بِكَتْبِ رِزْقِهٖ' وَاَجَلِهٖ' وَعَمَلِهٖ' وَشَقِيٌّ اَوْ سَعِيْدٌ)) ''اُس کے رزق' اُس کی عمر' اُس کے اعمال اور اُس کے بدنصیب یا خوش نصیب ہونے کے متعلق لکھنے کا''۔((فَوَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ غَيْرُهٗ!)) ''تو قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے'' ((اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ)) ''تم میں سے کوئی شخص جنت والوں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے''۔((فَيَسْبِقُ

عَلَيْهِ الْكِتَابُ)) تو اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے''۔((فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ' فَيَدْخُلُهَا)) ''پس وہ جہنمیوں کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے''۔((وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ)) ''اور (کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ) تم میں سے کوئی جہنمیوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے''۔ ((فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ)) ''پھر اس پر نوشتہ تقدیر غالب آ جاتا ہے''۔((فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ' فَيَدْخُلُهَا)) ''پھر وہ اہل جنت کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے۔''

اس حدیث کا جو متن ابھی ہم نے پڑھا ہے' یہ صحیح بخاری سے ہے۔ یہی حدیث ایک دوسری سند سے متفق علیہ بھی ہے' یعنی امام بخاری اور امام مسلم دونوں کا اس پر اتفاق ہے — قبل ازیں ہم ''حدیث جبریل'' کا مطالعہ کر چکے ہیں' جس کے کئی متن ہیں اور ہم نے جو متن اس ''اربعین نووی'' کے حوالے سے پڑھا وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث جبریل حضرت ابوہریرہ' حضرت ابن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ ان روایات میں ترتیب کا ایک فرق بھی ہم نے دیکھا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا پہلا سوال اسلام اور دوسرا سوال ایمان کے بارے میں ہے' لیکن ایک دوسری روایت میں ترتیب الٹی ہے کہ پہلا سوال ایمان اور دوسرا سوال اسلام کے بارے میں ہے۔ اس حوالے سے میں نے آپ کو ابتدا میں بتا دیا تھا کہ احادیث میں اتنا تھوڑا سا فرق ہو جانا کوئی بعید نہیں ہے۔ اس لیے کہ احادیث قرآن مجید کی طرح لفظاً محفوظ نہیں ہیں' البتہ معناً محفوظ ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں انسان کی صلاحیت کو دخل ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ میں جو بات ابھی کہہ رہا ہوں' تھوڑی دیر بعد اگر آپ اپنے نوٹس کا آپس میں موازنہ کریں تو آپ کے مابین اختلاف پایا جائے گا۔ بات بنیادی طور پر سب کی سمجھ میں آ گئی ہو گی' لیکن جب آپ اس کی تعبیر کریں گے تو فرق ہو جائے گا۔ اس حد تک احادیث میں بھی فرق ہو

جانا کوئی بعید نہیں ہے اور نہ ہی یہ ہمارے لیے کوئی تشویش کا باعث ہے۔ چنانچہ زیرِ مطالعہ حدیث کے اور بھی متن ہیں جنہیں ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے اس اصل مسئلہ کو سمجھ لیا جائے کہ ایمان بالقدر آخر ہے کیا!

'ایمان بالقدر' ایک مشکل مسئلہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا' یہ مشکل ترین مسائل میں سے ہے۔ اس حوالے سے تین باتیں نوٹ کر لیجیے: (۱) یہ تقدیر کا مسئلہ سمجھ میں تو آ سکتا ہے' لیکن (۲) بیان میں نہیں آ سکتا۔ اور (۳) اگر اس پر بحث ہو جائے تو یہ الجھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مسئلہ سمجھ میں ہی نہ آئے تو پھر ایمان بالقدر ہمارے ایمانیات میں شامل نہیں ہونا چاہیے' اس لیے کہ یہ تو تکلیف مالا یطاق ہو جائے گی کہ جس بات کو سمجھنے کی ہمارے اندر استطاعت نہیں ہے' اس کو ماننے کا ہمیں حکم دیا جا رہا ہے ——— ایک ہے سمجھ میں آنا اور ایک ہے کسی چیز کی تفصیل' جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تفاصیل۔ اللہ کی ذات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے' اس لیے اس کے بارے میں تو ہمیں سوچنے سے بھی روک دیا گیا ہے' جبکہ اللہ کی صفات ہماری سمجھ میں آتی ہیں' اسی لیے کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور کرو' لیکن ذاتِ خداوندی پر کبھی غور نہ کرنا' اس لیے کہ اس سے فتنوں میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ حضرت مجذوبؒ کا ایک بڑا خوبصورت شعر ہے:

تُو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا　　　بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے!

یعنی اللہ تعالیٰ دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ اللہ کی ذات کو کون سمجھے گا؟ اگر کسی نے ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے تو گمراہی ہی گمراہی ہے۔ آپ اپنے تصور سے کوئی خدا بنا لو گے' حالانکہ وہ خدا تو نہیں ہے آپ کی قوتِ تصور کی تخلیق ہے۔ اس طرح اگر آپ اپنے بنائے ہوئے اس نقشے کو پُوج رہے ہیں تو آپ اللہ کو نہیں' کسی اور کو پُوج رہے ہیں۔

’ایمان بالقدر‘ ایمان کا جزوِلازم ہے

سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ ایمان کیا ہے۔ حدیث جبریل میں مَا الْاِیْمَانُ کے جواب میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) ’’(ایمان یہ ہے) کہ تو ایمان رکھے اللہ پر‘ اس کے فرشتوں پر‘ اس کی کتابوں پر‘ اس کے رسولوں پر‘ آخرت کے دن پر اور اچھی اور بری تقدیر پر‘‘۔ لہٰذا تقدیر کے خیر وشر پر ایمان لانا ایمان کا جزوِلازم ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسے سمجھ میں آنا چاہیے‘ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ جیسے ہم پل صراط کے بارے میں کہتے ہیں کہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے ایسا ہی ایمان بالقدر کا معاملہ ہے کہ ع ’’ہشدار کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را!‘‘ یعنی ہوشیار ہو جاؤ کہ اس وقت تمہارا راستہ تلوار کی دھار کے اوپر سے ہے۔ ذرا بھی بے احتیاطی کی تو یہ تلوار کی دھار تمہیں کاٹ کر رکھ دے گی۔ اس اعتبار سے جب ہم بیان کی کوشش کرتے ہیں تو اِدھر اُدھر پھسل جانے کا امکان ہوتا ہے۔ خاص طور پر اگر ہم اس معاملے میں بحث میں پڑ جائیں تو پھر یہ بہت بڑے فتنے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

تقدیر پر بحث ومباحثہ کی ممانعت

اس حوالے سے ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ فرماتے ہیں: خَرَجَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِی الْقَدْرِ ’’ایک روز رسول اللہ ﷺ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے اور اس وقت ہم تقدیر کے بارے میں جھگڑ رہے تھے‘‘۔ یعنی اس وقت ہم تقدیر کے معاملے پر بحث ومباحثہ میں تھے۔ فَغَضِبَ حَتّٰی اِحْمَرَّ وَجْھُہٗ ’’تو آپؐ غصہ میں آ گئے (اور غصہ بھی اتنا شدید تھا کہ) آپؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا‘‘ کَاَنَّمَا فُقِیَٔ فِیْ وَجْنَتَیْہِ الرُّمَّانُ ’’(ایسے لگ رہا تھا) جیسے آپ کے گالوں پر سرخ انار کا رس ٹپکا دیا گیا ہے‘‘۔ یعنی غصہ کی وجہ سے آپؐ کے گالوں پر اتنی سرخی آ گئی تھی۔ فَقَالَ: ((اَبِھٰذَا اُمِرْتُمْ)) ’’پس آپؐ نے فرمایا: ’’کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ (کہ تم تقدیر کے بارے میں بحث کرو)‘‘ ((اَمْ بِھٰذَا اُرْسِلْتُ

اِلَیْکُمْ))''یا کیا میں اس کام کے لیے تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں؟''((اِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ))''جان لو کہ تم سے پہلی اُمتیں ہلاک ہوئیں اس بات پر کہ انہوں نے اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کیا''۔((عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ اَنْ لَّا تَنَازَعُوْا فِيْهِ))(۱)''میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں آپس میں بحث و مباحثہ مت کرو''۔اب آپ میرے وہ تین جملے ذہن میں لائیے جو میں نے کچھ دیر پہلے کہے تھے کہ ایمان بالقدر جب ایمانیات میں داخل ہے تو یہ سمجھ میں تو آ سکتا ہے لیکن بیان میں آنا مشکل ہے' اور اگر اس پر بحث و مباحثہ ہو جائے تو پھر یہ ایک بڑا فتنہ ہے۔

اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بات کو سمجھنے کے لیے اس معاملے میں تھوڑی سی گفتگو تو ہم کریں گے۔دعا ہے کہ مجھے بھی بیان میں اللہ عزوجل کی طرف سے توفیق میسر آ جائے اور کوئی لفظ اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے اور بات بالکل متوازن سامنے آ جائے اور آپ کو بھی اس میں انشراحِ صدر اور انشراحِ ذہن حاصل ہو جائے۔

لفظ''تقدیر'' کی تفہیم

میں نے ابتدا میں جو آیات پڑھیں ان میں اوّل سورۃ الاعلیٰ کی ابتدائی آیات ہیں:﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ①﴾''تسبیح کرو اپنے اُس ربّ کے نام کی جو بلند و بالا ہے''۔﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ②﴾''جس نے پیدا کیا اور پھر نوک پلک سنواری''۔ تخلیق اور تسویہ یہ دو الگ الگ مراحل ہیں' جس کو آپ اس مثال سے آسانی سے سمجھ سکیں گے کہ کسی عمارت کا ڈھانچہ (structure)''تخلیق'' ہے اور اس کی تزئین و آرائش (finishing)''تسویہ'' ہے۔﴿وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ③﴾''اور وہ کہ جس نے پہلے تقدیر معین کی پھر ہدایت دی''۔یہ آیت ہمارے آج کے موضوع''ایمان بالقدر'' کے حوالے سے بہت اہم ہے۔سب سے پہلے اس لفظ''قَدَّرَ'' کو سمجھئے۔قدر سے ایک لفظ ''قدرت'' بنتا ہے جس کے معنی اختیار اور طاقت کے ہیں۔''قدر'' کے لفظی معنی ہیں: کسی شے کی قدر و قیمت۔جب یہ لفظ بطور فعل آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے: کسی

(۱) سنن الترمذی' ابواب القدر' باب ما جاء فی التشدید فی الخوض فی القدر۔

شے کی قدر و قیمت کا تعین کرنا (to evaluate)۔قرآن مجید میں یہ لفظ ایک سے زائد مرتبہ آیا ہے' مثلاً: ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾(الحج:٧٤)''ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہیں جانی جیسے کہ اس کی قدر کا حق تھا''۔ہم یہ تو کہہ دیں گے کہ وہ ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہے' ہر چیز پر قادر ہے' لیکن وہ کتنا قدیر ہے؟ یہ ہمارے علم میں نہیں آ سکتا۔اس لیے کہ ہمارے ذہن کی ترازو گویا سنار کی ترازو کی مانند ہے جس میں تولے اور ماشے تلتے ہیں' ٹنوں سریا نہیں تولا جا سکتا۔اس حوالے سے نبی آخر الزماں ﷺ کی ایک دعا کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ)) ''اے اللہ! ہم تیری معرفت حاصل نہ کر سکے جیسا کہ تیری معرفت کا حق ہے'' ((وَمَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ)) ''اور ہم تیری عبادت نہیں کر سکے جیسا کہ تیری عبادت کا حق ہے''۔اب دیکھئے کہ یہ حضور ﷺ فرمارہے ہیں' تا بہ دیگراں چہ رسد! میں اور آپ کس گنتی میں آئیں گے! اسی حوالے سے ایک بڑا عمدہ نکتہ ملاحظہ ہو کہ میدانِ حشر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لِوَاءُ الْحَمْدِ يَوْمَئِذٍ بِيَدِي))(1) ''اُس دن اللہ کی حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا''۔حضور ﷺ کا نام محمد بھی ہے' احمد بھی ہے' حامد بھی ہے' محمود بھی ہے۔یعنی یہ سارا معاملہ حمد کے گرد ہی گھومتا ہے' تو اس اعتبار سے قیامت کے دن دربارِ الٰہی میں اللہ کی حمد کا جھنڈا بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوگا۔اب وہ دربارِ الٰہی کیا ہوگا' یہ تو ہم سمجھ نہیں سکتے' البتہ کبھی امیر خسرو نے کہا تھا ؎

خدا خود میرِ محفل بود اندر لا مکاں خسرو
محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم!

اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے!

لفظ ''قدر'' کے حوالے سے جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ اس سے ایک تو لفظ ''قدرت'' بنا ہے اور ایک کسی شے کی قدر و قیمت۔کسی شے کا اندازہ مقرر کر دینا بھی قدر ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھی ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔مشکوٰۃ شریف میں ''کتاب

(1) سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب فی فضل النبی ﷺ۔

الایمان'' کا ایک پورا باب ''باب الایمان بالقدر'' کے عنوان سے ہے' اور اس کی پہلی حدیث مسلم شریف کی روایت ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حضرت عمرو بن العاص سردارانِ قریش میں سے تھے۔ آپؓ ایک بڑے سیاست دان اور بڑے بہادر انسان تھے' ان کے بیٹے عبداللہؓ سے یہ روایت مروی ہے —— اس حوالے سے بڑی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ باپ اور بیٹے کے مزاج میں بُعد المشرقین تھا' بایں طور کہ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جنگجو' سیاست دان اور بڑے سرداروں میں سے تھے جبکہ حضرت عبداللہ انتہائی زاہد اور عابد تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ یہ پوری پوری رات نوافل پڑھتے اور ہر روز روزہ رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپ ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا: ((یَا عَبْدَ اللّٰہِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو!'' آپؓ نے کہا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ''جی ہاں' یارسول اللہ''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ......))[1] ''ایسا مت کیا کرو'' —— یہی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما صحیح مسلم کی اس حدیث کے راوی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((کَتَبَ اللّٰہُ مَقَادِیْرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ اَنْ یَخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ بِخَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَۃٍ))[2] ''اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی مقداریں اور تقدیریں لکھ دی تھیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال قبل''۔ یہ ہے قدر یا تقدیر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اندازہ ہزاروں سال پہلے مقرر کر دیا تھا۔

لفظ ''کتاب'' سے مراد اللہ کا علم قدیم ہے!

زیر مطالعہ حدیث میں ((فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ)) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں ''کتاب'' سے مراد کیا ہے؟ اس حوالے سے سورۃ الحدید کی آیت ۲۲ ملاحظہ ہو جو میں نے خطاب کے آغاز میں پڑھی تھی: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك علیك حق۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب حجاج آدم و موسیٰ علیہما السلام۔

اَنۡفُسِکُمۡ﴾ ''نہیں پڑتی کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں''۔ زمین پر سیلاب اور زلزلے جیسے حوادث کا آ جانا' اسی طرح تمہاری جان میں کسی تکلیف کا آ جانا' مثلاً ٹھیک ٹھاک تھے' کوئی معمولی سی تکلیف ہوئی تو چیک اپ سے معلوم ہوا کہ کینسر ہے اور وہ بھی کافی بڑھ چکا ہے یا اسی طرح کی کوئی اور تکلیف یا مصیبت ﴿اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ﴾ ''مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں''۔ ﴿اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیۡرٌ ﴿۲۲﴾﴾ ''(یہ تمہیں مشکل نظر آئے گا مگر) یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے''۔ اس آیت میں تقدیر کے حوالے سے ''کتاب'' کا لفظ آیا ہے' اسی طرح قرآن مجید میں اور بھی کئی مقامات پر کتاب کا لفظ آیا ہے تو اس کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے جس میں سب کچھ ہمیشہ سے موجود اور لکھا ہوا ہے اور اس میں سے کچھ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔

یہاں ایک بات جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے' حادث نہیں ہے۔ بعض گمراہ فرقوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی شے جب ظہور پذیر ہوتی ہے تو اللہ کے علم میں آتی ہے۔ اسے ''بدع'' کہتے ہیں۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' یہ شانِ خداوندی سے بہت بعید ہے۔ وہ تو عالِم ماکان و ما یکون ہے۔ جو بھی کچھ تھا' یا آج تک رہا ہے اور جو بھی کچھ ہوگا وہ سب کچھ اس کے علم میں ''آنِ واحد'' میں موجود ہے۔

آنِ واحد کے لفظ کو میرے ایک تجربے کے حوالے سے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ۶۸۔۱۹۶۷ء میں' میں نے پہلا ہوائی سفر لاہور سے کراچی کا کیا تھا۔ اُس وقت فوکر فرینڈ شپ چلا کرتا تھا جو ایک چھوٹا سا طیارہ تھا جو زیادہ بلندی پر نہیں جاتا تھا۔ میں اس سفر کے دوران کھڑکی سے دیکھتا جاتا تھا کہ اس وقت ہم کہاں پہنچ گئے ہیں اور اب جو روشنیاں نظر آ رہی ہیں یہ کس شہر کی ہیں۔ اوکاڑہ' ساہیوال اور کچھ دوسرے شہر گزرنے کے بعد ایک دم میں نے لودھراں' بہاولپور اور سمہ سٹہ کی روشنیاں بیک وقت دیکھیں۔ تب مجھے یہ خیال آیا کہ جب میں ٹرین کے ذریعے کراچی جاتا ہوں تو لودھراں پہنچ کر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی بہاولپور آدھ گھنٹے بعد آئے گا' اس طرح وہ میرے لیے مستقبل کی

شے ہے اور جب میں بہاولپور پہنچتا ہوں تو لودھراں میرے لیے ماضی بن جاتا ہے اور آدھے گھنٹے کے بعد آنے والا سمہ سٹہ میرے لیے مستقبل بن جاتا ہے۔ یعنی ایک وقت میں ایک ماضی ہوتا ہے اور دوسرا مستقبل' لیکن فوکر کی اس تھوڑی سی بلندی پر میں بیک وقت لودھراں' بہاولپور اور سمہ سٹہ دیکھ رہا ہوں۔ اب اس بلندی کو اربوں کھربوں سے ضرب دے دیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس بلند مقام سے دیکھ رہا ہے جہاں اُس کے مشاہدے اور علم میں ماضی اور مستقبل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے آنِ واحد کا مطلب۔ اس کے لیے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ''کتاب'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ کا علم قدیم ہے جس میں سب کچھ ہمیشہ سے لکھا ہوا موجود ہے' جو پورا ہو کر رہتا ہے۔ عقائد کے حوالے سے ہم اسے ''تقدیر'' کہتے ہیں۔

تقدیر کے دو پہلو

تقدیر کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو ''مَا اَصَابَ عَلَى الْاِنْسَانِ'' سے متعلق ہے کہ جو مصیبت انسان پر آتی ہے وہ علمِ الٰہی میں ہمیشہ سے ہے۔ جیسے میں نے ابھی سورۃ الحدید کی آیت پڑھی: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ﴾ ''نہیں پڑتی تم پر کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ لکھی ہوئی ہوتی ہے''۔ اس حوالے سے ایک حدیث ملاحظہ ہو جو جناب ابن الدیلمی تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے اور اس کا آخری حصہ کچھ یوں ہے: ((وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ''اور تو جان لے اس بات کو کہ جو چیز تم پر آئی ہے وہ ہرگز ٹلنے والی نہیں تھی''۔ یعنی تم کوئی تدبیر بھی کر لیتے' کوئی قدم بھی اٹھا لیتے' تب بھی وہ تو آنی ہی آنی تھی۔ ((وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) ''اور جو چیز تم سے چھوٹ گئی وہ تم کو کسی صورت نہیں ملنی تھی''۔ مثلاً کسی نوکری کا اشتہار آیا' آپ نے بھی درخواست دی لیکن وہ نوکری آپ کو نہیں ملی تو آپ نے سوچا کہ کاش میں نے فلاں سے سفارش کرالی ہوتی تو یہ نوکری مجھے مل جاتی۔ ہرگز نہیں' جو چیز چھوٹ گئی ہے وہ چھوٹ ہی جانی تھی۔ اس میں قطعاً کوئی تدبیر' کوئی سفارش' کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر میں

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَوْ مُتَّ عَلٰی غَیْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ))[1] ''اور اگر تمہاری اس کے سوا کسی اور کیفیت (عقیدہ) پر موت واقع ہوگئی تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے''۔ یہ ہے تقدیر کا وہ مفہوم جس کا تعلق ''مَا اَصَابَ عَلَی الْاِنْسَانِ'' سے ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کے اوپر وارد ہو رہا ہے اس کے ضمن میں تقدیر کا مفہوم یہ ہے کہ جو ہوا ہے وہ تو ہونا ہی تھا' اس میں تو کسی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ لیکن جب انسان کی سوچ کے برعکس کچھ ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاش اگر میں یوں کر لیتا تو یہ نہ ہوتا' بس یہی سوچ ایمان بالقدر کے منافی ہے۔ اس لیے کہ جو ہوا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں پہلے سے طے تھا اور اسے تو ہونا ہی تھا' تمہاری کوئی تدبیر اس میں کارآمد نہیں ہونی تھی۔ چنانچہ حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((وَاِنْ اَصَابَكَ شَیْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ اَنِّیْ فَعَلْتُ كَانَ كَذَا وَكَذَا وَلٰكِنْ قُلْ قَدَّرَ اللّٰهُ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))[2] ''اور اگر تم پر کوئی مصیبت واقع ہو جائے تو یہ نہ کہو کہ کاش میں ایسا ایسا کر لیتا بلکہ تم کہو کہ یہ تو اللہ نے میرے لیے مقدر کیا تھا اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے' اس لیے کہ لفظ ''لَوْ'' (کاش) سے شیطانی عمل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔''

تقدیر کا دوسرا پہلو ''مَا يَفْعَلُ الْاِنْسَانُ'' سے متعلق ہے۔ یہاں آ کر تقدیر کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہو جاتا ہے کہ آیا اعمال وافعال کے حوالے سے انسان کے پاس کوئی اختیار ہے کہ نہیں؟ (Do I have any free choice?) یا ہر شے پہلے سے طے شدہ ہے؟ اس حوالے سے بعض روایات بھی ہیں جو اس کی تائید کرتی ہیں کہ ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے' لکھی ہوئی ہے۔ اربعین نووی کی زیر درس حدیث گویا اس کی مثال ہے کہ ہر چیز پہلے سے لکھ دی گئی ہے اور رحم مادر ہی میں لکھ دیا گیا تھا کہ یہ بدبخت ہے یا سعادت مند۔ اب ایک شخص ساری عمر نیکی کے کام کرتا رہا اور آخری وقت میں آ کر کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ اس نے اہل جہنم کے سے کام شروع کر دیے اور وہ جہنمی ہو گیا۔ یا ایک شخص

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنة' باب فی القدر۔
(۲) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوة وترك العجز والاستعانة باللّٰه۔

ساری عمر جہنمیوں کے سے کام کرتا رہا اور آخری وقت میں آ کر کوئی ایسی توفیق ملی' کوئی ایسا معاملہ ہو گیا کہ توبہ کر لی اور اہل جنت کے سے اعمال شروع کر دیے اور اس طرح وہ جنتی ہو گیا—— تقدیر کا یہ دوسرا پہلو کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کی قدرت کس قدر ہے' یہ ہمارے ہاں فلسفہ کا بڑا مشکل موضوع ہے اور اسی کا نام ''جبر وقدر'' ہے۔

انسان اپنے افعال میں نہ مجبورِ محض ہے اور نہ قادرِ مطلق

ہمارے ہاں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو اس پر قناعت کرتے ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے کہہ دیا' اس سے آگے مین میخ نہیں نکالتے۔ یہ لوگ محفوظ راستے پر ہیں۔ لیکن بہرحال انسان کو اللہ نے عقل بھی دی ہے اور یہ عقل سوالات اٹھاتی ہے اور زیادہ ذہین انسان سوچتے ہیں' غور وفکر کرتے ہیں' بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں دو طبقے ہو گئے' جبر یہ اور قدریہ۔ جبر یہ فرقے کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے اور اسے کوئی اختیار حاصل نہیں' جبکہ دوسرا نقطہ نظر اس کے بالکل برعکس ہے کہ انسان قادر مطلق ہے۔ اور جو چاہتا ہے کرتا ہے' وہ اپنے فیصلے میں مختار مطلق ہے' اس نقطہ نظر کے حاملین کو قدریہ کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر مجھے شعر ہونے کے اعتبار سے بہت خوبصورت لگتا ہے ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

اس شعر میں انسان سے ہر قسم کی پابندی کی نفی کر دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ کے احکام کا پابند ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ پابندی اصل میں اللہ کے احکام کی ہے' لیکن تقدیر کی پابندی سے بھی انسان پوری طرح آزاد نہیں ہے۔ یہ سمجھ لینا کہ تقدیر کی پابندی صرف نباتات و جمادات ہی کا معاملہ ہے' مبالغہ ہے' اور ظاہر بات ہے کہ کوئی شاعر' چاہے وہ علامہ اقبال ہی ہو' مبالغے سے نہیں بچ سکتا۔ سورۃ الشعراء میں عام شعراء کی جو صفات بیان ہوئی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ مبالغہ کرتے ہیں:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ﴿۲۲۶﴾
''اور شاعروں کی پیروی تو گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں اور کہتے وہ کچھ ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔''

یہ بات علامہ اقبال پر بھی چسپاں ہوتی ہے' اس لیے کہ ان کا فکر جتنا بلند تھا ان کا عمل اس کے اعتبار سے بہت ہی نیچے اور بہت ہی کم تھا۔ بہرحال اس شعر میں انہوں نے جو بات کہی ہے وہ صحیح نہیں ہے' اس لیے کہ انسان بہت سے اعتبارات سے مجبور ہے۔ سب سے پہلے انسان کے اندر ایک ''تقدیر نوعی'' ہے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا اڑتی پھرتی ہے لیکن انسان نہیں اُڑ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انسان نے جہاز ایجاد کر لیا جو پانچ پانچ سو آدمی اور سینکڑوں من سامان لے کر اڑتا ہے لیکن انسان خود تو نہیں اڑ سکتا۔ یہ تقدیر نوعی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع (species) کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے اور وہ اس اندازے میں ہی رہے گا' اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس کے علاوہ انسان میں ایک ''تقدیر شخصی'' ہے۔ بعض اوصاف وصفات انسان کو وراثتاً ملتے ہیں' جن کے بارے میں اس کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہ بات پہلے بھی مانی جاتی تھی اور آج سائنسی انداز میں اسے یوں کہا جاتا ہے کہ یہ چیز آپ کے جینز (genes) میں ہے اور جینز کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ جو اوصاف وصفات آپ کو اپنے والدین کی طرف سے ملتے ہیں وہ آپ کی شخصیت کو فیصلہ کن طرز پر ڈھال دیتے ہیں۔ اب یہ جینز بھی ایک طرح کی پابندی ہے۔ دوسرے یہ کہ خاص طور پر ماں کی گود اور گھر کے ابتدائی ماحول کے جو اثرات انسانی شخصیت کے اوپر مرتسم ہوتے ہیں وہ بھی بڑے مستقل اور پختہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں یعنی نوع اور شخصیت کو آپس میں ضرب دے لیجیے تو اس سے ایک شے تیار ہوتی ہے جس کو قرآن ''شاکلہ'' کہتا ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا﴿۸۴﴾﴾ (بنی اسرائیل)
''کہہ دو کہ ہر شخص اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ سو تمہارا پروردگار اس شخص سے خوب واقف ہے جو سب سے زیادہ سیدھے راستے پر ہے''۔ شاکلہ کہتے ہیں شکل دینے

والی شے کو۔ مثلاً آپ نے لوہا ڈھال کر کوئی خاص پرزہ بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ کو اس کا سانچہ (pattern) بنانا پڑے گا' پھر لوہے کو پگھلا کر اس میں ڈالیں گے تو جیسا سانچہ ہوگا لوہا ویسی ہی شکل اختیار کرے گا۔ اسے شاکلہ کہتے ہیں۔ یہ شاکلہ ہر انسان کا مختلف ہے اور انسان اس سے باہر نہیں جا سکتا' اس کے اندر اندر ہی اس کی جدوجہد (struggle) ہو گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کو کوئی اختیار (free choice) حاصل نہیں ہے۔ آپ کو اختیار حاصل ہے' لیکن وہ اختیار اپنی حدود کے اندر کام کرے گا' اس سے باہر نہیں جا سکتا۔

اس بات کو مختلف احادیث میں حضورﷺ نے بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ایک حدیث بڑی اہم ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنُ)) ''انسان معدنیات کی طرح ہیں''۔ آپ جانتے ہیں کہ معدنیات میں سے جس کچ دھات (ore) کو صاف کر لیا جائے وہی دھات خالص شکل میں حاصل ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سونے کی ore سے سونا بنے گا اور چاندی کی ore سے چاندی ہی بنے گی' سونا تو نہیں بن سکتا' اسے جتنا چاہیں صاف کر لیں۔ اس اعتبار سے نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((اَلنَّاسُ مَعَادِنُ)) ''انسان بھی معدنیات کی طرح ہیں''۔ یعنی ان کی ore بھی مستقل بالذات ہے۔ آگے فرمایا: ((خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا))[1] ''ان میں جو جاہلیت کے دور میں بہترین تھے وہی اسلام میں بھی بہترین ہیں جبکہ ان کے اندر دین کا فہم آ جائے''۔ یعنی اگر دورِ جاہلیت میں وہ ore سونے کی تھی تو اسلام نے اسے صاف کر کے خالص سونا بنا دیا اور اگر وہ چاندی کی ore تھی اور اسلام نے اس کو صاف کر دیا تو وہ نکھرتی ہوئی' چمکتی ہوئی چاندی بن گئی۔ البتہ اس میں ایک اضافہ کیا حضورﷺ نے کہ ایسا تب ہوگا جب ان کے اندر دین کا فہم داخل ہو جائے۔ اب آپ دیکھیں کہ اسلام لانے سے پہلے بھی بہترین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی بہترین حضرت ابو بکرؓ

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ...﴾

ہی ہیں۔ حضور ﷺ کو نبوت ملنے سے پہلے بھی بہترین خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ تھیں اور آپؐ کی نبوت پر ایمان لانے کے بعد بھی بہترین خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہی ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور حدیث حضرت ابودرداء ؓ سے مروی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک روز حضور ﷺ کے پاس تھے اور ہم سوچ رہے تھے کہ دنیا میں کیا کیا پیش آنے والا ہے۔ اس دوران حضور ﷺ نے ہم سے ایک بات کہی: ((اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْا)) ''اگر تم یہ سنو کہ کوئی پہاڑ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے تو مان لینا''۔ ((وَاِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خَلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا))[1] ''اور اگر تم سنو کہ کوئی شخص اپنی جبلت سے بدل گیا ہے' تو کبھی نہ ماننا''

ایمان بالقدر کی اہمیت

ایمان بالقدر کی اہمیت کے حوالے سے ایک اور حدیث ملاحظہ کیجیے کہ تقدیر پر ایمان کس قدر لازم ہے۔ ایک تابعی جناب ابن دیلمی ؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ وسوسے پیدا ہوئے تو میں نے اس کے بارے میں جاننے کے لیے جو بھی کبار صحابہؓ اس وقت بقید حیات تھے' ان سب سے ملاقات کی۔ سب سے پہلے میں حضرت اُبی بن کعب ؓ کے پاس گیا (جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا ہے: ''میرے صحابہؓ میں قرآن کا سب سے بڑا عالم اُبی بن کعب ہے۔'') ان کے علاوہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے پاس گیا (جو اربعین نووی کی زیر درس حدیث کے راوی ہیں اور فقہاء صحابہ میں سے ہیں۔) پھر میں حذیفہ بن یمان ؓ اور آخر میں زید بن ثابت ؓ کے پاس گیا۔ ان سب نے درج ذیل بات کہی' جبکہ زید بن ثابتؓ نے اس بات کو مرفوعاً نقل کیا' یعنی یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں بیان کر رہا بلکہ یہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ((لَوْ اَنَّ اللّٰهَ عَذَّبَ اَهْلَ سَمَاوَاتِهٖ وَاَهْلَ اَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ)) ''اللہ تعالیٰ اگر تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں کو عذاب دینا چاہے تو وہ عذاب دے سکتا ہے' بغیر اس کے کہ ہم کہیں کہ وہ ظالم

(۱) مسند احمد' کتاب من مسند القبائل' باب من حدیث ابی الدرداء عویمر' ح ۲۶۲۲۷۔

ہے''۔ ظاہر ہے تمام زمین والوں اور آسمان والوں میں نیکوکار بھی آ گئے۔ یہ اصل میں ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جو اہلِ سنت والجماعت اور معتزلہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ معتزلہ کے طرز پر اہلِ تشیع کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے' جبکہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اللہ پر کوئی شے واجب نہیں ہے۔ اللہ کا اختیار مطلق ہے' وہ جو چاہے کرے۔ چنانچہ وہ جب چاہے کسی ظالم کو معاف کر سکتا ہے اور جب چاہے کسی نیک آدمی کو عذاب دے سکتا ہے: ﴿يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (البقرۃ) ''پھر وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهُ خَيْرًا لَهُمْ مِنْ اَعْمَالِهِمْ)) ''اور اگر اللہ ان (تمام آسمان والوں اور تمام زمین والوں) پر رحم کرے تو اُس کی رحمت یقیناً لوگوں کے اعمال سے بہت بالا ہے''۔ یعنی اس کی رحمت بہت بلند و برتر ہے' وہ جو چاہے کرے۔ وہ اگر ابوجہل کو بخش دے یا کسی انتہائی نیک شخص کو عذاب دے تو کون اعتراض کر سکتا ہے؟ آگے فرمایا: ((وَلَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ)) ''اور اگر تم اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اسے قبول نہیں کرے گا جب تک کہ تم تقدیر پر ایمان نہیں رکھو گے''۔ حدیث کے آخری حصہ کا ذکر ماقبل بھی ہو چکا ہے۔ ((وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ)) ''اور تم جان لو کہ جو چیز (مصیبت یا تکلیف) تم پر واقع ہوئی ہے وہ ٹلنے والی تھی ہی نہیں''۔ یعنی وہ تو اللہ تعالیٰ کے علم قدیم کے اندر پہلے سے لکھی ہوئی موجود تھی اور وہ تو آنی ہی آنی تھی۔ ((وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) ''اور جو چیز تم سے چھوٹ گئی وہ تمہیں ملنی ہی نہیں تھی''۔ آخر میں فرمایا: ((وَلَوْ مُتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ))(۱) ''اور اگر اس عقیدے کے سوا کسی اور پر تمہاری موت واقع ہوئی تو تم جہنم میں داخل ہو گے''۔ یہ ہے ایمان بالقدر کی اہمیت۔

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب فی القدر۔

ایمان بالقدر کی وضاحت

اب میں تقدیر کے اس مشکل مسئلہ کو انگریزی کی دو اصطلاحات کے حوالے سے واضح کروں گا۔ ایک ہے preknowledge یعنی کسی چیز کا پہلے سے علم ہونا اور ایک ہے predetermination یعنی کسی شے کا پہلے سے طے پا جانا۔ ان دونوں میں خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کے علم قدیم کو جبر مستلزم نہیں ہے' بایں معنی کہ اس کے علم میں ہے کہ آپ یہ کام کریں گے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ وہ کام اس کے جبر کے تحت کر رہے ہیں۔ میں اس کی ایک سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں۔ آپ کسی بچے کے سامنے کوئی کھلونا رکھتے ہیں تو آپ کو تقریباً سو فیصد یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کھلونے کی طرف متوجہ ہوگا' اسے اٹھائے گا' لیکن ہوسکتا ہے کہ بچہ اُس وقت کسی اور دھن میں ہو اور وہ اس کھلونے کی طرف توجہ نہ کرے۔ اور اگر وہ اسے اُٹھا بھی لیتا ہے تو اُس نے آپ کے مجبور کرنے سے نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے اٹھایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا جو اندازہ مقرر کیا ہوا ہے وہ اندازہ (جسے تقدیر کہا جاتا ہے) اللہ کا علم قدیم ہے جو کبھی غلط ثابت نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ وہ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْم ہے۔ اب اگر preknowledge اور predetermination کے اندر فرق کر لیا جائے تو معاملہ سمجھ میں آ جائے گا کہ انسان اپنے افعال میں مجبور نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جو چیز لکھ دی گئی ہے وہ تو ہو کر رہے گی' لیکن اُس کے کرنے میں آپ پر کوئی جبر نہیں ہے۔

ایمان بالقدر کے ثمرات

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس عقیدۂ تقدیر کے کیا کیا سبق ہیں' اس کے کیا کیا ثمرات ہیں اور کتنی بڑی بڑی نعمتیں اس میں پوشیدہ ہیں۔ سورۃ الحدید کی یہ آیت ہم قبل ازیں پڑھ آئے ہیں:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾٢٢

''نہیں پہنچتی کوئی مصیبت نہ زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم اسے ظاہر کر دیں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

اب اس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ اس سے اگلی آیت میں بیان ہوا ہے:﴿لِکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَاۤ اٰتٰکُمۡ ؕ﴾ ''تا کہ تم رنج وغم نہ کیا کرو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہی اور اترایا نہ کرو اس چیز پر جو اللہ تمہیں دے دے''۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی تکلیف یا مصیبت آ گئی تو فوراً مایوس ہو گیا' بددل ہو گیا' افسردہ وآزردہ ہو گیا۔ اس سے بھی آگے جھنجھلاہٹ ہوئی کہ کیوں ہوا' کیسے ہوا' نہیں ہونا چاہیے تھا۔ فرض کیجیے کہ آپ پر کوئی تکلیف کسی دوسرے شخص کے ذریعے سے آئی ہے تو اس پر آپ کو غصہ آئے گا اور انتقامی کیفیات پیدا ہوں گی۔ یہ سب کی سب کیفیات صرف اس ایک سوچ سے ختم ہو جاتی ہیں کہ یہ تو اللہ کی طرف سے تھا اور یہ ہونا ہی تھا۔ اب یہ غم وغصہ' رنج وصدمہ' مایوسی (frustration) اور جھنجھلاہٹ' سب کا سب ختم ہو گیا —— یہاں میری یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اس دور میں جو ذہنی بیماریاں ہمارے اندر اور خاص طور پر کھاتے پیتے لوگوں میں بہت زیادہ عام ہو رہی ہیں بلکہ ہو چکی ہیں' ان میں اصل دخل انہی کیفیات کو ہوتا ہے۔ اب اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو رنج وغم کی یہ ساری کیفیات ختم ہو جائیں گی اور انسان ذہنی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے گا۔

اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی نے آپ پر زیادتی کی ہے تو آپ بدلہ نہ لیں۔ اگر کسی نے آپ پر زیادتی کی اور آپ انتقام لینے پر قادر ہی نہیں ہیں تو آپ ''قہرِ درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق اندر ہی اندر پیچ و تاب کھائیں گے' البتہ اگر آپ انتقام پر قادر ہیں تو آپ کے سامنے دو راستے (options) ہیں۔ چاہے تو آپ اسے معاف کر دیں اور چاہے تو آپ اس سے بدلہ لے لیں۔ اب دیکھئے' قرآن حکیم فطرتِ انسانی سے بہت قریب تر اور بہت متوازن کتاب ہے کہ اس

میں ان دونوں کا جواز اور ان دونوں کی حکمت موجود ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا:
﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (التغابن) ''اور اگر تم معاف کر دو' اور بخش دو' اور درگزر سے کام لو تو یقیناً اللہ بھی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے''۔ ایسا رویہ اختیار کرنے سے انسان کو روحانی ترقی حاصل ہوگی۔ لیکن اس میں ایک اندیشہ بھی ہے کہ اُس شخص میں شرارت کرنے کی ہمت مزید بڑھ جائے گی۔ ایک شخص نے آج آپ کو تھپڑ مارا ہے اور آپ نے بھی جوابی تھپڑ رسید کر دیا تو آئندہ کے لیے اسے ہوش آ جائے گا' اور اگر آپ اسے معاف کر دیتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ کل کسی اور کو تھپڑ مار دے۔ اس اندیشہ سے بچنے کے لیے ''قصاص'' یعنی بدلہ لینے کا معاملہ ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (البقرة:۱۷۹) ''اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے''۔ قصاص کو زندگی قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا کا نظام قصاص کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اس قصاص ہی کا ایک نظام ہے جو ہم نے اپنے طور پر قائم کر رکھا ہے۔ پولیس' تھانے' عدالتیں اور پھانسی کے تختے سب اسی لیے تو ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو بدمعاش' شریر اور غنڈے آئے دن کسی نہ کسی کو تنگ کرتے رہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے ہاں کرپشن کی وجہ سے یہ چیزیں اب اتنی مؤثر نہیں رہیں' لیکن بہرحال یہ نظام تو اسی لیے بنایا گیا تھا کہ اس سے ان جرائم کی روک تھام ہوگی۔ اب اگر کسی شخص نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو آپ کے پاس معاف کرنے اور انتقام لینے کے دونوں آپشن ہیں۔ آپ کو اس شخص پر زیادہ غصہ اس وقت آئے گا جب آپ یہ سمجھیں کہ اس نے اپنی مرضی سے یہ کیا ہے' لیکن جب آپ کے علم میں ہوگا کہ ایسا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا ہی تھا تو آپ کا غصہ اتنی شدت کا نہیں ہوگا۔ بہرحال اس شخص نے یہ زیادتی کی ہے لہٰذا آپ اس سے انتقام لینے میں حق بجانب ہیں۔

اس حوالے سے میں ایک واقعہ سنایا کرتا ہوں کہ ایک درویش یہ کہتے ہوئے جا رہا تھا: ''جو ربّ کرے سو ہو' جو ربّ کرے سو ہو!'' ایک شخص نے اسے پتھر مار دیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو پتھر مارنے والے نے کہا: کیا دیکھ رہے ہو؟ جو ربّ کرے سو ہو! اُس

درویش نے کہا کہ مجھے پتھر تو اللہ کے حکم سے ہی لگا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں بیچ میں منہ کالا کس کا ہوا ہے؟ یعنی وہ کون ہے جس نے اپنے لیے اللہ کا غصہ' اللہ کا عذاب کمایا ہے! بہرحال چونکہ درمیان میں کوئی شخص ذریعہ بن گیا ہے اس لیے آپ اس سے بدلہ لے سکتے ہیں۔

مؤمن سے مطلوب: تقدیر پر یقینِ کامل

سورۃ التوبہ کی جو آیت میں نے خطاب کے آغاز میں آپ کو سنائی اس کا پس منظر سمجھ لیجیے۔ جب حضور ﷺ نے غزوۂ تبوک کا ارادہ کیا اور اعلانِ عام کر دیا کہ ہم سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ کے لیے جا رہے ہیں' اس لیے تمام مسلمان چلیں۔ چنانچہ اس نفیرِ عام کی بدولت آپؐ کی حیاتِ دنیوی کا سب سے بڑا یعنی تیس ہزار کا لشکر آپ کے جلو میں تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ شدید گرمی تھی' قحط کا عالم تھا اور کھجور کی فصل مکمل تیار تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اگر لوگ چلے جائیں تو فصل خراب ہو جائے گی' گل سڑ جائے گی۔ ظاہر بات ہے کہ کھجور کے بلند و بالا درخت کے اوپر چڑھ کر کھجوریں اتارنا عورتوں کے کرنے کا کام تو نہیں ہے۔ ان سخت حالات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شدید ترین امتحان ہو گیا اور منافقین نے کہا کہ ہوش کے ناخن لو' کیا تم اس شدید گرمی اور قحط کے عالم میں شہنشاہِ روم سے ٹکرانے جا رہے ہو' کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ تو اس کا جواب زیرِ مطالعہ آیت میں نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے دلوایا گیا:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾﴾ (التوبة)

''کہہ دو کہ ہم پر کوئی مصیبت واقع نہیں ہو سکتی مگر وہی جو ہمارے ربّ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے' وہ ہمارا مولیٰ ہے' اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔''

ایمان والوں نے منافقین کو یہ جواب دیا کہ اللہ ہی ہمارا دوست ہے' وہ ہمارا پشت پناہ اور ہمارا ولی ہے۔ وہ جو کرے ہمیں قبول ہے ؏ ''سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تُو خنجر آزمائی!

یعنی اللہ کی طرف سے جو بھی آئے وہ ہمارے لیے خوش آئند ہے' چاہے ہمیں وقتی طور پر ناگوار محسوس ہو یا وہ جسمانی طور پر تکلیف دہ ہو۔ اسی کا نام تسلیم و رضا ہے' یعنی اللہ کی تقدیر پر راضی رہنا اور کوئی شکوہ وشکایت نہ ہونا' نہ اللہ سے اور نہ کسی اور سے۔ اسی کیفیت کا نام نفس مُطمئنّہ ہے۔ جیسے تیز سے تیز آندھی بھی مضبوط چٹان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اسی طرح وہ شخص جس کا اللہ پر اور اللہ کے علم قدیم پر ایمان ہو وہ بھی ان مصائب میں نہیں ڈگمگائے گا۔

انسان اپنے افعال میں کتنا آزاد اور کتنا مجبور ہے؟

''جبر و قدر'' کی بحث ہمارے ہاں متکلمین کے درمیان بہت عرصہ سے چلی آرہی ہے لیکن یہ معاملہ حل نہیں ہو سکا۔ میں اس حوالے سے ہلکی سی کوشش کر رہا ہوں' اس لیے کہ آج سائنس کی ترقی کی وجہ سے بہت سی چیزیں سمجھانی آسان ہو گئی ہیں۔ اس حوالے سے اجمالی گفتگو قبل ازیں ہو گئی ہے اور میں نے اقبال کا شعر بھی آپ کو سنایا تھا:

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند!

یہ شعر اپنے اصل کے اعتبار سے ٹھیک ہے کہ بندۂ مؤمن کے لیے اصل پابندی صرف اللہ کے احکام کی ہے' لیکن یہ کہنا کہ اس کے علاوہ کوئی اور پابندی نہیں ہے' یہ درست نہیں ہے' اس لیے کہ انسان بہت سے اعتبارات سے مجبور ہے۔ مثلاً میں اگر ہندوستان میں پیدا ہوا تو اس میں میرا کوئی اختیار (choice) تو نہیں تھا' اللہ تعالیٰ مجھے انگلستان میں بھی پیدا کر سکتا تھا۔ اس طرح مجھے جو شکل وصورت ملی ہے' جو رنگت ملی ہے اس میں بھی میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ (given) ہیں۔ تو اس معاملے میں آپ اپنے جینز (genes) میں رہنے پر مجبور ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: ''One can not grow out of his skin'' یعنی کوئی شخص اپنی کھال

(چمڑی) سے تو باہر نہیں آ سکتا۔ آپ فربہ ہوتے چلے جائیں تو وہ کھال بھی پھیلتی چلی جائے گی اور آپ کھال سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اس کو ''تقدیر نوعی'' کہتے ہیں۔

ایک ہے ''تقدیر شخصی'' کہ زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں' ماں کی گود میں' اور گھر کے ابتدائی ماحول میں جو اثرات نفسیاتی طور پر مرتب ہوتے ہیں وہ مستقل ہوتے ہیں۔ اب تقدیر نوعی اور تقدیر شخصی کو آپس میں ضرب دینے سے ایک شاکلہ وجود میں آتا ہے۔ اس لفظ کے حوالے سے تفصیلی گفتگو قبل ازیں ہو چکی ہے ـــــ اس ضمن میں یہاں ایک اور بات نوٹ کریں کہ شاکلہ کے حوالے سے جدید دور کے ماہرین نفسیات میں سے میکڈوگل کو بہت بڑا دھوکہ لگا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی شخصیت پوری کی پوری صرف اسی ایک اصول پر مبنی ہے: ''no free choice'' یعنی انسان کو اپنے افعال میں کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ انسان کا یہ سمجھنا کہ یہ میں خود کر رہا ہوں' محض دکھاوا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمہارے جینز میں تھا' تمہاری ابتدائی تعلیم اور تربیت کے اندر تھا اس لیے تم یہ کر رہے ہو اور اس میں تمہارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لیکن قرآن اس نظریے کی نفی کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس شاکلہ (pattern) کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو ایک اختیار ملتا ہے: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ③﴾ ''یقیناً ہم نے انسان کو راہ دکھا دی اب وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا (یہ اس کا اختیار ہے)''۔ اب ظاہر بات ہے کہ راستہ چننے کا اختیار انسان کو ہے اور اِس اختیار کے اعتبار سے انسان یا تو موردِ الزام ٹھہرے گا یا اجر و ثواب کا مستحق ہوگا' یعنی شکر کی روش اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملے گا اور اگر کفر یا کفرانِ نعمت کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ملے گی۔

واضح رہے کہ انسان اگرچہ اس شاکلہ سے باہر نہیں نکل سکتا' لیکن اس کے اندر رہتے ہوئے وہ مجبور محض بھی نہیں ہے۔ قرآن میں کتنی مرتبہ یہ بات آئی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ''اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی وسعت کے مطابق مکلف بناتا ہے''۔ اب کس میں کتنی وسعت ہے؟ کس کا شاکلہ کیسا ہے؟ کس کو کیسے جینز ملے تھے؟ کس کو ماحول کیسا میسر آیا تھا؟ یہ ساری چیزیں اللہ کے علم میں ہیں اور اس کے

حساب سے ہی اللہ تعالیٰ انسان کا محاسبہ کرے گا۔ یہ اندھے کی لاٹھی نہیں ہے کہ ایک پیمانے کے اوپر سب کو جانچا جائے بلکہ ہر ایک کا اس کی وسعت اور قدرت کے حساب سے فیصلہ ہوگا۔ ایک شخص میں قدرت زیادہ تھی مگر اُس نے کم کیا تو وہ فیل ہو جائے گا اور اگر ایک شخص میں قدرت بہت کم تھی اور اس نے تھوڑا سا کر دیا اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم کیا تو وہ کامیاب ہو جائے گا' اس لیے کہ اس میں قدرت ہی کم تھی اور اس کے شاکلہ میں اس سے زیادہ کی وسعت تھی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں میزانِ عمل کے بارے میں کہیں بھی دو پلڑوں کا ذکر نہیں ہے' بلکہ یہ فرمایا گیا ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩ وَمَا اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝١٠ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١﴾ (القارعہ)

''پس جس کے (اعمال کا) وزن بھاری ہوگا تو وہ دل پسند عیش میں ہوگا' اور جس (کے اعمال کا) وزن ہلکا ہوگا تو اس کا ٹھکانہ 'ہاویہ' ہے۔ اور تمہیں کیا معلوم 'ہاویہ' کیا ہے؟ آگ ہے دہکتی ہوئی!''

یوں سمجھئے کہ وہ ترازو ایک لٹکنے والی ترازو (spring balance) ہے جس میں دو پلڑے نہیں ہوتے بلکہ اس میں چیز نیچے لٹکا دی جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اتنا وزن ہے۔ قیامت کے دن بھی شاکلہ کے اعتبار سے انسان کا حساب ہوگا۔ تو جس کا عمل اپنے شاکلہ کے اعتبار سے کم رہ گیا تو وہ ﴿وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨﴾ میں شمار ہوگا اور اگر اس نے اپنے شاکلہ کے اعتبار سے تقاضے پورے کر دیے تو اس کا شمار ﴿فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨﴾ میں ہوگا۔

ایمان بالقدر کا تقاضا: اذنِ ربّ اور توفیقِ ربّ کے بغیر کچھ نہیں ہوگا!

تقدیر کے حوالے سے میں نے یہ عرض کیا کہ اس سے انسان کا خوف ختم ہو جاتا ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' سوائے اس کے کہ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جو اللہ کے علم میں ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔ اللہ میرا مالک' میرا آقا' میرا دوست ہے اور میری مصلحتوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہے۔ میں تو اپنی نگاہ کی محدودیت (short

sightedness) کی وجہ سے کسی چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھ لیتا ہوں' حالانکہ اصل کے اعتبار سے وہ میرے لیے بری ہوتی ہے اور جسے میں برا سمجھ رہا ہوتا ہوں درحقیقت وہ میرے لیے اچھی ہوتی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۲۱۶﴾﴾ (البقرۃ) ''اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو اپنے لیے نقصان دہ سمجھو حالانکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کو تم پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے''۔ تقدیر پر ایمان لانے سے ایک تو خوف ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا تقدیر سے انسان میں ایک توکل پیدا ہوتا ہے کہ جب تک اللہ کا اذن نہ ہو میں کر بھی کچھ نہیں سکتا اور اللہ کا یہ اذن اس کے قدیم علم کی بنیاد پر ہے۔

قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اللہ کے علم کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ رَبِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ﴿۹۲﴾﴾ (ھود) ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو میرے ربّ کا علم اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے''۔ اب اگر میں یہ سمجھوں کہ میں اپنی کوشش اور محنت سے کوئی کام کر سکتا ہوں تو یہ بھی اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے' اس لیے کہ میں ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے اللہ کی قدرت اور علم سے باہر تو نہیں جا سکتا۔ اس پہلو سے یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے علاوہ کسی اور پر توکل مت کرو۔ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۲۹﴾﴾ ''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہ جو اللہ رب العالمین چاہے''۔ یعنی صرف تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ اسی کو ہم ''توفیق'' کہتے ہیں۔ ایک اذنِ ربی ہے۔ آپ نماز پڑھنے جانا چاہتے ہو' اس ارادہ پر آپ کو ثواب مل جائے گا۔ اب اگر اللہ نہ چاہے تو آپ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح اگر آپ چوری کرنا چاہتے ہیں تو یہ آپ کی choice ہے اور ظاہر بات ہے اس پر آپ کی پکڑ ہوگی' اس لیے کہ چوری کا فیصلہ آپ کا اپنا ہے ـــــ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص نیکی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے اس کے لیے اللہ عزوجل کی طرف سے راستے آسان کر دیے جائیں گے: ﴿فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰى﴿۷﴾﴾

''پس اس کو ہم آسان طریقے کی توفیق دیں گے''۔ اور جو برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے اللہ اسے آہستہ آہستہ سختی میں پہنچا دے گا: ﴿فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ⑩﴾ (اللیل) ''پس ہم اس کے لیے سختی کا راستہ آسان کر دیں گے۔''

الغرض جب انسان کو یہ یقین آ جائے کہ اذنِ رب اور توفیق رب کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا تو پھر اسی سے توکل جنم لیتا ہے۔ مثلاً اگر آپ نے رات کو فیصلہ کیا کہ صبح آپ نے سفر کرنا ہے اور آپ کے پاس سارے اسباب و وسائل موجود ہیں۔ گاڑی کی بھی آپ نے چیکنگ کروالی ہے' پٹرول کی ٹینکی بھی فل ہے' اس سب کے باوجود اگر آپ نے سمجھا کہ میں چلا جاؤں گا تو آپ دھوکے میں ہیں' فریب میں ہیں۔ سورۃ الکہف میں اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ㉓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ ''ہرگز کبھی مت کہنا کہ میں یہ کام کل ضرور کروں گا مگر یہ کہ اگر اللہ نے چاہا''۔ انگریزی میں کہتے ہیں: There is many a slip between the cup and the lip دودھ کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارا خیال ہے کہ جب میں چاہوں گا اسے پی جاؤں گا' لیکن اس دودھ کے پیالے کو ہاتھ سے ہونٹوں تک آنے میں بہت سے مراحل طے کرنے ہیں۔ اس کے راستے میں نامعلوم کتنی مادی قوتیں موجود ہیں اور ان میں سے کوئی ایک بھی رکاوٹ ڈال دے تو وہ دودھ کا پیالہ آپ کے ہونٹوں تک نہیں پہنچ پائے گا۔

درحقیقت یہ تقدیر کا دوسرا پہلو ہے' لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ محنت نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں' بلکہ آپ امکانی حد تک جِدّوجُہد کریں اور کبھی یہ نہ سمجھیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے آزاد ہو جائیں گے اور جو جی چاہے کر لیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ عقیدۂ تقدیر ہمارے لیے سب سے بڑی نعمت ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے بس ایک فارمولا کافی ہے کہ ہر چیز اللہ کے علم قدیم میں ہے' لیکن پہلے سے طے شدہ نہیں ہے اور انسان کو ﴿اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا﴾ میں سے کوئی بھی راستہ چننے کا اختیار حاصل ہے۔ تبھی تو یہ جزاوسزا کا سارا معاملہ ہے۔ قرآن مجید کا فلسفہ زندگی جزاوسزا کے گرد گھومتا ہے: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾

(الملک: ۲) ''اُس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ تمہاری آزمائش کر سکے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے۔'' ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

قرآن مجید کا فلسفہ زندگی و موت یہی ہے کہ اللہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال کے بدلے اجر و ثواب اور اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور برے لوگوں کو ان کی برائیوں کے سبب سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اعمال کے نتائج کے اعتبار سے ہر شخص کا سامان تیار کر رکھا ہے۔ بدبخت لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ اسی طرح اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت تیار کر رکھی ہے جو ان کے استقبال کے لیے بے قرار ہے۔ اس اعتبار سے بھی یہ ایمان بالقدر کا عقیدہ ہمارے لیے بہت سکون اور راحت کا باعث ہے۔ اس کو اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!

یعنی اللہ کی رضا پر راضی رہنے نے مجھے کیسی کیسی الجھنوں سے نجات دے دی ہے۔ وہ پیچ و تاب اور frustration' اندر ہی اندر کا غصہ اور صدمہ' وہ مایوسی اور بددلی' وہ خوف اور اندیشے کہ یہ نہ ہو جائے وہ نہ ہو جائے' ان سب الجھنوں سے ایمان بالقدر کے عقیدے نے مجھے نجات دلا دی اور مجھے یہ یقین ہو گیا کہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا' ایک پتا تک نہیں ہل سکتا جب تک کہ اذنِ ربی نہ ہو۔ اور میرے رب نے جو بات میرے لیے لکھ دی ہے مجھے اس پر کوئی رنج اور افسوس نہیں ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

اعمال کا دارومدار خاتمے پر ہے!

اب ایمان بالقدر سے متعلق جو آخری سبق ہے وہ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ اربعین نووی کی زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں جو یہ کہا گیا ہے:

((فَوَ اللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ غَیْرُهٗ ! اِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰی

مَا یَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ ' فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ' فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ' فَیَدْخُلُھَا ' وَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ ' حَتّٰی مَا یَکُوْنُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَھَا اِلَّا ذِرَاعٌ ' فَیَسْبِقُ عَلَیْہِ الْکِتَابُ' فَیَعْمَلُ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ' فَیَدْخُلُھَا))

''تم میں سے کوئی آدمی اہل جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اس پر وہ سابقہ تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے' اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اس پر وہ سابقہ تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔''

اس کی توجیہہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص نے اپنے اوپر ایک مصنوعی لبادہ اوڑھا ہوا ہو جبکہ اُس کی اصل سرشت کچھ اور ہو۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُکَ قَوْلُہٗ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیُشْھِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِہٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَیُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾﴾ (البقرۃ)

''اور لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی باتیں تمہیں بڑی اچھی لگتی ہیں دنیا کی زندگی میں اور وہ اللہ کو بھی گواہ ٹھہراتا ہے اپنے دل کی بات پر' حالانکہ فی الواقع وہ شدید ترین دشمن ہے۔ اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں بھاگ دوڑ کرتا ہے تاکہ اس میں فساد مچائے اور کھیتی اور نسل کو برباد کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کو فساد بالکل پسند نہیں ہے۔''

یعنی اعمال فساد مچانے والوں جیسے ہیں لیکن اوپر جو لبادہ ہے وہ نیکوکاروں کا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ لبادہ اتر جاتا ہے اور وہ بالکل عریاں ہو جاتا ہے' اس کی اصل اندرونی شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ زیرِ درس حدیث کے اس آخری حصے کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح کا ہے۔ ایک شخص اپنے شاکلہ کے اندر رہتے ہوئے نیکی کی جدوجہد کر رہا ہے' اپنی سی کوشش کر رہا ہے' لیکن اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ دیکھنے والوں کو یہی نظر آئے گا کہ وہ جہنمیوں کے سے اعمال کر رہا ہے' حتیٰ کہ اس کی شخصیت کے

اندر حق کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنی اس اندرونی کشمکش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ اندرونی کشمکش ہر شخص کے اندر ہوتی ہے' آپ کے اندر بھی ہے اور میرے اندر بھی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے اندر قلب یعنی دل بھی ہے' روح بھی ہے' ضمیر (conscience) بھی ہے' نفس امارہ بھی ہے' نفس مطمئنہ بھی ہے' Libido بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حیوانی جبلت (instincts) بھی ہے۔ ان سب میں ہر وقت کشمکش جاری رہتی ہے۔ اب اگر ایک شخص موت سے پہلے کسی مرحلے پر اس کشمکش میں کامیاب ہو کر ٹھیک راستے پر آ جاتا ہے تو آخری وقت کے اعمال کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے کہ یہ اسلامی ضابطہ ہے کہ جن اعمال پر انسان کا خاتمہ ہوگا فیصلہ بھی اسی کے اعتبار سے ہو گا۔ اس حوالے سے حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ))(۱) ''بے شک اعمال (اور فیصلہ) کا دارومدار خاتمے کے اعتبار سے ہوگا۔''

علاج معالجہ ایمان بالقدر کے منافی نہیں!

تقدیر کے معاملہ میں ایک مسئلہ اور بھی ہے جو درج ذیل حدیث سے سمجھ میں آجائے گا۔ حضرت ابوخزامہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اَرَاَيْتَ رُقًى نَسْتَرْقِيْهَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰى بِهٖ وَتُقَاةً نَتَّقِيْهَا هَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ ''اے اللہ کے رسول! ہم اپنی بیماری پر جھاڑ پھونک کراتے ہیں (اُس وقت تک شاید اس کی ممانعت نہ آئی ہو) یا کوئی دوا کھاتے ہیں یا یہ کہ ہم کسی شے کے شر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں' تو کیا اس سے اللہ کی تقدیر میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے؟'' اُس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ))(۲) ''یہ (ساری چیزیں بھی) اللہ کی اس قدر (اندازہ) میں شامل ہیں''۔ یعنی یہ بھی اللہ کے علم میں ہے کہ یہ شخص بیمار ہوگا تو علاج کرانے سے ٹھیک ہو جائے گا۔ اس لیے یہ سب بھی اس تقدیر الٰہی کا حصہ ہیں۔

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

(۱) صحیح البخاری' کتاب القدر' باب العمل بالخواتیم۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب الطب' باب ما جاء فی الرقی والادویۃ۔

حدیث 5

مُذمّتِ بدعت

۲۴/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝
(الحدید)

عَنْ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اُمِّ عَبْدِ اللّٰهِ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :
((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))(۱) وَفِیْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ:
((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))(۲)

اُمّ المؤمنین اُمّ عبداللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''جو شخص ہمارے دین میں کسی ایسی بات کو جاری کرے جو اس دین میں نہیں ہے تو وہ بات (عمل) مردود ہے''۔ مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں: ''جو شخص ایسا عمل کرے جس کا ہمارے دین میں حکم نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے''۔

معزز سامعین کرام! امام نوویؒ کی مشہور کتاب ''اربعین'' کا ہم سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں۔ آج اس کتاب کی پانچویں حدیث زیر درس آئے گی۔ پچھلے تین خطاباتِ

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصلح' باب اذا اصطلحوا علی صلح جور فالصلح مردود۔
وصحیح مسلم' کتاب الاقضیة' باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔
(۲) صحیح مسلم' کتاب الاقضیة' باب نقض الاحکام الباطلة ورد محدثات الامور۔

جمعہ میں ہم نے چوتھی حدیث کا تفصیل سے مطالعہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ایک وضاحت مزید کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث میں بعض بہت ہی مشکل معاملات بیان ہوئے ہیں۔ اس حدیث کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ ، فَيَدْخُلُهَا ، وَاِنَّ اَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ، حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ، فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ ، فَيَدْخُلُهَا)) (۱)

''تم میں سے کوئی آدمی اہلِ جنت کے سے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے مابین صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اُس پر وہ سابقہ تحریر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جہنم کا سا عمل کر کے جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک شخص اہلِ جہنم کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو وہ سابقہ تحریر اُس پر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص اہلِ جنت کا سا عمل کر کے جنت میں چلا جاتا ہے۔''

اسی مضمون پر مشتمل ایک اور روایت ملاحظہ ہو جو حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ النَّارِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ، وَيَعْمَلُ عَمَلَ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ النَّارِ ، وَاِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيْمِ)) (۲)

''کوئی شخص جہنمیوں کے سے عمل کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ جنتی ہوتا ہے اور کوئی شخص اہلِ جنت کے سے اعمال کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ جہنمی ہوتا ہے — اور (یادرکھو کہ) اعمال (اور فیصلہ) کا دارومدار تو آخری وقت کے اعمال ہی پر ہے۔''

اس طرح کا مفہوم رکھنے والی احادیث کا اخلاقی سبق (moral lesson) یہ ہے کہ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب خلق آدم وذریتہ۔ وصحیح مسلم، کتاب القدر، باب کیفیۃ خلق الادمی فی بطن امہ وکتابۃ رزقہ واجلہ۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب القدر، باب العمل بالخواتیم۔

اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیکی کی توفیق دی ہوئی ہے تو اس پر کبھی بھی مغرور نہ ہوں اور نہ ہی یہ سمجھ بیٹھیں کہ میں تو جنتی ہوں' اور میرے لیے تو جنت لکھ دی گئی (reserved) ہے۔ کیا پتا زندگی کے باقی ایام میں کب کیا صورتِ حال پیش آ جائے۔ کب کوئی فتنہ سر اٹھائے اور آپ اس میں گر پڑیں۔ اور فتنے میں گرفتار انسان کے بارے میں کیا معلوم کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں تو یہاں تک الفاظ آئے ہیں:

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۸۱﴾ (البقرۃ)

''کیوں نہیں' جس شخص نے جان بوجھ کر کوئی (بڑا) گناہ کیا اور اس گناہ نے اس شخص کا احاطہ کر لیا پس یہی تو ہیں آگ والے' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

گویا اس کا انجام کافروں کا سا ہوگا' جن کے لیے ابدی جہنم ہے۔ دوسری طرف اگر آپ کو معلوم ہو کہ فلاں شخص بدکار ہے تو اس صورت میں آپ کو اس شخص کی بدی سے نفرت ہونی چاہیے نہ کہ اُس کی ذات سے۔ بلکہ آپ کو اس کی ہدایت کے لیے دعا گو ہونا چاہیے' اس لیے کہ یہ انبیاء ورسل کی سنت ہے کہ جو انہیں ایذا پہنچاتے تھے انبیاء ان کے بارے میں دعا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ''اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے دے' انہیں علم نہیں ہے''۔ الغرض یہ معاملہ دو طرفہ ہونا چاہیے کہ انسان کو کبھی اپنی نیکی پر غرہ نہ ہو اور وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں تو ہر حال میں جنتی ہوں۔ اس حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک انتہائی بات ارشاد فرمائی کہ ''اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ تمام انسان جنت میں جائیں گے سوائے ایک آدمی کے تو مجھے یہ امید ہوگی کہ شاید وہ ایک آدمی میں ہی ہوں' اور اگر مجھے یہ بتا دیا جائے کہ تمام انسان جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے تو مجھے خوف رہے گا کہ شاید وہ ایک آدمی میں ہی ہوں''۔ اس کیفیت کو اصطلاح میں بین الخوف والرجاء کہتے ہیں۔ انسان کی اللہ کے ساتھ تعلق کی کیفیت ایسی ہی رہنی چاہیے۔ آپ اچھائی اور نیکی کے کتنے ہی اونچے مقام پر پہنچ گئے ہوں' اللہ کے خوف سے دل خالی نہیں رہنا چاہیے۔ اور ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْمِ)) جیسی احادیث ہمیشہ ذہن میں

رہنی چاہئیں' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں خاتمے کے وقت کی کیفیات کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔

حدیث کی تشریح

اب آیئے آج کی روایت کی طرف جس میں ایک بہت اہم مضمون بیان ہوا ہے۔ اس حدیث مبارکہ کی راویہ حضور اکرم ﷺ کی محبوب اہلیہ' اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپؓ کا شمار اصحابِ علم اور فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صحابہ اور تابعین پردے کے پیچھے سے آپ سے تعلیم حاصل کرتے تھے اور مسائل دریافت کرتے تھے۔ عورتوں کے مسائل اور حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کے متعلق معلومات کے حوالے سے آپ کا کوئی ثانی نہیں۔ ازدواجی زندگی اگرچہ ایک پوشیدہ معاملہ ہے' لیکن وہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کے بارے میں ہدایات بھی درکار ہیں۔ اس حوالے سے یہ نوٹ کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی سے متعلق معلومات کا اکثر حصہ ہم تک ہماری ماں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہنچایا ہے۔ ان چیزوں کی تعلیم کے حوالے سے غیر مسلم مسلمانوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے' جیسا کہ بعض صحابہؓ نے حضور اکرم ﷺ سے شکایت کی تھی کہ یہودی ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ تمہارا نبی تو تمہیں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان سے کہو کہ ہاں ہمارا نبی تو ہمیں استنجا کرنا بھی سکھاتا ہے۔ یہ بھی ضروری ہے' اس لیے کہ طہارت ہی پر تو تمام عبادات کا دارومدار ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ''اربعینِ نووی'' کی اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ))

''جس شخص نے ہمارے دین کے معاملے میں کوئی نئی بات ایجاد کی' جو اس دین میں پہلے نہیں ہے تو وہ بات (یا عمل) مردود ہے۔''

یہ تو بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے' جبکہ ایک روایت امام مسلم کی روایت کردہ ہے:

((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))

''جس شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس کا ہمارے دین میں حکم نہیں تو وہ (عمل) مردود ہے۔''

یہاں ترجمہ میں ان الفاظ کی گنجائش بھی موجود ہے کہ ''وہ شخص مردود ہے۔''

نبی اکرم ﷺ کے خطبہ کے الفاظ

اس ضمن میں ایک اور حدیث آپ ہر خطبۂ جمعہ میں سنتے ہیں۔ یہ حدیث اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے ہر خطبے میں یہ الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔ اس کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر خطبے کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرماتے تھے۔

[اس حمد وثنا کے الفاظ بعض احادیث میں یوں مذکور ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ – اَمَّا بَعْدُ]

بعض احادیث میں دورانِ خطبہ یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ((مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ)) ''جس کو اللہ ہدایت دے دے اس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا''۔ ((اِنَّ اَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ)) ''جان لو کہ سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے'' ((وَاَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ)) ''اور بہترین ہدایت محمد ﷺ کی ہدایت ہے'' ((وَشَرُّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا)) ''اور (تمام معاملات میں) بدترین اعمال وہ ہیں جو نئے ایجاد کر لیے جائیں'' ((وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ)) ''اور ہر نئی چیز بدعت ہے''۔ ((وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''اور ہر بدعت کھلم کھلا گمراہی ہے''۔ ((وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ))[1] ''اور ہر گمراہی کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے۔''

(۱) سنن النسائی، کتاب صلاۃ العیدین، باب کیف الخطبۃ۔

لفظ بدعت کی تشریح

اس روایت میں دو الفاظ بہت اہم ہیں: بدعت اور محدَث۔ لفظ بدعت کا مادہ ''بدع'' ہے اور اس کے معنی ہیں: کسی چیز کا بالکل از سرِنو آغاز کرنا۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۱۷) ''وہ (اللہ) نیا پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا''۔ —— شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کو تمام مکاتب فکر مجموعی طور پر علومِ اسلامی کا مجدّد مانتے ہیں' البتہ جزوی طور پر بعض کو ان سے بُعد ہے۔ مثلاً ان کی بعض کتابوں کو اہلحدیث نظر انداز کرتے ہیں' اس لیے کہ ان میں تصوف کا بہت زیادہ ذکر ہے' جبکہ اہلِ تشیع کو ان کی بعض کتابوں سے بہت دوری ہے' جیسے **قرۃ العینین فی التفضیل الشیخین**۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق ؓ کو تمام صحابہ میں جو فضیلت حاصل ہے اس پر شاہ ولی اللہؒ نے پوری کتاب لکھی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اہلِ تشیع کو یہ کتاب پسند نہیں ہے۔ یہ چیزیں جزوی اعتبار سے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی تمام مکاتب فکر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ درحقیقت علوم اسلامی کے مجدّد اور قرآن مجید کی طرف لوگوں کو از سرِنو متوجہ کرنے والے شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں۔ ہندوستان میں حدیث کو متعارف (introduce) کرانے والے اگرچہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ ہیں' لیکن اس اعتبار سے بھی جو خدمت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے سرانجام دی ہے وہ اپنی جگہ بہت اہم ہے —— شاہ ولی اللہ کی معرکۃ الآراء کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' اسلامی فلسفے کے موضوع پر چوٹی کی کتاب ہے۔ اس کے پہلے باب میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بنیادی طور پر تین قسم کے ہوتے ہیں: ابداع' خلق اور تدبیر۔ ابداع کے معنی ہیں کائنات کو بغیر کسی شے کے پیدا کرنا۔ اس کو انگریزی میں کہتے ہیں creation ex nehilo۔ خلق کے معنی ہیں ایک شے سے دوسری شے کو بنانا' مثلاً اللہ تعالیٰ نے آگ سے جن بنائے' مٹی اور پانی کے مجموعے سے حیوانات' بشمول انسان' بنائے۔ اس طرح کی تخلیق تو انسان بھی کرتا ہے کہ پہلے کوئی چیز نہیں تھی اس کو ایجاد کرلیا' جیسے بجلی' ہوائی جہاز وغیرہ پہلے نہیں تھے انسان نے ان کو ایجاد کرلیا۔ یہ ایک طرح سے انسان کی تخلیق

ہے۔اسی لیے سورۃ المؤمنون میں فرمایا:﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ ''پس کیا ہی بابرکت ہے اللہ تمام تخلیق کرنے والوں میں بہترین تخلیق کرنے والا!'' واضح رہے کہ یہاں ''خالقین'' جمع کا صیغہ آیا ہے۔لیکن ''بدیع'' یعنی ہر چیز کو ازسرنو پیدا کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا:﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو ازسرنو پیدا کیا۔''

لفظ بدعت کی لغوی تشریح کے بعد اب بدعت کے شرعی اور اصطلاحی مفہوم کو سمجھ لیجیے۔عبادات کے ضمن میں ثواب کے حصول کے لیے کیے جانے والے کاموں میں کسی ایسی شے کا اضافہ کر دینا جو کتاب وسنت میں نہیں ہے بدعت کہلاتا ہے۔

اجتہاد اور سائنسی ایجادات بدعت نہیں!

یہاں یہ نوٹ کرلیں کہ سائنسی ایجادات اور اجتہاد بدعت نہیں ہیں۔اجتہاد بدعت سے بالکل الگ شے ہے کہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا جو پہلے نہیں تھا' اب قرآن وسنت کے محکمات اور نصوص سے انتہائی محنت سے اس کا حکم اخذ کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔مثلاً نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تصویر بنانا حرام ہے۔حضور ﷺ کے زمانے میں تصویر ہاتھ سے بنتی تھی' اس وقت کیمرے کا کوئی تصور نہیں تھا۔کیمرہ ایجاد ہوا تو یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ آیا کیمرے کی تصویر کا بھی ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کا سا حکم ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہو گیا۔عالمِ عرب کے علماء کی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ کیمرے کی تصویر پر ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کی حرمت کا اطلاق نہیں ہوگا' اس لیے کہ یہ محض عکس ہے' جبکہ علمائے ہند کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر کی طرح کیمرہ کی تصویر بھی حرام ہے' البتہ کسی سماجی ضرورت کے تحت تصویر کھینچنا جائز ہے' مثلاً مجرموں کی شناخت' شناختی کارڈ' پاسپورٹ اور ویزہ وغیرہ کے لیے۔یہ اجتہاد چونکہ بدعت سے مختلف ہے اور بدعت کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی اس لیے اجتہاد کا شمار بدعت میں نہیں ہوگا۔

اسی طرح سائنسی ایجادات کا معاملہ ہے۔حضور ﷺ کے زمانے میں سواری کا ذریعہ اونٹ' گھوڑے' خچر اور گدھے ہوتے تھے' ان کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔

موجودہ دور میں ان کے علاوہ سائیکل' موٹر سائیکل' کار' بس اور ہوائی جہاز وغیرہ سفر کے ذرائع بن گئے ہیں۔ تو اب ان کا استعمال بدعت نہیں ہے' اس لیے کہ ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے' یہ تو بس سائنسی ترقی (scientific development) ہے۔ بعض لوگ بحث و مباحثہ میں کاروں اور بسوں میں سفر کو بھی بدعت کہہ دیتے ہیں' حالانکہ بدعت کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا' اس لیے کہ یہ نہ تو کسی عبادت کا حصہ ہیں اور نہ ان کا استعمال ثواب کی غرض سے کیا جاتا ہے۔ البتہ اگر کسی اچھے مقصد مثلاً دین کی تبلیغ کے لیے سفر کیا جائے تو اس پر اجر و ثواب ضرور ملے گا۔ اس معاملے میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ سفر ہوائی جہاز پر کیا گیا ہو' ٹرین پر' یا کار پر۔ اور اگر کوئی شخص اونٹ پر بیٹھ کر برائی کی تبلیغ کرتا ہے تو اس کی پکڑ ضرور ہوگی' اس لیے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ سواری۔ لہٰذا سائنسی ایجادات (scientific inventions) کا شمار بھی بدعت میں نہیں ہوگا' اس لیے کہ بدعت کے مفہوم کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔

لفظ محدَث کی تشریح

اس روایت میں دوسرا اہم لفظ محدَث ہے۔ اس کا مادہ حدث ہے۔ حَدَثَ کے معنی ہیں کوئی شے جو پہلے نہیں تھی وہ پیش آ گئی۔ اس سے ایک لفظ حادثہ بن گیا جو اردو زبان میں بھی مستعمل ہے۔ حادثہ کہتے ہیں کسی شے کا اچانک ہو جانا۔ یعنی کچھ ایسا ہو جانا جو نہ پیشِ نظر تھا' نہ مقصد تھا نہ ارادہ تھا اور نہ ہی خواہش تھی۔ اسی طرح کلام کے ذریعے سے ہم جو بات کہتے ہیں اس کو بھی حدیث کہا جاتا ہے' اس لیے کہ میرے کہنے سے پہلے وہ بات نہیں تھی' اب میں نے کہی تو وہ پیش آ گئی۔ قرآن مجید کو بھی ''حدیث'' کہا گیا ہے: ﴿فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَہٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۰﴾﴾ (المرسلت) ''تو اس حدیث (قرآن) کے بعد اب یہ کس شے پر ایمان لائیں گے؟'' حالانکہ اس سے زیادہ مبین' واضح اور ہدایت دینے والی شے تو کوئی اور ہے نہیں۔ اس سے ایک لفظ محدث بنا ہے جس کے معنی ہیں ایسی چیز جو نئی ایجاد کر لی گئی ہو۔

بدعت کا سبب: عبادت اور عبادات میں فرق نہ کرنا

بدعات جنم لینے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ عبادت اور عبادات کے تصور کو خلط ملط کر جاتے ہیں اور پھر اس سے معاملات الٹی سمت میں چلنے لگتے ہیں۔ عبادت اور عبادات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ عبادت تو ایک جامع لفظ ہے کہ پوری زندگی میں ہمہ وقت' ہمہ تن اور ہمہ وجوہ اللہ کی اطاعت محبتِ الٰہی کے جذبہ سے سرشار ہو کر کی جائے۔ یہ چونکہ بہت مشکل کام ہے اور اس میں بہت سی رکاوٹیں ہیں چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے چار عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ فرض کی ہیں۔ یہ چاروں عبادات دین کے ستون ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت بمنزلہ چھت کے ہے جو ان ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ بغیر چھت کے ستونوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسی طرح ستونوں کے بغیر چھت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ معلوم ہوا کہ عبادت اور عبادات لازم و ملزوم ہیں' لیکن اگر عبادت اور عبادات میں ایک طرح کا مقابلہ شروع ہو جائے تو اس مقابلے سے عبادت کا جامع تصور اور اس کی ہمہ گیریت ذہن سے محو ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد عبادات پر زور بڑھنا شروع ہو جاتا ہے اور یہ سارا معاملہ نیکی کے جذبے سے سرشار ہو کر اور پوری نیک نیتی کے ساتھ ہوتا ہے—— اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب عبادت کا ہمہ گیر اور جامع تصور ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اب نیکی کا جذبہ عبادات پر مرتکز ہو جاتا ہے۔ پھر ان عبادات میں غلو ہوتا ہے اور حد سے آگے بڑھنے کی ایک شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ اگر آپ ایک طشت میں پانی ڈالتے ہیں تو اس پانی کی اونچائی ایک یا دو انچ ہو گی اور اگر آپ اسی پانی کو کسی بوتل میں ڈال دیں تو اس کی اونچائی دس انچ ہو جائے گی۔ یہی معاملہ ہمارے دین کا ہے۔ جب عبادت کا ہمہ گیر اور وسیع تصور سکڑ کر عبادات میں آ گیا تو وہ تصور محدود ہو گیا۔ یقیناً اس سے عبادات میں غلو پیدا ہو گا' نئی نئی چیزیں اس میں شامل ہوں گی اور یہ پورے خلوص اور نیک نیتی سے ہو گا۔ اس تصور کو واضح کرنے کے لیے میں نے ابتدا میں سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت کی:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾

''انہوں نے رہبانیت کی بدعت ایجاد کر لی تھی جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا مگر (انہوں نے اپنے خیال میں) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا کرلیا) پھر جیسا اس کو نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے۔''

اس آیت کے آغاز میں ''ابتدعوھا'' آیا ہے۔اس کا مادہ بھی بدع ہے' بابِ افتعال میں یہ ابتداع بن گیا۔

بدعت کی انتہا: رہبانیت

حضرت مسیح اور حضرت یحییٰ علیہما السلام انتہائی زاہد تھے اور دونوں کو دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا' اس لیے دونوں نے شادی نہیں کی۔لہٰذا ان کے متبعین' جو بہت خداترس تھے اور ان میں تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا بہت غلبہ تھا' ان کے اندر بھی اس اعتبار سے غلو پیدا ہوا اور پھر اس سے انہوں نے رہبانیت کا نظام بنایا اور یہ عہد کیا کہ ساری عمر شادی نہیں کریں گے اور خانقاہوں میں پوری زندگی گزاریں گے۔ ابتدائی زمانے میں واقعتاً ایسے لوگ تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا کیا' لیکن اکثر و بیشتر لوگ اس کی پابندی نہیں کر پائے۔ انہوں نے رہبانیت کو اپنے اوپر لازم تو کرلیا اور یہ عہد کرلیا کہ اب شادی نہیں کریں گے لیکن اس کا پوری طرح حق ادا نہ کر سکے۔اس کے بعد جب عیسائیوں میں خانقاہی نظام (monasticism) کا زوال آیا ہے تو پھر کہنے کو تو راہب خانے ہوتے تھے لیکن وہ برائیوں کی آماجگاہ بن چکے تھے۔وہاں راہب مرد اور راہبہ عورتیں موجود ہوتی تھیں اور آپ کو معلوم ہے کہ کسی بھی جگہ عورت اور مرد کا قرب قیامت سے کم نہیں ہوتا۔لہٰذا ان راہب خانوں میں سب کچھ ہوتا تھا' زنا کاری ہوتی تھی' حرامی بچے پیدا ہوتے تھے اور پھر تہہ خانوں میں ان ناجائز بچوں کی قبریں بنتی تھیں۔ یہ باتیں فرضی نہیں ہیں بلکہ History of Christian Monasticism پر لکھی گئی کتابوں میں خود عیسائی مصنفین نے ان باتوں کا اعتراف کیا ہے۔یہ تباہ کاریاں اس لیے ہوئیں کہ انہوں نے

فطرت کے تقاضوں کے خلاف غیر فطری قدغنیں لگا دیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک دریا زور و شور سے بہہ رہا ہے اور آپ اس کے آگے بند باندھیں تو دریا کا پانی اس بند کو فوراً بہا کر لے جائے گا۔ اسی طرح عیسائیت کے اس خانقاہی نظام کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا گیا: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ ''پھر وہ اس کی پابندی بھی نہیں کر پائے' جیسے کہ پابندی کرنے کا حق تھا''۔ یہ دراصل **حکم الاکثر حکم الکُل** ہے۔ کچھ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں' اس لیے کہ بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے پوری عمر رہبانیت کے تقاضے پورے کیے' لیکن اکثریت اس کا حق ادا نہ کر سکی اور یہ اصول ہے کہ اکثریت کا جو معاملہ ہوگا اسی پر کل کا اطلاق ہوگا۔

آیت کے اگلے حصے میں فرمایا:

﴿فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾

''پس جو لوگ ان میں سے صاحب ایمان تھے ہم نے انہیں اس کا اجر عطا کیا' لیکن ان میں اکثر لوگ فاسق تھے۔''

آیت کے اس حصے کے دو ترجمے اور دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ عیسائیوں میں سے جو نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آئے تو ان کو دوہرا اجر ملے گا۔ بعض احادیث میں بھی آیا ہے کہ اگر اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ میں سے کوئی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اس لیے کہ وہ پہلے اپنے نبی کو مانتے تھے اور اپنی شریعت کے پابند تھے اور اب وہ محمد ﷺ کو مان رہے ہیں اور آپ ﷺ کی شریعت کے پابند ہو گئے ہیں۔ اس آیت کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان راہبوں میں سے جو لوگ واقعی صاحب ایمان تھے اور جنہوں نے اس عہد کی پابندی کی جو انہوں نے کر لیا تھا تو ہم ان کو ان کا اجر عطا کریں گے۔ اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ ان کی اکثریت فاسقوں اور غلط کار لوگوں پر مشتمل ہے' جنہوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔

نیک عیسائی راہب اور عالم عہدِ نبوی تک موجود تھے

یہ ایک حقیقت واقعی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں نیک راہب

آخری وقت تک موجود رہے ہیں۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ بحیرہ راہب نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچان لیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ بچپن میں جب اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو راستے میں بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کو پہچان کر آپ کے چچا ابوطالب سے کہا تھا کہ اس بچے کی حفاظت کرنا' یہودی اس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ' جن کا مقام اس درجے میں ہے کہ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ سلمان تو ہمارے اہل بیت میں شامل ہے' ان کی راہنمائی کرنے والے دو عیسائی راہب ہی تھے۔ آپؓ تو ایران میں پیدا ہوئے تھے جہاں آگ کی پرستش ہوتی تھی' لیکن ان کی فطرت نے انہیں تلاشِ حق پر آمادہ کیا تو آپؓ نے اپنے دین کو اور اپنے وطن کو چھوڑا۔ ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کو بھی ان کے باپ نے اپنے آباء واَجداد کا دین چھوڑنے کی پاداش میں گھر سے نکال دیا ہو۔ آپؓ نے شام آ کر عیسائیت اختیار کی' اس علاقے میں ایک نیک عیسائی راہب تھا' جس سے آپ نے علم حاصل کیا۔ جب اس راہب کا انتقال ہو رہا تھا تو آپؓ نے اس سے کہا کہ میرے علم کی پیاس کی ابھی تسکین نہیں ہوئی' میں اب کہاں جاؤں؟ اس نے ایک اور راہب کا پتا دیا۔ آپؓ وہاں پہنچ گئے اور اس سے علم حاصل کرنے لگے۔ جب اس کے انتقال کا وقت آیا تو آپ کے پوچھنے پر راہب نے بتایا کہ میرا علم بتا رہا ہے کہ جنوب کی جانب کھجوروں والی سرزمین میں نبی آخر الزماں ﷺ کا ظہور ہونے والا ہے۔ تم وہاں جاؤ' کیا عجب کہ اللہ تمہیں ان کے قدموں میں پہنچا دے۔ اس طرح ان دو نیک راہبوں کی بدولت حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو اپنی منزل ملی اور پھر آپ صحابیٔ رسول کے درجے پر فائز ہوئے۔

اسی طرح حضور ﷺ کے دور تک بہت سے عیسائیوں کے پاس علم کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ شاہِ حبشہ نجاشی نے جب سورۂ مریم کی آیات سنی تھیں تو اس نے کہا تھا کہ جو کچھ ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے' حقیقت میں عیسیٰ (علیہ السلام) اس سے ایک تنکا برابر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اس سے نجاشی نے حضور ﷺ کو پہچانا۔ اسی طرح ہرقل نے بھی اپنے علم سے محمد ﷺ کو پہچانا۔ ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہ

ہوئے تھے' تجارتی قافلہ لے کر گئے تو ہرقل' جس نے یہ سن رکھا تھا کہ عرب میں کسی نبی کا ظہور ہوا ہے اور وہ نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے' کو جب اس تجارتی قافلہ کا معلوم ہوا تو وہ یروشلم پہنچا اور وہاں جا کر ابوسفیان سے ایک طویل مکالمہ کیا۔ اس مکالمہ کے دوران اس نے ایک ایک کر کے ایسے سوالات کیے جیسے کوئی وکیل جرح کر کے حقیقت اندر سے برآمد کر لیتا ہے۔ یہ ایک طویل مکالمہ ہے جو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ دورانِ مکالمہ بار بار میرا جی چاہا کہ میں جھوٹ بول کر محمد (ﷺ) کے خلاف بات کروں' لیکن مجھے خیال آیا کہ میرے ساتھ جو باقی عرب لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے! تو میں نے جھوٹ نہیں بولا اور ساری باتیں صحیح کہیں۔ مکالمہ کے اختتام پر ہرقل نے کہا کہ جو کچھ تم نے محمد (ﷺ) کے بارے میں کہا ہے اگر وہ صحیح ہے تو میرے قدموں کی زمین یعنی فلسطین اور شام پر اس نبی کا قبضہ ہو گا۔ الغرض حضور ﷺ کی بعثت تک چند نیک راہب بھی موجود تھے اور عیسائی عالمین بھی موجود تھے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو نشانیوں کے ذریعے پہچانا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اکثر و بیشتر نصاریٰ حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ سے محبت کرتے تھے اور ان کا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں معاندانہ اور مخالفانہ ردعمل نہیں تھا۔ لیکن یہودی مسلمانوں کے سخت دشمن تھے اور اُس وقت یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی بڑی سخت دشمنی تھی۔ واضح رہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۱ میں جو یہود و نصاریٰ کی آپس کی دوستی کی بات کی گئی ہے وہ ایک پیشین گوئی ہے جو آج کے دور کے بارے میں ہے۔ فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ﴾

''اے اہلِ ایمان! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ۔ وہ تو ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

چند صحابہ کا عبادات میں غلو کا عہد اور نبی اکرم ﷺ کا اعلانِ براءت

بدعت کے سبب کے حوالے سے پہلی بات میں نے آپ کے سامنے یہ عرض کی کہ

جب عبادت کا تصور محدود ہو جائے تو سارا زور عبادات پر ہو جاتا ہے' پھر اس میں غلو پیدا ہوتا ہے اور نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے ضمن میں ایک اور حدیث میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہؓ کی ایک جماعت نے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھریلو اعمال و عبادات کے بارے میں معلوم کیا' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو کتنی دیر جاگ کر نوافل پڑھتے ہیں اور کتنی دیر آرام فرماتے ہیں اور مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہیں اور کتنے دن افطار کرتے ہیں' وغیرہ۔ جب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات بتا دیے تو انہوں نے سوچا کہ یہ عبادات تو کم ہیں۔ ان کے خیال میں تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رات کو ایک لمحہ کے لیے بھی کمر بستر پر نہیں لگاتے ہوں گے اور آپؐ مسلسل روزے رکھتے ہوں گے' کبھی ناغہ نہیں کرتے ہوں گے۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کے لیے سوچا کہ یہ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ہے جو معصوم عن الخطا ہیں اور ان سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا' جبکہ ہم تو گناہگار ہیں' اس لیے یہ ہمارا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ تو ان میں سے ایک نے کہا میں ساری رات آرام نہیں کروں گا بلکہ عبادت کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس سارے معاملے کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ان کو طلب کر کے انتہائی غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے:

((اَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَاَتْقَاكُمْ لَهٗ' لٰكِنِّيْ اَصُوْمُ وَاُفْطِرُ وَاُصَلِّيْ وَاَرْقُدُ وَاَتَزَوَّجُ النِّسَاءَ' فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) (۱)

''یہ تم لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کی ہیں؟ اللہ کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اس کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں' لیکن میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں' اور (رات کو) نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں' اور میں نے عورتوں سے شادیاں بھی کی ہیں۔ پس جسے میری سنت پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔

یہی معاملہ ایک بہت مشہور صحابی کا ہوا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی انتہائی زاہد اور عابد تھے۔ ان کے بارے میں آتا ہے کہ یہ ساری رات نوافل پڑھتے اور روزانہ روزہ رکھتے تھے۔ ان کو نہ بیوی سے کوئی سروکار تھا اور نہ دنیا کے کسی اور معاملے سے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے اس معمول کا پتا چلا تو آپؐ نے انہیں بلا کر پوچھا: ((یَاعَبْدَ اللّٰہِ اَلَمْ اُخْبَرْ اَنَّکَ تَصُوْمُ النَّھَارَ وَتَقُوْمُ اللَّیْلَ)) ''اے عبداللہ! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم ہر روز روزہ رکھتے ہو اور پوری پوری رات (نفل میں) قیام کرتے ہو''۔ آپؓ نے عرض کیا: بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ''ایسا ہی ہے یارسول اللہ!'' آپؐ نے فرمایا: ((فَلَا تَفْعَلْ)) ''پس ایسا ہرگز مت کرو'' ((صُمْ وَاَفْطِرْ وَقُمْ وَنَمْ)) ''روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو' قیام بھی کرو اور نیند بھی کرو'' ((فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))[1] ''اس لیے کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔''

بدعت کا دوسرا سبب: روحِ عبادت کا ختم ہو جانا

بدعات کا دوسرا بڑا سبب روحِ عبادت کا ختم ہو جانا ہے اور یہ نیک نیتی سے نہیں بلکہ جہالت اور غفلت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ اگر عبادات میں سے روحِ عبادت نکل جائے تو عبادات کے ظاہر پر ارتکاز زیادہ ہو جاتا ہے اور پھر ظواہر میں اضافہ ہونا شروع ہوتا ہے' اور طرح طرح کی رسومات ایجاد ہوتی ہیں۔ مثلاً کسی کے فوت ہونے کے بعد اس کو غسل دینا' کفن پہنانا' بہت احترام کے ساتھ کندھوں پر اٹھا کے قبرستان لے جانا' نماز جنازہ پڑھنا' اچھے طریقے سے دفن کرنا اور پھر آخر میں اس کی بخشش کے لیے دعا کرنا مسنون اعمال ہیں۔ اس کے بعد کوئی رسم نہیں' لیکن لوگ اس میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے ہم نے ہندوؤں سے ''تیجا'' لیا' پھر اس تیجے کو ''سوئم'' کا نام دے دیا۔ پھر اسے ''قل'' اور ''قرآن خوانی'' کے نام سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب لزوجك علیك حق۔

موسوم کر دیا۔ اس کے علاوہ ساتواں‘ دسواں‘ پھر چالیسواں اور پھر برسی جیسی رسومات ایجاد کر لیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ — یہ کُل کی کُل بدعات ہیں۔

اس طرح شادی میں دعوتِ ولیمہ کے سوا باقی تمام دعوتیں اور رسومات اسراف اور تبذیر کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس کے بارے میں فرمانِ باری تعالیٰ ملاحظہ ہو: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ﴾(الاسراء:۲۷) ”یہ مبذرین (دولت کو نمود و نمائش کے لیے اڑانے والے) شیطانوں کے بھائی ہیں“۔ اس ضمن میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ملاحظہ ہو۔ مجھے یہ حدیث بہت پسند ہے اور میں اکثر اسے اپنے خطبات میں بیان کرتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلاَّ كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ)) ”اللہ نے جس نبی کو بھی اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس قوم میں اس نبی کے کچھ نہ کچھ حواری اور ساتھی ضرور ہوتے تھے“۔ اب یہ ساتھی تھوڑے ہوں یا زیادہ‘ ہوتے ضرور تھے‘ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری تھے‘ جبکہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان اصحاب کا معمول یہ تھا: ((يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ”وہ اپنے نبی کی سنت پر عمل پیرا ہوتے تھے اور ان کے احکامات بجا لاتے تھے“۔ ((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ))(۱) ”پھر ہمیشہ یہ ہوتا رہا کہ ان اصحاب کے بعد ایسے ناخلف لوگ پیدا ہو گئے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور کرتے وہ تھے جس کا انہیں حکم نہیں دیا گیا“۔ ہر نبی کے ماننے والوں میں ایسا ہوا ہے اور اُمتِ محمدؐ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے— عید میلاد النبی کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے؟ کیا اس کا کوئی ثبوت صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے؟ کیا ہم ”میلاد النبی“ کی تقریبات منا کر یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے مقابلے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت کرتے ہیں؟ اصل بات وہی ہے جو اس حدیث میں بیان ہوئی کہ ہر نبی کے پیروکاروں میں کچھ عرصہ

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان کون النھی عن المنکر عن الایمان......

گزرنے کے بعد ایسے لوگ آجاتے ہیں جو کرتے وہ ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا۔ یہ ہے درحقیقت رسم پرستی اور پھر رسم کے اندر اضافہ ہوتے چلا جانا۔

بدعت کا نتیجہ: سنت کا خاتمہ

بدعت کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ جہاں بدعت آئے گی وہاں سنت رخصت ہو جائے گی۔ اب نماز جنازہ اور وفات کی رسومات کو لے لیجیے کہ نماز جنازہ کی اہمیت ان رسومات سے بھی کم ہو گئی ہے' بایں طور کہ نہ نماز جنازہ کا طریقہ سیکھنا ہے' نہ اس کی دعا یاد کرنی ہے' بس وہاں جا کر بت بن کر کھڑے ہو جانا ہے' چاہے وضو بھی ہو یا نہ ہو۔ لیکن قرآن خوانی اور ان باقی رسومات میں تو جانا ہی جانا ہے' اس میں تو کوئی دوسرا آپشن ہے ہی نہیں۔ حالانکہ میت کے حقوق میں سب سے بڑھ کر نماز جنازہ کی ادائیگی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر نماز جنازہ کا طریقہ آنا چاہیے' دعا یاد ہونی چاہیے اور اس دعا کا ترجمہ بھی یاد ہونا چاہیے تاکہ دل سے دعا مانگ سکیں۔ الغرض یہ بات یاد رکھیں کہ بدعت کے آنے سے سنت کی حیثیت کم ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ سنت بالکل غائب ہو جائے گی۔ یہ بدعت کا بدترین نتیجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بدعات اور محدثات سے بچائے اور اعتصام بالکتاب والسنۃ کی توفیق عطا فرمائے۔ احادیث کی کتابوں میں ''اعتصام بالکتاب والسنۃ'' کے پورے پورے باب ہیں۔ لہٰذا کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ اللہ کی کتاب اور سُنّتِ رسول ﷺ کو مضبوطی سے تھامیں' عبادات کے اندر روحِ عبادت اور خشوع وخضوع اور تواضع پیدا کریں اور پھر عبادات کے ساتھ عبادت کے اصل تصور کو محو نہ ہونے دیں۔

(جاری ہے)

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

مُذمّتِ بِدعَت (۲)

۳۱/اگست ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

گزشتہ سے پیوستہ

اربعین نووی کی پانچویں حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ اس حدیث پر کچھ گفتگو پچھلے جمعہ ہوگئی تھی۔ موضوع کی مناسبت سے میں نے سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت کی تھی، جس میں فرمایا گیا:

﴿وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾

''انہوں نے رہبانیت کی بدعت ایجاد کر لی تھی جس کا ہم نے ان کو حکم نہیں دیا تھا مگر (انہوں نے اپنے خیال میں) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا کرلیا) پھر جیسا اس کو نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے۔''

قرآن مجید میں ''بدعت'' کا لفظ صرف اسی ایک آیت میں ''رہبانیت'' کے ضمن میں آیا ہے۔ اس ضمن میں، میں نے تفصیل سے بیان کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم عصر حضرت یحییٰ علیہ السلام، دونوں پر زہد کا بہت غلبہ تھا۔ انہیں دنیوی لذات سے کوئی سروکار نہ تھا، اس لیے انہوں نے شادی بھی نہیں کی۔ اس کے نتیجے میں ان کے پیروکاروں اور حواریین میں بھی یہی رنگ پیدا ہو گیا اور پھر اگلی نسلوں میں یہ رنگ اور گہرا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ اس نے رہبانیت کی شکل اختیار کر لی —— دین اسلام نے رہبانیت کو ممنوع قرار دیا ہے اور سورۃ الحدید کی مذکورہ بالا آیت میں اس کی نفی کی گئی

ہے۔ رہبانیت کی نفی کے حوالے سے اگرچہ قرآن حکیم میں زیادہ سخت الفاظ نہیں آئے' بلکہ یہ بھی فرمایا گیا: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ﴾ ''پھر جیسا اسے نبھانے کا حق تھا ویسا نباہ نہ کر سکے'' گویا اس فعل کی مکمل نفی نہیں کی گئی بلکہ اس کا حق ادا نہ کرنے والوں کو تنبیہہ کی گئی ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ رہبانیت کو اپنایا تھا۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں واقعتاً ایسے لوگ تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا کیا لیکن بعد میں اکثر و بیشتر لوگ اس کی پابندی نہیں کر پائے۔ البتہ احادیثِ مبارکہ میں بڑی شدت کے ساتھ رہبانیت کی نفی آئی ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث مبارکہ میں آپ کو سنا چکا ہوں' ان میں ایک طویل روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے عبادات میں غلو کا عہد کر لیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ان سے اعلانِ براءت کرتے ہوئے آخر میں فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) ''جسے میری سنت (طریقہ) پسند نہیں اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ اب یہ بہت سخت انداز ہے۔ حالانکہ انہوں نے جو بھی سوچا اور جو بھی عہد کیا تھا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا' لیکن اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے طرزِ عمل کی نفی میں بہت غیر معمولی الفاظ ارشاد فرمائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رہبانیت کی مثال آپؐ کے سامنے تھی جو نیک نیتی سے شروع ہوئی لیکن بالآخر راہب خانے برائیوں کی آماجگاہ بن گئے۔

اس ضمن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو —— حضرت انسؓ جب ۹ یا ۱۰ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی اور کہا کہ یہ آپؐ کے پاس رہے گا اور عمر بھر آپؐ کی خدمت کرے گا۔ اُس دن سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ دنیوی کے اختتام تک حضرت انسؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے —— وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فرمایا کرتے تھے:

((لَا تُشَدِّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ فَيُشَدَّدَ عَلَيْكُمْ ، فَاِنَّ قَوْمًا شَدَّدُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّدَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ، فَتِلْكَ بَقَايَاهُمْ فِي الصَّوَامِعِ وَالدِّيَارِ))(۱)

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الحسد۔

''(دیکھو) اپنے اوپر سختی مت کرو (اگر تم اپنے اوپر سختی کرو گے) تو تم پر سختی ہی کی جائے گی۔ پس پہلی قوموں میں سے جنہوں نے اپنے آپ پر سختی کی تو اللہ نے بھی ان کو سختی میں مبتلا کر دیا۔ پس اُن کی باقیاتِ سیئات خانقاہوں اور راہب خانوں میں موجود ہیں۔''

اس کے بعد آپؐ نے سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ تلاوت فرمائی جس کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۝۲۷﴾ ''اور ان میں سے اکثر فاسق ہیں''۔ یعنی اکثر ایسے تھے جنہوں نے رہبانیت کا حق ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فطرت کے ساتھ تصادم کا راستہ اختیار کیا اور فطرت کے تقاضوں کے خلاف غیر فطری قدغنیں لگا دیں۔ اب ظاہر بات ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر جو تقاضے رکھے ہیں وہ انسان کو پچھاڑ دیتے ہیں اور پھر انسان منہ کے بل بری طرح گر پڑتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا الوداعی وعظ اور وصیت

موضوع کی مناسبت سے اب میں آپ کو ایک بڑی اہم حدیث (۱) سنا رہا ہوں — اس حدیث کی اہم بات یہ ہے کہ اس کو سن کر نبی اکرم ﷺ کی محفل کا نقشہ کچھ دیر کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے آ جائے گا۔ اس سے پہلے حدیثِ جبریل کے مطالعہ کے دوران ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں کہ اس کو پڑھ کر بھی حضور اکرم ﷺ کی محفل کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے — حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے: فَوَعَظَنَا مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً ''پھر آپؐ نے ایک ایسا وعظ فرمایا جو دلوں میں اتر جانے والا تھا''۔ یعنی ایسا وعظ فرمایا کہ وہ ہمارے دلوں میں سرایت کر گیا۔ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ ''(اس کی تاثیر اس درجے میں ہوئی کہ) اس سے ہماری آنکھیں بہہ پڑیں''۔ یعنی ہماری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وَوَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ ''اور ہمارے دل دہل گئے''۔ اس صورت حال میں ایک شخص نے عرض کیا: يَارَسُوْلَ

(۱) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ وسنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب فی لزوم السنة۔ واللفظ له۔

اللّٰہِ! کَاَنَّ ھٰذِہٖ مَوْعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَمَاذَا تَعْھَدُ اِلَیْنَا ''اے اللہ کے رسول ﷺ! (ایسا محسوس ہو رہا ہے) یہ تو گویا وداع کرنے والے کا وعظ ہے۔ پس آپؐ ہم سے کس چیز کا عہد لینا چاہتے ہیں؟'' ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا آخری وعظ ہے' بالفاظِ دیگر یہ آپؐ کی وصیت ہے۔ اس درجے کا بلیغ اور مؤثر وعظ کہ سننے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہنے لگے اور دلوں پر لرزہ طاری ہو گیا۔ مسند احمد کی روایت میں ''فَاَوْصِنَا'' کے الفاظ ہیں۔ یعنی اس صحابیؓ نے کہا کہ اگر واقعی آپؐ کی اس دنیا سے رخصتی کا وقت قریب آ گیا ہے تو پھر ہمیں وصیت فرمائیے اور وہ باتیں بتائیے جن کی ہمیں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اس سے آگے رسول اللہ ﷺ کا فرمان شروع ہو رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ)) ''میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں'' — آگے بڑھنے سے پہلے تقویٰ کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اس حیاتِ دُنیوی میں معصیت سے بچنا' گناہوں سے بچنا' اللہ کی نافرمانی سے بچنا' حدودِ شریعت تجاوز کرنے سے بچنا اور تمام خرافات' رسومات و بدعات سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ انسان کو کسی گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑے اور وہاں نہ کوئی پگڈنڈی ہو' نہ کوئی راستہ ہو' بلکہ اونچی اونچی گھاس اور گھنے درخت ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے میں انسان بہت چوکنا ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو یا کسی اور موذی جانور کا بل یا بھٹ ہو اور وہاں پاؤں پڑ جائے۔ ایمیزون یا کانگو جیسے جنگلات میں تو درختوں سے لٹکے ہوئے سانپ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح پوری زندگی انسان کا معصیتِ الٰہی سے بچ کر چلنا تقویٰ ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

تقویٰ کی وصیت کے بعد آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ)) ''(تقویٰ کے ساتھ ساتھ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں) ''سمع و طاعت یعنی سننے اور حکم

ماننے کی'' --- یعنی میں تو اللہ کا رسول ہوں اور تم میری بات مان رہے ہو' لیکن میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی' میرے بعد تو خلفاء ہوں گے۔ اس لیے میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ ان کا حکم سننا اور ماننا اور اپنی جماعتی زندگی میں رخنے نہ پڑنے دینا۔ گویا: "United you stand, divided you fall" یعنی تم متحد رہو گے تو سربلند رہو گے اور جب تم تقسیم ہو جاؤ گے تو تمہیں زوال آ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب مسلمان شیعانِ عثمانؓ اور شیعانِ علیؓ کے نام سے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تو پھر مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تو پورا عہد خلافت خانہ جنگی کی نذر ہو گیا اور ایک لاکھ کے قریب مسلمان ایک دوسرے کی تلواروں' تیروں اور نیزوں سے ختم ہو گئے۔ ظاہر بات ہے پھر زوال تو شروع ہونا ہی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ((وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ عَبْدًا حَبَشِيًّا)) ''(میں تمہیں وصیت کرتا ہوں خلیفہ اور امام کا) حکم سننے اور ماننے کی خواہ وہ ایک حبشی غلام ہی ہو''۔ یعنی یہ نہ سمجھنا کہ تم برتر اور اعلیٰ ہو جبکہ وہ ادنیٰ اور کم تر ہے' بلکہ تمہارا خلیفہ یا امام حبشی غلام بھی ہو تو بھی تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاِنَّهٗ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ''اس لیے کہ تم میں سے جو بھی میرے بعد زندہ رہے گا وہ کثرت کے ساتھ اختلاف دیکھے گا''۔ اختلاف تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ہوا' جیسے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کے بارے میں اور لشکر اسامہ کی روانگی اور پھر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی امارت کے حوالے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف رائے ہو گیا تھا' لیکن پھر جو فیصلہ ہوا اسے سب نے تسلیم کیا۔ بہرحال ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ انسانی معاملات میں اختلاف نہ ہو' لیکن اگر اختلاف میں شدت آ جائے اور اپنی بات منوانے پر سارا زور ہو جائے تو پھر زوال کی جانب سفر شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ہر صاحب الرائے اپنی رائے پر اڑ جائے اور اسی کو اچھا سمجھے تو پھر جماعت کا نظم کیسے چلے گا۔ ایک حدیث میں ''اِعْجَابُ كُلِّ ذِیْ رَأْیٍ بِرَأْیِهٖ'' کو ''مہلکات'' میں سے شدید ترین قرار دیا گیا

ہے۔ظاہر بات ہے کہ جماعت میں بعض اوقات اپنی رائے کو پسِ پشت ڈال کر امیر کی رائے کو ماننا پڑتا ہے۔اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس وداعی وعظ میں تقویٰ اور سمع وطاعت کی خصوصی وصیت فرمائی۔

حدیث کا آخری ٹکڑا ہمارے آج کے موضوع ''مذمت بدعت'' سے متعلق ہے۔ آپؐ نے اپنی وصیت کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّينَ الرَّاشِدِينَ ' تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''پس تم پر میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی پیروی لازم ہے' تو تم اس کو لازم پکڑو اور اس کو اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ کر رکھو'' —— کچلیوں کے دانت (نواجذ) کسی چیز کو پکڑنے کے لیے ہوتے ہیں۔درندوں میں یہ کچلیاں (canines) اسی لیے لمبی ہوتی ہیں کہ انہوں نے زندہ جانور کے گوشت کو پھاڑنا ہوتا ہے اور کچلیاں ہی اس کام کے لیے کارگر ہوتی ہیں۔آگے کے دانت چیر پھاڑ کرنے کا یہ کام نہیں کر سکتے۔

آگے فرمایا: ((وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ ' فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ' وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''اور دیکھو ہرگز نئے پیدا ہونے والے معاملات کی پیروی نہ کرنا' اس لیے کہ ہر نئی پیدا شدہ چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی کا باعث ہے۔''

بدعت کا تیسرا سبب: اقامتِ دین کی جدّوجُہد اور جہاد سے پہلوتہی

بدعت کے اسباب کے حوالے سے یاد رکھیں کہ جب دین کا ہمہ گیر تصور سامنے نہیں رہتا تو بدعات پیدا ہوتی ہیں۔دین کے ہمہ گیر تصور میں عبادات بھی ہیں اور معاملات بھی' البتہ عبادات کی نسبت معاملات کی اہمیت زیادہ ہے۔عبادات کی کوتاہی کو تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا' اس لیے کہ وہ تو اللہ کے لیے ہیں اور اللہ تعالیٰ تو بہت معاف فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔لیکن اس کے برعکس معاملات کی کوتاہی کو اللہ تعالیٰ ازخود معاف نہیں کرے گا' اس لیے کہ یہ انسانوں کا حق ہے۔اگر آپ نے کسی کا حق مارا ہے تو اس کا حساب کتاب ہو کر رہے گا۔یا تو اس کے کچھ گناہ آپ کے حصے میں آئیں گے یا آپ کی کچھ نیکیاں اس کو دے دی جائیں گی جس کا آپ نے حق مارا ہے

——میں نے بتایا تھا کہ بدعت کا دوسرا سبب روحِ عبادت کا ختم ہو جانا ہے اور یہ نیک نیتی سے نہیں‘ بلکہ جہالت اور غفلت کی بنا پر ہوتا ہے۔

اب بدعت کے تیسرے سبب کی طرف آتے ہیں اور وہ ہے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد یعنی جہاد فی سبیل اللہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ ہم ان نشستوں میں ”حکمتِ دین کا عظیم خزانہ“ کے عنوان سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطالعہ کر چکے ہیں جس میں رسول اللہ ﷺ نے جہاد فی سبیل اللہ کو دین اسلام کی بلند ترین چوٹی قرار دیا ہے۔ اس طویل حدیث میں وارد رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ ذہن میں تازہ کیجیے:

((اِنَّ رَاْسَ ھٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ' وَاَنَّ قِوَامَ ھٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلَاةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكَاةِ وَاَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (۱)

”یقیناً دین کی جڑ یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ کوئی معبود نہیں سوائے تنہا اللہ تعالیٰ کے جس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور اس دین کو قائم رکھنے والی اور اس کی شیرازہ بندی کرنے والی چیز ہے نماز کو قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا۔ اور اس کی بلند ترین چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے گویا اسلام کو ایک درخت سے تشبیہہ دی ہے جس کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ کے وحدہٗ لاشریک اور محمد ﷺ کے آخری نبی ہونے کی گواہی دینا‘ اس کا تنا اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے‘ جبکہ اس کی چوٹی ”جہاد فی سبیل اللہ“ ہے—— آپ کو معلوم ہے کہ اصل مطلوب تو درخت کی چوٹی ہوتی ہے جس پر پھل لگتا ہے۔ اس طرح اسلام کی چوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے جو اللہ کے نظام کو غالب کرنے کا ایک ذریعہ ہے‘ لیکن موجودہ دور میں کچھ لوگوں کی زندگی سے جہاد خارج ہو چکا ہے۔ انہیں تصور ہی نہیں کہ جہاد بھی کوئی فرض ہے۔ یہ لوگ تو باطل کے نظام میں بڑی آسودگی سے رہتے ہوئے اپنے کاروبارِ دنیا میں مگن ہیں۔ انہیں اس سے غرض ہی نہیں کہ ان کے اردگرد کیا ہو رہا ہے‘ اللہ کے دین کی دھجیاں کس طرح بکھیری جا رہی ہیں‘ شریعت کو کیسے پامال کیا

(۱) مسند احمد‘ ح ۲۱۸۳۰

جارہا ہے‘ دین میں کیسی تبدیلیاں کی جارہی ہیں۔ لہٰذا جب اقامتِ دین کی جدوجہد خارج از بحث ہوگئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا تصورِ دین سکڑ کر رہ گیا۔

بدعت کا چوتھا سبب: معاملات میں اَحکامِ الٰہیہ سے روگردانی

کچھ لوگ وہ ہیں جو معاملات میں بھی دین کے احکام کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کاروبار میں سود لینا دینا پڑتا ہے‘ بینک سے سودی قرض لیے بغیر کاروبار نہیں چلتا‘ چھوٹے مکان کو بڑی حویلی میں تبدیل کرنے کے لیے بینک سے قرضہ لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح باقی معاملات میں وعدہ خلافی ہورہی ہے‘ جھوٹ بولا جارہا ہے‘ دھوکہ دہی چل رہی ہے‘ ملاوٹ عروج پر ہے‘ وغیرہ وغیرہ۔ جب معاملات کے اندر بھی کمی ہوگئی تو اب سارا گاڑھا پن عبادات میں آ گیا۔ اس کے لیے میں نے آپ کو مثال دی تھی کہ اگر آپ ایک طشت میں پانی ڈالتے ہیں تو اس پانی کی اونچائی ایک انچ یا دو انچ ہوگی اور اگر اسی پانی کو آپ کسی جار یا بوتل میں ڈال دیں تو وہ ایک فٹ اونچا ہو جائے گا۔ اسی طرح دین کے معاملہ میں جب آپ نے اس کی بنیاد (base) کو تنگ کر دیا بایں طور کہ نہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد رہی اور نہ معاملات کی احکامِ الٰہی کے مطابق پیروی رہی‘ تو پھر سارا زور عبادات پر چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر سال عمرہ اور حج ہورہا ہے‘ لیکن اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کمائی حرام کی ہے یا حلال کی۔ کچھ لوگ تو بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ میں ہر سال حج کو جاتا ہوں اور میرا مصلّٰی تو مسجد حرام اور مسجد نبوی کی پہلی صف کے اندر مقرر ہے۔ یہ لوگ وہاں شُرطوں کو رشوت دے کر اپنے مصلّے پہلی صفوں میں رکھواتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے آپ نبی آخر الزماں ﷺ کا طرزِ عمل دیکھیں کہ آپؐ نے عمرۂ قضا جو صلح حدیبیہ کے بعد ہوا‘ کے بعد باقی ساری زندگی کوئی عمرہ نہیں کیا‘ حالانکہ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو گیا اور آپؐ کو عرب کے بادشاہ کی حیثیت حاصل ہوگئی‘ اگر عمرہ کرنا چاہتے تو کوئی روکنے والا نہیں تھا‘ لیکن آپؐ نے کوئی عمرہ نہیں کیا بلکہ آپؐ نے ساری جدوجہد دین کو غالب کرنے کے لیے کی اور اپنا سارا وقت اس کام میں لگایا۔ اسی طرح رسول

اللہ ﷺ نے ایک حج کے علاوہ ساری زندگی کوئی حج نہیں کیا' حالانکہ رمضان المبارک ۸ ہجری کو مکہ فتح ہو چکا تھا' آپؐ چاہتے تو اس سال حج کر سکتے تھے لیکن آپؐ حج کیے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔ پھر ۹ ہجری میں بھی آپؐ نے خود حج نہیں کیا بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر کر کے حجاج کا قافلہ مدینہ سے روانہ کر دیا۔ آپؐ نے ساری زندگی میں صرف ۱۰ ہجری کو حج کیا' جسے ہم ''حجۃ الوداع'' کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل سے ہمیں سمجھنا چاہیے کہ دین میں مختلف عناصر کے درمیان کیا نسبت و تناسب (ratio proportion) ہے اور کون سی چیز کتنے درجے میں مطلوب ہے۔ لیکن جب اس چیز کا خیال نہیں رکھا جائے گا اور سارا زور صرف عبادات تک محدود ہو جائے گا تو پھر عبادات کے معاملے میں اپنے اوپر سختی بھی ہوگی' مبالغہ بھی ہوگا' یہاں تک کہ پھر بدعات ایجاد ہو جائیں گی۔

اس ضمن میں آپ دیکھیں کہ ہمارے ہاں خاص طور پر شب براءت کے حوالے سے یہ تصور ہے کہ اس رات میں زیادہ سے زیادہ عبادت کا اہتمام کیا جائے ـــــ اس کے علاوہ اس رات جو آتش بازی یا جشن اور ہنگامہ ہوتا ہے اس کا تو سرے سے دین سے کوئی سروکار ہے ہی نہیں ـــــ عبادت کے لیے بھی خاص طور پر اس رات کو مقرر کر لیا گیا ہے' حالانکہ اس رات کی فضیلت کے حوالے سے کوئی قوی احادیث موجود نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے شب معراج کا معاملہ ہے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ پوری توجہ اب عبادات پر مرتکز ہو چکی ہے اور سارا زور عبادات پر ہی صرف ہو رہا ہے۔

بدعات کا نتیجہ: اختلافات اور رسومات کی کثرت

عبادات کے دو پہلو ہیں' ایک ہے ان کا ظاہر اور رسم' جبکہ ایک ہے باطن اور روح۔ مثلاً نماز کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ آپ نے اللہ اکبر کہتے ہوئے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھایا اور پھر ہاتھ باندھ دیے' ثنا پڑھی' فاتحہ پڑھی اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا' رکوع میں گئے' تسبیحات پڑھیں' پھر کھڑے ہو گئے' پھر سجدے میں گئے' تسبیحات پڑھیں' پھر بیٹھے' پھر سجدے میں گئے' پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اگلی رکعت اسی طرح بغیر ثنا کے پڑھی۔

پھر قعدہ میں بیٹھے اور سلام پھیر دیا۔ یہ سارا عمل رسمِ نماز اور نماز کی ظاہری شکل ہے۔ نماز کا باطنی پہلو یہ ہے کہ نماز کو خشوع و خضوع کے ساتھ پڑھا جائے' قراءت کے وقت آیات پر غور کیا جائے —— بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ کیفیت تھی کہ قراءت کے دوران جب جہنم یا عذابِ جہنم کا تذکرہ آتا تو آنکھیں بہہ پڑتیں' رقت طاری ہو جاتی —— دورانِ نماز اپنے اندر احسان کی کیفیت پیدا کی جائے جس کا ذکر حدیث جبریل میں بایں الفاظ ہوا ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ' فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''(احسان یہ ہے کہ) تو اللہ تعالیٰ کی عبادت یوں کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے' اور اگر یہ مقام حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ خیال تو رہے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے''—— اب ہوا یوں کہ جب سارا زور صرف عبادات پر آ گیا تو نماز کا باطنی اور روحانی پہلو تو ختم ہو گیا' بس رسم اور ظاہری پہلو باقی رہ گیا۔ بقول اقبال ؎

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی!

جب روحِ دین اور روحِ عبادت سے توجہ ہٹ جائے گی تو دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف ہو گا اور ''من دیگرم تو دیگری'' کی نوبت آ جائے گی۔ آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ آمین بِالجَہر اور بِالسِّر کہنے والوں اور رفع یدین کرنے اور نہ کرنے والوں میں لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ بعض جگہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص بھول کر دوسرے مکتبہ فکر کی مسجد میں چلا جائے تو اسے کہا جاتا ہے کہ ہماری مسجد میں کیوں آئے ہو؟ اگر آئندہ آئے تو ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اللہ کی پناہ! کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر مسجدیں الگ بنا لیں' ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئے' لیکن دین کے بڑے معاملات (سود' جھوٹ' حرام کمائی' ملاوٹ' دھوکہ دہی وغیرہ) کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بولتا' وہاں تو لکڑ ہضم' پتھر ہضم والا معاملہ ہے۔

عبادات پر ساری توجہ مرتکز ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ اختلافات ہیں' جبکہ اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ رسومات زیادہ سے زیادہ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال شادی بیاہ

کا موقع ہے۔ ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے لیے اَن گنت رسمیں رائج ہوگئی ہیں۔ اس حوالے سے یاد رکھیں کہ شادی کے موقع پر لڑکی والوں کے ہاں کسی دعوتِ طعام کا ثبوت احادیث اور اسلامی تاریخ میں نہیں ملتا۔ پوری شادی میں صرف ایک دعوتِ طعام ہے اور وہ لڑکے کی طرف سے دعوتِ ولیمہ ہے۔ اس کی بھی وجہ ظاہر ہے کہ اس کا گھر آباد ہوا ہے تو وہ خوشی منائے اور اپنے دوستوں کو اس خوشی میں شریک کرے ___ دعوت ولیمہ نہ صرف ثابت ہے بلکہ اس کی تاکید بھی ہے۔ احادیث کی کتابوں میں ''باب الولیمہ'' کے عنوان سے پورا پورا باب موجود ہے ___ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ پہلے لڑکی دیکھنے کے لیے ایک پورا لشکر جاتا ہے اور لڑکی والوں کو بادلِ نخواستہ طعام کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کرنا پڑتا ہے' پھر منگنی کی باری آتی ہے' پھر تاریخ مقرر کرنے کی' پھر تیل اور مایوں کی' پھر مہندی کی۔ ان تمام رسومات میں سے اکثر کا بوجھ لڑکی والوں پر پڑتا ہے اور انہیں ہر تقریب میں دعوتِ طعام کا انتظام کرنا پڑتا ہے تاکہ لڑکی کو سسرال میں طعنے نہ سننے پڑیں۔ یہ سب تو وہ رسومات ہیں جو شادی کے دن سے پہلے کی ہیں۔ جب شادی کا دن آتا ہے تو پہلے سہرابندی ہوتی ہے' دولہے کو سلامیاں پیش کی جاتی ہیں' پھر بارات کا لشکر لڑکی والوں کے ہاں جاتا ہے اور وہاں نکاح ہوتا ہے۔ وہاں بھی دولہا میاں سلامیاں وصول کرتے ہیں۔ نکاح کے بعد وہاں دعوتِ طعام کا عظیم الشان اہتمام ہوتا ہے جس میں اسراف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور پھر بہت سا کھانا برباد بھی کر دیا جاتا ہے۔

جن لوگوں کے پاس روپے پیسے کے انبار ہیں وہ تو اپنی دولت کے اظہار اور نمود و نمائش کے لیے یہ ساری رسومات ادا کرتے ہیں ___ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تبذیر ہے: ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷) ''اپنے نام و نمود کے لیے خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں'' ___ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک غریب آدمی کو بھی دیکھا دیکھی یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ اس کا دردِ سر ہے کہ وہ اس کے لیے کہیں چوری کرے' ڈاکہ ڈالے یا رشوت لے' لیکن اسے ہر حال میں یہ کرنا ہے' ورنہ بیٹی کیا سوچے گی کہ میری شادی پر میرا باپ یہ بھی نہ کر سکا! یہی وہ خرافات

ہیں جن کی وجہ سے ان لوگوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں جن کے ہاں چند بیٹیاں پیدا ہو جائیں۔ اس حوالے سے اسلام کا اصول یاد رکھیں کہ شادی میں لڑکی والوں کا ایک پیسہ بھی نہیں خرچ ہونا چاہیے۔ مہر' محفل نکاح میں منہ میٹھا کرانا اور پھر دعوتِ ولیمہ' یہ سب لڑکے والوں کی ذمہ داری ہے' لڑکی والوں کا تو سرے سے کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔ جہیز کے حوالے سے بھی یہ نوٹ کر لیں کہ اس کا اسلام میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے' لیکن ہمارے ہاں سارا معاملہ الٹ ہے۔ اس کی وجہ ایک بار پھر نوٹ کر لیں کہ جہاں کوئی بدعت آ جاتی ہے وہاں سے کوئی سنت غائب ہو جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلاَّ رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ)) (۱)

''جو قوم بھی کوئی بدعت ایجاد کرتی ہے تو اس کی جگہ سے سنت اٹھالی جاتی ہے۔ پس سنت کو مضبوطی سے پکڑنا بدعت ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔''

احیاءِ سنت بمقابلہ ایجادِ بدعت

موضوع کی مناسبت سے میں ایک اور حدیث آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ یہ مسئلہ اچھے طریقے سے واضح ہو جائے۔ حضرت بلال بن حارث المزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّهُ مَنْ اَحْيَا سُنَّةً مِنْ سُنَّتِيْ قَدْ اُمِيْتَتْ بَعْدِيْ فَاِنَّ لَهُ مِنَ الْاَجْرِ مِثْلُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْئًا)) (۲)

''یقیناً جس شخص نے میری کسی ایسی سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مردہ ہو چکی تھی تو اس شخص کو اتنا اجر ملتا رہے گا جتنا اس سنت پر عمل کرنے والے کو ملے گا اور عمل کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی بھی نہیں ہوگی۔''

یعنی جس نے کسی مردہ سنت کو دوبارہ زندہ کیا تو اس کے حساب میں تمام عمل کرنے والوں

---

(۱) مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث عضیف بن الحارث رضی اللہ عنہ' ح ۱۶۳۵۶۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب العلم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدعة۔

جتنا ثواب کریڈٹ ہوتا رہے گا۔ اب دیکھئے ہم نے مسجد میں نکاح کی سنت کو ازسرِنو زندہ کیا ہے' حالانکہ لوگ تو اسے ہتک اور توہین سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہم نے جماعتی زندگی میں بیعت کی سنت کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو مغرب سے آیا ہوا نظام مسلط کر دیا گیا کہ ووٹ کے ذریعے صدر کو منتخب کرو' حالانکہ اسلام میں تو بیعت کا نظام ہے اور اسی کے ذریعے خلفاء کا چناؤ ہوا ہے۔ تیرہ سو برس کی اسلامی تاریخ میں بیعت کے علاوہ کسی اور طریقہ کا نشان تک نہیں ہے۔ خلافت بھی بیعت کی بنیاد پر ہے اور ملوکیت بھی۔ بنواُمیّہ اور بنوعباس کے خلفاء بھی بیعت لیتے تھے۔ پھر جب مغربی استعمار کا دور آ گیا تو اس کے خلاف جو بھی عسکری تحریکیں اُبھریں وہ بھی بیعت کی بنیاد پر بنی ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں سید احمد شہید کی تحریک شہیدینؒ' لیبیا میں سنوسی تحریک' سوڈان میں مہدی سوڈانی کی تحریک اور روس میں امام شامل کی تحریک' سب میں نظم کی بنیاد بیعت ہی تھی۔ عہدِ ملوکیت میں جب مذہب و سیاست میں تقسیم نمایاں ہونے لگی تو ہمارے ہاں ''بیعتِ ارشاد'' وجود میں آئی۔ بہرحال یہ ایک اچھی بات تھی کہ لوگوں کو اللہ کا کلمہ سکھا دینا' کوئی اچھی بات بتا دینا یا نیکی کی تلقین کر دینا — لیکن اجتماعی زندگی کے حوالے سے بیعت کی سنت تقریباً مردہ ہو چکی تھی اور یہ اللہ کا ہم پر خصوصی فضل ہے کہ اس نے ہمیں بیعت کے نظام کو ازسرِنو زندہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

حدیث کے اس حصے میں تو احیاءِ سنت کی فضیلت کا بیان تھا' جبکہ روایت کے اگلے حصہ میں بدعت ایجاد کرنے والے کے انجامِ بد کا تذکرہ ہے۔ آگے آپ ﷺ نے فرمایا:

((وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةَ ضَلَالَةٍ لَا تُرْضِي اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ اَوْزَارِ النَّاسِ شَيْئًا)) ☆

☆ اس مضمون سے ملتی جلتی ایک روایت امام مسلم نے بھی نقل کی ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

((مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ كُتِبَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ)) (صحیح مسلم' كتاب العلم' باب من سن سنة حسنة او سيئة ......)

◄◄

''اور جس شخص نے کوئی گمراہی والی بدعت ایجاد کی جو اللہ اور اُس کے رسول کو ناپسند ہو تو اس شخص کو بھی اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا اس بدعت پر عمل کرنے والوں کو ملے گا (یعنی جتنے لوگ بھی اس بدعت کو کریں گے اس کے برابر گناہ بدعت ایجاد کرنے والے کے حساب میں درج ہوتا رہے گا) اور اس بدعت پر عمل کرنے والے لوگوں کے اپنے بوجھ میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

بدعت اور بدعتی کی توقیر کی مذمت

اس ضمن میں ایک مرسل حدیث ملاحظہ ہو جسے امام بیہقیؒ نے اپنی کتاب ''شعب الایمان'' میں نقل کیا ہے:

((مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰی هَدْمِ الْاِسْلَامِ))(۱)

''جس شخص نے کسی بدعتی کی توقیر کی تو اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں اس کی مدد کی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے کسی فاسق کی مدح سرائی کو اللہ کے غضب کا باعث قرار دیا۔ امام بیہقیؒ ''شعب الایمان'' میں حضرت انس ؓ سے مروی حدیث نقل کرتے ہیں:

((اِذَا مُدِحَ الْفَاسِقُ غَضَبَ الرَّبُّ تَعَالٰی وَاهْتَزَّلَهُ الْعَرْشُ))(۲)

''جب کسی فاسق کی مدح سرائی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس درجے غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کا عرش کانپ اٹھتا ہے۔''

بدعات' رسومات اور نئی نئی ایجادات اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں'

◀◀ ''جس نے اسلام میں کسی نیک کام کو جاری کیا اور بعد میں لوگوں نے اس پر عمل بھی کیا تو اس شخص کو ہر عمل کرنے والے کے بقدر ثواب ملے گا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں سے بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اور جس نے اسلام میں کسی برے کام کو جاری کیا اور بعد میں لوگوں نے وہ کام کیا بھی تو اس شخص پر ہر عمل کرنے والے کے بوجھ (گناہ) کے بقدر بوجھ ہوگا اور کرنے والوں کے بوجھ میں سے بھی کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔'' (اضافہ از مرتب)

(۱) مشکاۃ المصابیح' کتاب الایمان' باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ' الفصل الثالث۔

(۲) مشکاۃ المصابیح' کتاب الآداب' باب حفظ اللسان والغیبۃ والشتم' الفصل الثالث۔

لٰہذا ہمیں ایک اصول طے کر لینا چاہیے کہ جو چیز قرآن وسنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے وہ سر آنکھوں پر (مثلاً شادی بیاہ میں دعوت ولیمہ) اور جو ثابت نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں باہر سے آئی ہوئی چیز ہے' اس لیے اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس پر عمل کر کے اللہ کے غضب کو دعوت نہ دی جائے۔ مثلاً جہیز کا کوئی تصور سرے سے اسلام میں ہے ہی نہیں' بلکہ اس کا ایک ہندوانہ پس منظر ہے۔ ہندوؤں میں لڑکی کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا' اس لیے جب وہ اپنی لڑکی کو گھر سے رخصت کرتے ہیں تو کچھ دان دہیج دے کر رخصت کرتے ہیں کہ جاؤ اب تمہارا اس گھر سے کوئی سروکار نہیں' ہماری وراثت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں تو لڑکی باقاعدہ وارث ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں بھی ہندوؤں کے دیکھا دیکھی بیٹی کو جہیز دے کر عام طور پر وراثت سے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک بڑی مثال ہے اس بات کی کہ جہاں بدعت آئی وہاں سنت غائب ہو گئی' یعنی جہیز دے دیا اور وراثت کے قرآنی حکم کو پسِ پشت ڈال دیا' جس کے بارے میں قرآن میں الفاظ آئے ہیں: ﴿...... مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ط نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝﴾ یعنی ترکہ خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ اسے وارثوں میں تقسیم کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا حصہ ہے۔

بدعات سے بچنے کا فارمولا

مذمت بدعت کے حوالے سے میں نے کئی احادیث پچھلے خطابِ جمعہ اور آج کے خطاب میں بیان کی ہیں۔ ان احادیث کی روشنی میں ہمیں بدعات اور محدثات الامور سے بچنے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔ چیزوں کو پرکھنے کے لیے میں نے آپ کو ایک فارمولا بتا دیا کہ پہلے یہ تلاش کیجیے کہ یہ کام قرآن وسنت سے ثابت ہے یا نہیں۔ اگر ثابت ہے تو پھر یہ دیکھیں کہ کس درجے میں مطلوب ہے' دین میں یہ کس نسبت وتناسب کے ساتھ ثابت ہے۔ اگر آپ ان دونوں باتوں کو پیش نظر رکھیں گے تو ان شاء اللہ آپ بدعت سے بچ جائیں گے۔ یاد رکھیں کہ کینسر بھی ہمارے جسم کا ایک ٹشو ہی ہوتا ہے جو غیر متناسب طور پر (out of proportion) بڑھنا شروع کر دیتا ہے اور

اس طرح وہ ہمارے جسم کے بیرونی سطح پر گلٹی کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے یا پھر جسم کے اندر رہتے ہوئے جسم کے باقی ٹشوز کو کھاتا رہتا ہے اور پھر بالآخر انسان موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ ہمارے دین کا ہے۔ اگر آپ دین کے کسی معاملہ پر غیر متناسب طور پر عمل کریں گے تو یہ دین کا کینسر بن جائے گا۔ لہٰذا سنت سے ثابت شدہ چیزوں پر بھی توازن اور اعتدال کے ساتھ عمل کرنا چاہیے۔ سنت کی پیروی صرف اس کا نام نہیں ہے کہ جو چیز احادیث سے ثابت ہے بس اس پر عمل کر لیا' بلکہ اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس پر حضور اکرم ﷺ کا کس قدر عمل تھا۔ اگر آپ اس کے مطابق عمل کریں گے تو پھر سنت کا صحیح حق ادا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ کام جس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی گزار دی یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد اس کو تو ہم نے اپنے ذہنوں سے خارج کر رکھا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی سب سے بڑی سنت ہے' لیکن ہم نہ تو اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہ باقی معاملات پر دین کے مطابق عمل پیرا ہوتے ہیں۔ معاملات میں تو ہم حیلوں بہانوں سے ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ سود کے حوالے سے کہہ ڈالتے ہیں کہ کیا کریں اس کے بغیر کاروبار چلتا ہی نہیں ہے۔ وکلاء حضرات جھوٹ بولنے کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں قانون ایسا ہے کہ صحیح سے صحیح مقدمہ بھی جھوٹ کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ سرکاری ملازم رشوت لینے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے اس میں گزارا نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ایک دفعہ مجھے بڑا حیرت ناک تجربہ ہوا تھا۔ واپڈا ہاؤس کے آڈیٹوریم میں سیرت کا ایک جلسہ تھا اور میں نے اس میں تقریر کرنی تھی۔ مجھے لینے کے لیے ایک گاڑی آئی جس کا ڈرائیور دیکھنے میں بہت چست تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ سمجھ دار بھی ہے اور چالاک بھی۔ راستے میں' میں پوچھ بیٹھا کہ سرکاری پٹرول تو نہیں بیچتے؟ اس نے دھڑلے سے کہا: بیچتے ہیں۔ میں نے پوچھا: بتا کر بیچتے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ میں ان سے بھی کہتا ہوں کہ جو تنخواہ تم مجھے دیتے ہو اس میں مجھے دو کمروں کا مکان کرائے پر لے دو تو میں یہ پٹرول بیچنا چھوڑ دوں گا — یہ معاملہ ہے

ہمارے ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ہمارے نظام کا بھی قصور ہے جس کو بدلنے کا نام اقامت دین کی جدوجہد ہے اور وہ ہم نے کرنی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس نظام کے اندر رہتے ہوئے بے ایمانیاں' سودخوری' جھوٹ' ملاوٹ' دھوکہ دہی اور رشوت وغیرہ' یہ سب کرتے رہنا ہے۔ اصل بات وہی ہے کہ جب دین کے تصور میں محدودیت پیدا ہو جائے اور روح کے بجائے صرف ظاہری شکل پیش نظر رہ جائے تو پھر معاشرہ بدعات اور محدثات کا گھنا جنگل بن جاتا ہے۔ اس طرح سنت اور نیکی کے کام ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ برائیاں جنم لے لیتی ہیں۔

آج کے موضوع کو سمیٹتے ہوئے ایک بہت پیاری حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰى)) ''میری اُمت پوری کی پوری جنت میں جائے گی سوائے اس شخص کے جو خود ہی انکار کر دے''۔۔۔۔ کسی بھی بات کو سمجھانے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں لیکن یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا متوجہ کرنے کے حوالے سے بہت پیارا انداز ہے کہ میری تمام اُمت جنت میں جائے گی سوائے اس شخص سے جو خود ہی جنت میں جانے سے انکار کر دے۔ یہ سنتے ہی سب صحابہ پوری طرح متوجہ ہو گئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا یارسول اللہ! ایسا کون بدبخت ہو گا جو جنت میں جانے سے خود ہی انکار کرے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ اَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ اَبٰى))(۱) ''جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے (جنت میں جانے سے خود ہی) انکار کر دیا۔''

اللہ ربّ العزت سے دعا ہے کہ ہمیں اس حدیث کے مثبت پہلو پر عمل کرنے' مُردہ سنتوں کو زندہ کرنے اور بدعات کی پیروی سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

---

(۱) صحيح البخاري' كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة' باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ۔

حدیث

10

اَکلِ حلال کی اہمیت

۲۱/ ستمبر ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ــــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝ (البقرۃ)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم :

((اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ، لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا، وَاِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِہِ الْمُرْسَلِیْنَ، فَقَالَ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط﴾ (المؤمنون:۵۱) وَقَالَ : ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ﴾ (البقرۃ:۱۷۲) ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ، اَشْعَثَ اَغْبَرَ، یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَاءِ : یَا رَبِّ! یَارَبِّ! وَمَطْعَمُہٗ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُہٗ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُہٗ حَرَامٌ، وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ، فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ!))(۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو وہی حکم دیا ہے جو رسولوں کو دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اے میرے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور اچھے عمل کرو''۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان سے فرمایا ہے: ''اے ایمان والو! ہم نے جو پاکیزہ چیزیں

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا۔

تمہیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ''۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرے' اس کے بال پراگندہ اور جسم غبار آلود ہو' وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کر یارب! یارب! کہے' مگر اس کی حالت یہ ہو کہ اس کا کھانا' پینا' لباس اور غذا ہر چیز حرام ہو تو اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے!''

معزز سامعین کرام!

آج ہمارا ''قران السعدین'' ہو رہا ہے' بایں معنی کہ دو مضمون جڑ رہے ہیں۔ رمضان اور روزے سے متعلق ایک اہم بات جو سورۃ البقرۃ کے ۲۳ویں رکوع کی آخری آیت میں بیان ہوئی ہے' آج ہمارے زیر درس ہے اور اربعین نووی کی حدیث ۱۰ جو اسی موضوع سے متعلق ہے' وہ بھی آج ہمارے زیر مطالعہ آئے گی۔

اس حوالے سے یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ارکانِ اسلام میں سے تیسرا رکن ''صوم'' اس اعتبار سے بہت ہی نمایاں ہے کہ اس کے جملہ احکام نہایت اختصار کے ساتھ سورۃ البقرۃ کی چھ مسلسل آیات (۱۸۳ تا ۱۸۸) میں موجود ہیں۔ ان آیات میں روزے کا ابتدائی حکم بھی آ گیا' تکمیلی احکام بھی آ گئے' صوم کی حکمت بھی آ گئی' صوم کے لیے رمضان المبارک کے انتخاب کا سبب بھی آ گیا' اور رمضان المبارک کے حوالے سے قیام اللیل کی جو اضافی عبادت ہے اس کا ذکر بھی ان آیات میں ہو گیا۔ پھر ان سب کا مجموعی حاصل اور آخری منزل بھی انہی آیات میں بیان ہو گئی۔ چنانچہ نوٹ کیجیے کہ پہلی آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ'' پر' یعنی تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ تم سے پہلی اُمتوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تیسری آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'' پر ــــ تاکہ تمہارے اندر قرآن مجید کی عظمت کا صحیح ادراک پیدا ہو جائے اور پھر تم اس کا شکر ادا کر سکو جیسے کہ اس کے شکر کا حق ہے۔ چوتھی آیت ختم ہوتی ہے: ''لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ'' پر ــــ تاکہ وہ ہدایت کی بلند ترین منزل ''رشد'' پر فائز ہو جائیں۔ پانچویں آیت پھر لفظ تقویٰ ''لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ'' پر ختم ہوتی ہے۔ یعنی یہ سارے احکام ہم نے تفصیل سے اس لیے بیان کیے ہیں تاکہ لوگ تقویٰ اختیار کر سکیں۔

تقویٰ کا معیار: اَکلِ حلال

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے؟ —— یہ لفظ ہمارے ہاں عام استعمال ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص بڑا متقی ہے' فلاں بڑا پرہیز گار ہے۔ اس لحاظ سے تقویٰ کا کوئی نہ کوئی تصور ہر شخص اپنے ذہن میں رکھتا ہے —— عام طور پر صورت یہ ہے کہ تقویٰ کو صرف عبادات سے متعلق مانا جاتا ہے اور کسی بھی شخص کے متقی ہونے کا فیصلہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ وہ نماز کتنی پابندی اور کتنے خشوع وخضوع سے پڑھتا ہے' روزہ کس اہتمام سے رکھتا ہے' زکوٰۃ کے علاوہ اللہ کی راہ میں کتنا کچھ خرچ کرتا ہے اور حج عمرے کتنے کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں گویا تقویٰ کے معیارات ہیں۔ بعض لوگ عبادات کے ساتھ ساتھ انسان کے ظاہر کو بھی تقویٰ کا معیار سمجھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُس کا لباس' وضع قطع اور رہن سہن وغیرہ شریعت کے اصولوں کے کتنے مطابق ہے اور اس سے اتباعِ رسول کا کتنا اظہار ہو رہا ہے —— یہ ساری چیزیں تقویٰ کے حوالے سے ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔ لیکن اگر تقویٰ کا پیمانہ یہی مانا جائے تو پھر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۸ کا بظاہر صوم اور رمضان سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ اس آیت میں ایک علیحدہ مضمون بیان ہوا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ!''

اس حوالے سے یہ نوٹ کر لیں کہ اس آیت میں تقویٰ کا معیار' اس کی کسوٹی اور اس کا پیمانہ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اس لیے دیے جا رہے ہیں تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے اور تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ اور معیار ہے: ''اَکلِ حلال''۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا میں ہم زندگی گزارتے ہیں تو ایک دوسرے سے لین دین ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے کچھ پیسوں کے عوض کوئی چیز خریدی اور بیچنے والے نے اگر اس خرید وفروخت میں کسی بھی قسم کا دھوکہ کیا یا اس شے کا کوئی نقص چھپایا تو جو پیسے اس چیز کے عوض آپ اُسے دے رہے ہیں وہ اس کے لیے حرام ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مدینہ کی ایک

منڈی میں تشریف لے گئے تو وہاں گندم کا ایک ڈھیر دیکھا۔ آپ ﷺ نے اس ڈھیر کے اندر اپنا دست مبارک داخل کیا تو معلوم ہوا کہ نیچے نم آلود گندم ہے جبکہ اوپر کی گندم خشک ہے۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا))(۱) یعنی جس نے اس طرح کی دھوکہ بازی کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ گویا یہ تو سراسر دھوکہ ہے اور کسی شے کا نقص چھپا کر اسے بیچنے سے ایسی کمائی حرام ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ نوٹ کر لیں کہ تقویٰ کا لٹمس ٹیسٹ معاملات کے اندر ہے' ورنہ داڑھیوں کا لمبا ہونا اور پائینچوں کا ٹخنوں یا آدھی پنڈلی تک اونچا ہونا تقویٰ کا معیار نہیں ہے۔ تقویٰ کا اصل معیار رزقِ حلال اور اَکل حلال ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر نمازوں کے ڈھیر اور نوافل کے انبار بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اصل یہی ہے کہ آپ جو کھا رہے ہیں وہ اصلاً حلال بھی ہو اور پھر جائز و حلال طریقے ہی سے حاصل کیا گیا ہو۔ اب اگر ایک شخص سور کا گوشت کھا رہا ہے تو آپ سب کہیں گے چھی چھی' حرام کھا رہا ہے' لیکن ایک شخص کھا تو بکری کا گوشت رہا ہے مگر اُس نے وہ گوشتکسی کی جیب کاٹ کر خریدا ہے تو یہ حلال گوشت چونکہ اس نے حرام طریقے سے کمایا ہے تو یہ بھی حرام ہے۔ اس طریقے سے حرام کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

اس حوالے سے آخری بات جو میں کہا کرتا ہوں' ذرا کان کھول کر سن لیجیے کہ ایک ایسے ماحول میں جس میں دینِ حق غالب نہ ہو بلکہ باطل کا نظام رائج ہو' اس میں سانس لینا بھی حرام ہے۔ اِلا یہ کہ سانس لینے یا غذا کھانے سے جو قوت پیدا ہوتی ہے اگر اس کا اکثر و بیشتر اس نظامِ باطل کو ختم کر کے نظامِ حق کو قائم کرنے کی جِدّ و جُہد میں خرچ ہو رہا ہے تو جائز ہے' ورنہ سانس لینا بھی حرام ہے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا!

بہرحال بیع و شراء میں دھوکہ دینا' فریب کرنا' اپنے مال کے نقص کو چھپانا حرام ہے اور ان ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے۔

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب قول النبی ﷺ من غشنا فلیس منا۔ وسنن الترمذی' ابواب البیوع' باب فی کراھیۃ الغش فی البیوع۔

رشوت اور اس کے اثرات

آیت کے اگلے حصہ میں اکلِ حرام کی ایک خاص صورت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا:
﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ''تم اپنے مال کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا تاکہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو گناہ کے ساتھ''— ''دَلو'' کہتے ہیں ڈول کو اور ڈول کنوئیں میں اتارا جاتا ہے پانی کھینچنے کے لیے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنا مال کسی سرکاری افسر کو اس لیے پیش کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے کسی اور کا مال ہڑپ کر سکے۔ اسے عام اصطلاح میں ''رشوت'' کہا جاتا ہے۔ تو جس طرح پانی تک پہنچنے کے لیے ڈول کو ذریعہ بنایا جاتا ہے اسی طریقے سے لوگوں کی حق تلفی کرنے یا ان کا مال غلط طریقے پر ہڑپ کرنے کے لیے تم نے اپنے مال کو ڈول بنایا حکام تک پہنچنے کا' تاکہ اس کے ذریعے سے ان کے ہاتھ میں موجود اختیارات کو تم اپنے حق میں استعمال کر سکو۔ اسی کا نام رشوت ہے اور ایک حدیث میں صاف طور پر آیا ہے:
((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ فِي الْحُكْمِ)) (۱) یعنی رسول اللہ ﷺ نے مقدمات میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ رشوت کے ضمن میں ایک حدیث تو بہت مشہور ہے:

((اَلرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِي النَّارِ)) (۲)

''رشوت دینے والا اور رشوت کھانے والا دونوں جہنمی ہیں۔''

ہم ''راشی'' کا لفظ رشوت خور یعنی رشوت لینے والے کے لیے بولتے ہیں' جبکہ عربی زبان اور حدیث کی اصطلاح میں ''راشی'' رشوت دینے والے کو کہتے ہیں۔ اگر آپ گہرائی میں تجزیہ (analysis) کریں تو معلوم ہوگا کہ رشوت کی اصل بنیاد رشوت دینا ہے۔ وہ اس طرح کہ لوگ غلط کام کرانے کے لیے حکام اور سرکاری افسران کو رشوت کی عادت ڈالتے ہیں اور اپنا کام نکلوانے کے لیے اُن کی مٹھیاں گرم کرتے ہیں۔ جب وہ

---

(۱) سنن الترمذی' ابواب الاحکام' باب ما جاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم۔

(۲) الترغیب والترھیب للمنذری ۳/۱۹٤۔ ومجمع الزوائد للھیثمی ٤/۲۰۲' رجالہ ثقات۔

رشوت کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے بغیر وہ کوئی کام کرتے ہی نہیں ہیں اور ایک آسان سے کام کو اتنا پیچیدہ بنا دیتے ہیں کہ نہ چاہتے ہوئے بھی رشوت دینی پڑتی ہے۔

عام طور پر لوگ اپنے غلط کام کرانے یا کسی کا حق تلف کرنے کے لیے اپنے مال کو حکام تک پہنچنے کا ذریعہ بنا رہے ہوتے ہیں تاکہ اُن کے اختیارات کے ناجائز استعمال سے کچھ ناجائز آمدنی یا کچھ غیر قانونی مفادات حاصل کر سکیں' یا سرکاری محصولات (ٹیکس' انکم ٹیکس وغیرہ) میں کمی کرا سکیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا اور آپ میں سے بہت سوں کو تو تجربہ بھی ہوا ہوگا کہ جب نئے نوجوان افسر کسی جگہ چارج لیتے ہیں تو اس وقت ان میں کچھ اصول وقواعد کی پابندی نظر آتی ہے اور ان کی نظر میں دیانت داری اور قوم کے ساتھ خلوص و اخلاص بھی کوئی شے ہوتی ہے' لیکن اس نظام میں پہلے سے موجود خرانٹ قسم کے افسران اور کرپٹ اہلکاران نوجوان افسروں کو پٹی پڑھاتے ہیں کہ تم تو ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہو اور اس طرح تو ترقی کے راستے تم پر بند ہو جائیں گے' تم آگے بڑھ نہیں سکو گے۔ جب تک تم اپنے سے اوپر والے حکام کو راضی نہیں رکھو گے تمہاری ترقی کیسے ہوگی؟ دوسرے یہ کہ وہاں موجود حرام خور لوگ انہیں رشوت کے ایسے ایسے طریقے روشناس کراتے ہیں کہ جس سے ان کو رشوت کا چسکا پڑ جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ وہ اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی نہیں چھوڑ سکتے ؏ ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی!''

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

آیت کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''اور تم (یہ سب) جانتے بوجھتے کر رہے ہو''۔ یعنی اگر جان بوجھ کر یہ سب کرو گے تو اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ البتہ اگر کبھی غلط فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایسا ہو جائے تو وہ قابل گرفت نہیں ہے' مثلاً کوئی شخص غلط فہمی میں نادانستہ طور پر کوئی لقمۂ حرام کھا لے یا کوئی اسے دھوکہ سے سُور کا گوشت بکری کا گوشت کہہ کر کھلا دے تو ان صورتوں میں وہ مجرم نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ غلط فہمی اور لاعلمی میں اگر کوئی حرکت ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ مؤاخذہ نہیں —— اس حوالے سے سورۃ البقرۃ کی آخری آیت بہت اہمیت کی

حامل ہے جس میں یہ دعا موجود ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ ''اے ہمارے رب! ہم سے مواخذہ نہ فرما اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے'' ــــ لیکن جانتے بوجھتے اگر حرام خوری کا کوئی بھی کام کرو گے تو یہ جان لو کہ تم سے تقویٰ کی نفی ہو جائے گی اور تم عذابِ الٰہی کے مستحق ہو گے۔

حدیث کی تشریح

اب ''اربعینِ نووی'' کی اس حدیث کی طرف آتے ہیں جو موضوع کی مناسبت سے میں نے شروع میں بیان کی تھی۔ اس حدیث میں اکلِ حلال کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ بیان ہو رہا ہے۔ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ مسلم شریف کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ، لَا يَقْبَلُ اِلاَّ طَيِّبًا)) ''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی قبول کرتا ہے'' ــــ چنانچہ اگر کسی نے عید الاضحیٰ کے موقع پر بیس' تیس ہزار کا دنبہ اللہ کی راہ میں قربان کر دیا' لیکن وہ تھا حرام کی کمائی سے تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے' اس لیے کہ اللہ خود بھی پاک ہے اور وہ سوائے پاک اور حلال چیز کے اور کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ (الحج:۳۷) ''ہرگز نہیں پہنچتا اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور نہ خون لیکن پہنچتا ہے اُس تک تمہارا تقویٰ'' ــــ اور اگر کسی نے اپنی جائز کمائی سے کوئی چھوٹا سا جانور خرید کر بھی اللہ کی راہ میں ذبح کیا تو اس کے ایک ایک بال پر بھی اجر ہے۔ اس حوالے سے ایک بہت پیاری حدیث ہے۔

> حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض اصحاب نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے''۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے لیے ان قربانیوں کا کیا اجر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''قربانی کے جانور کے ہر ہر بال کے عوض نیکی ہے''۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا اُون کا بھی یہی حساب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں اون (والے جانور) کے ہر بال کے عوض نیکی ہے۔''(۱)

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الاضاحى' باب ثواب الاضحية۔

بنی نوعِ انسان کے پہلے قتل کا سبب

اس حوالے سے یہ بھی نوٹ کر لیں کہ قربانی کی عدمِ قبولیت ہی نوعِ انسانی کے پہلے قتل کا سبب تھی۔ سورۃ المائدۃ کے نویں رکوع میں اس واقعہ کا ذکر موجود ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ﴾ (آیت ۲۷)

''اور (اے نبی ﷺ!) ان کو پڑھ کر بتایئے آدم کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ' جبکہ ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔''

آدم علیہ السلام کے یہ دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور قابیل کاشت کار تھا۔ ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی دی۔ ہابیل نے کچھ جانور پیش کیے' جبکہ قابیل نے اناج نذر کیا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی مگر قابیل کی قبول نہیں ہوئی — اُس زمانے میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی تھی کہ آسمان سے ایک شعلہ نیچے اُترتا تھا اور وہ قربانی کی چیز کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے قربانی کو قبول فرما لیا — قابیل کو اپنی قربانی کی عدمِ قبولیت پر شدید غصہ آیا اور اس نے طیش میں آ کر ہابیل سے کہا: ﴿لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ﴾ ''میں تمہیں قتل کر کے رہوں گا''۔ اس پر ہابیل نے کہا کہ قربانی قبول اور رد کرنا تو اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے' اس میں میرا کیا قصور! البتہ یہ یاد رکھو کہ ﴿اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷﴾ ''اللہ تعالیٰ قربانی قبول نہیں کرتا مگر متقیوں سے''۔ یعنی مجھ پر غصہ ہونے کے بجائے تم اپنے گریبان میں جھانکو کہ تمہاری قربانی اللہ نے کیوں رد (reject) کی ہے! اور یہ بھی یاد رکھو کہ :

﴿لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ......﴾

''اگر تم اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے مجھے قتل کرنے کے لیے (تب بھی) میں اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا تمہیں قتل کرنے کے لیے۔ مجھے تو اللہ کا خوف ہے جو تمام جہانوں کا

رب ہے۔ بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ میرا اور اپنا گناہ تم ہی اپنے سر لے لو......''
یعنی اگر تم مجھے بغیر کسی جواز کے قتل کرو گے تو اپنے گناہوں کا بوجھ تو تم نے اٹھانا ہی ہے اس کے ساتھ میرے گناہوں کا بوجھ بھی تم ہی اٹھاؤ گے۔ اس طرح میرا تو کوئی نقصان نہیں ہے (I stand to lose nothing)۔ بہر حال نوعِ انسانی کے پہلے قتل کے پس منظر میں یہی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔ غرضیکہ تمام قولی' بدنی اور مالی عبادات —اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ— اگر تقویٰ کے ساتھ ہیں تو اللہ کے ہاں قابل قبول ہیں' ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

حدیث کا بقیہ حصہ

آگے نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((وَاِنَّ اللّٰہَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ بِمَا اَمَرَ بِہِ الْمُرْسَلِیْنَ)) ''اور اللہ نے اہل ایمان کو بھی وہی حکم دیا ہے جو اُس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے''۔ اب یہاں دیکھئے کہ حضور اکرم ﷺ سورۃ المؤمنون کی آیت ۵۱ کا حوالہ دے رہے ہیں: ﴿یٰٓاَیُّھَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ ''اے میرے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو''۔ یعنی پہلے اکل حلال کا اہتمام کرو' پھر تمام اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول ہوں گے۔ اس کے ساتھ آپ ﷺ نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۲ بھی تلاوت فرمائی: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ﴾ ''اے ایمان والو! کھاؤ ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں۔''

حدیث کا اگلا حصہ تو لرزہ طاری کر دینے والا ہے: ((ثُمَّ ذَکَرَ الرَّجُلَ یُطِیْلُ السَّفَرَ ' اَشْعَثَ اَغْبَرَ)) ''پھر آپ ﷺ نے تذکرہ فرمایا ایسے شخص کا جس نے لمبا سفر طے کیا ہے' اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم غبار آلود ہے''۔ حدیث میں تو صراحت نہیں ہے' لیکن گمان یہ ہے کہ اس سفر سے حج کا سفر مراد ہے۔ کوئی شخص مدینہ منورہ سے حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جاتا تھا تو اونٹ پر اُسے سات دن مکہ پہنچنے میں لگتے تھے۔ پھر حالت احرام میں احرام کی پابندیاں بھی اس پر لازم ہیں۔ وہ نہاتا بھی نہیں کہ مبادا کوئی بال ٹوٹ جائے اور اس پر دَم لازم آ جائے۔ آپ غور کیجیے کہ ان سات دنوں کے مسلسل

سفر میں اس کا احرام میلا اور بوسیدہ ہو گیا ہو گا' بال پراگندہ ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے کہ بالوں میں نہ تو اس نے کوئی تیل ڈالا ہو گا' نہ خوشبو ڈالی ہو گی اور نہ ہی انہیں دھویا گیا۔ اُس کا اپنا حال یہ ہو گا کہ وہ مکمل طور پر غبار آلود ہو چکا ہو گا' اس لیے کہ وہ تو سارے کا سارا میدانی اور صحرائی علاقہ ہے اور ظاہر بات ہے کہ اونٹوں کا قافلہ جب چلتا ہے تو اگلا اونٹ جو خاک اڑاتا ہے وہ پچھلے اونٹ کی سواری پر آتی ہے۔ اسی طرح گھوڑے جب دوڑتے ہیں تو ان کے سموں سے اڑنے والی خاک بھی سواروں پر ہی آتی ہے۔

قبولیتِ دعا میں بڑی رکاوٹ: اَکلِ حرام

آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ((يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ ' يَا رَبِّ! يَارَبِّ!)) ''وہ شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے: ''اے میرے پروردگار! اے میرے پروردگار!''— اس حوالے سے میرے سامنے جبل رحمت کا نقشہ آتا ہے۔ جبل رحمت ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر جانے کے لیے لوگ بڑی محنت کرتے ہیں اور بہت مشقتیں اٹھاتے ہیں — فرض کیجیے کہ وہ شخص اس کی سب سے اونچی چوٹی پر پہنچ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کھڑا یاربّ یاربّ پکار رہا ہے یا مسجد الحرام میں بیت اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے پروردگار کو پکار رہا ہے۔ ((وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ' وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ' وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ' وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ)) ''اور حال یہ ہے کہ اس کا کھانا' پینا' لباس اور غذا ہر چیز حرام ہے''۔ ((فَأَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ!)) ''تو اس شخص کی دعا کیونکر قبول ہو گی؟''

حدیث کے اس آخری حصے کا ماحصل یہ ہے کہ قبولیتِ دعا کے اندر سب سے بڑی رکاوٹ اکلِ حرام ہے۔ ایسی صورت میں آپ دعا کرتے رہیں' اللہ تعالیٰ سنے گا ہی نہیں۔ اس اعتبار سے آپ خود ہی اپنی دُعا کی قبولیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ اپنی آمدن کا جائزہ لیں کہ اس میں کوئی حرام تو شامل نہیں ہے' کوئی ناجائز طریقہ تو شامل نہیں ہے' کوئی براہِ راست سود کا عنصر تو نہیں ہے۔ جبکہ بالواسطہ سود سے تو نہ میں بچا ہوا ہوں اور نہ آپ بچے ہوئے ہیں' کیونکہ ہمارا پورا معاشی نظام سود پر مبنی ہے۔ گندم کا ایک دانہ جو ہم کھاتے ہیں' اس میں بھی سود شامل ہے۔ اس

لیے کہ سودی قرضے پر ہی گندم کا بیج خریدا گیا' ٹریکٹر خریدا گیا' کھاد خریدی گئی' الغرض ہر چیز سود پر لی گئی ہے۔ اس طرح اس کے ایک ایک دانے میں سود شامل ہے اور وہ سود لامحالہ میرے اندر بھی جا رہا ہے' اس لیے کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اگر کوئی شخص سود سے بچ بھی جائے گا تو سود کے غبار اور دھوئیں سے نہیں بچ سکے گا۔ فرض کیجیے کہ فضا کے اندر گرد و غبار معلق (dust suspension) ہے تو آپ لامحالہ اسے inhale کریں گے۔ ظاہر بات ہے کہ سانس تو آپ کو لینا ہے' سانس لینا تو نہیں چھوڑ سکتے' ورنہ تو آپ مر جائیں گے۔ اب جب سانس لیں گے تو اس کے ساتھ گرد و غبار لازماً اندر جائے گا' آپ کے پاس اس کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یا یوں سمجھ لیں کہ ہوٹل کی چودھویں منزل پر آگ لگ گئی ہے اور کمروں کے اندر دھواں بھر گیا ہے۔ اب آپ کہاں جائیں گے؟ چودھویں منزل سے چھلانگ لگائیں گے تو آپ کی ہڈیاں چورا چورا ہو جائیں گی۔ اس حال میں بھی آپ سانس لینے پر مجبور ہیں اور وہ دھواں سانسوں کے ذریعے آپ کے پھیپھڑوں میں پہنچ کر رہے گا۔ بالکل اسی طرح بالواسطہ (indirect) سود سے تو آج کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے' البتہ بلاواسطہ (direct) سود آپ کی اپنی مرضی سے ہے' اس لیے کہ آپ نے اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے برضا و رغبت سودی قرضہ لیا ہے۔ میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لوگوں کو چاہیے کہ جتنی جمع پونجی ہے اس سے کاروبار کر لیں۔ اگر بہت تھوڑی پونجی ہے تو پھلوں کی چھابڑی یا کوئی ریڑھی لگا لیں' اس سے زیادہ پونجی ہے تو کوئی کھوکھا یا بڑی دوکان بنا لیں' اور اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو پھر امپورٹ ایکسپورٹ کر لیں' لیکن رہیں اپنی چادر کے اندر ہی اور اس سے باہر پاؤں نہ پھیلائیں۔ اسی طرح اگر آپ کے پاس چھوٹا سا مکان ہے تو اُسے بڑی عالی شان کوٹھی میں تبدیل کرنے کے لیے سودی قرضہ لینے کی کیا ضرورت ہے؟ زندگی گزارنے کے لیے سر کے اوپر چھت میسر ہو' اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے یہاں ہمیشہ تو نہیں رہنا۔ ایک وقت آئے گا جب آپ کو یہاں سے نکل کر قبر کے اندر جانا پڑے گا۔ اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ اگر آپ نے

اپنے کاروبار یا گھر کو وسعت دینے کے لیے سودی قرضہ لیا ہے تو یہ آپ کا اپنا فیصلہ اور آپ کی اپنی choice ہے' اور آپ کو اس پر کسی نے مجبور نہیں کیا' لہٰذا اس پر آپ کی پکڑ ہوگی اور یہ یاد رکھیں کہ اللہ ربّ العزت کی پکڑ بہت سخت ہے۔

حرام کے لیے قطعاً کوئی عذر قابلِ قبول نہیں!

آج کل ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ سود لینے کو اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً ریٹائرمنٹ کے بعد کسی کو گریجویٹی ملتی ہے تو وہ اسے ان خطرات کے پیش نظر بینک میں رکھوا دیتا ہے کہ اگر کاروبار کے لیے کسی اور کو رقم دوں گا تو وہ کھا جائے گا اور اگر اپنے گھر میں رکھوں گا تو وہ ختم ہو جائے گی اور رفتہ رفتہ اس کی قیمت بھی کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اپنے آپ کو مجبور ظاہر کر کے وہ یہ رقم بینک میں رکھوا دیتا اور پھر گھر بیٹھا سود کھاتا رہتا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ حرام کے لیے قطعاً کوئی عذر قابل قبول نہیں ہے۔ اس ریٹائر شخص کو چاہیے کہ قطعاً ایسا مت کرے' اس لیے کہ اس کے پاس کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ اس رقم کے ختم ہونے سے پہلے نہیں مرے گا۔ اُسے چاہیے کہ اس رقم سے اگر کوئی بڑا کاروبار نہیں کر سکتا تو اپنے مکان کی بیٹھک میں کوئی چھوٹی سی کریانے کی دوکان لگا کر بیٹھ جائے۔ اس سے گزارے کے مطابق مل جائے گا۔ اگر یہ بھی نہیں کر سکتا تو اس کو چاہیے کہ جو کچھ بھی اس کے پاس جمع پونجی ہے اس سے کھائے اور اللہ پر توکّل رکھے۔ اس لیے کہ رزق اللہ کے ذمّے ہے' کیا پتا اس کی جمع پونجی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی موت آ جائے اور اسے اکلِ حرام کی طرف نہ جانا پڑے۔ سود سے بچنا تو بہرصورت ضروری ہے' اس لیے کہ براہِ راست سود کی کوئی بھی شکل کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔

حرام کے لیے ویسے تو کوئی عذر قابل قبول نہیں' البتہ اگر آدمی کی جان پر بن گئی ہو' وہ مر رہا ہو اور سوائے کسی حرام شے کے کھانے کو کچھ میسّر نہ ہو تو صرف جان بچانے کی حد تک حرام کھانے کی اجازت ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اس حوالے سے قانون موجود ہے:
﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۱۷۳) ''پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔ یعنی

اضطرار کی کیفیت اور انتہائی مجبوری کے عالم میں دو شرطوں کی موجودگی میں جان بچانے کی حد تک حرام کھانا جائز ہے۔ اوّلاً یہ کہ حرام کی طرف کوئی دلی تمنا نہ ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو کم سے کم مقدار ضروری ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان دو شرطوں کے ساتھ جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے' لیکن عام حالت میں اگر آپ اپنے کاروبار' پیشے اور معاش میں حرام کا کوئی عنصر مستقل طور پر قائم کر لیتے ہیں تو پھر ہماری آج کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اس صورت میں تقویٰ کی نفی (negation) ہو جائے گی۔

ترکِ حرام' قبولیتِ اعمال کے لیے شرطِ لازم

جیسے میں نے پہلے بیان کیا کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی اکلِ حلال ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر کوئی عبادت' کوئی نیکی' کوئی خدمت اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس تناظر میں روزے کے ضمن میں بیان کردہ نبی اکرمﷺ کا یہ فرمان یاد رکھیں:

((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ)) (۱)

''جس شخص نے (روزے کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

اگر ایک شخص روزے کی حالت میں سودی کاروبار کر رہا ہے' رشوت لے رہا ہے' جھوٹ بول رہا ہے یا لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے تو یہ روزہ نہیں' صرف فاقہ کشی ہے۔ اسی لیے نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ)) ''کتنے ہی روزہ رکھنے والے ایسے ہیں جنہیں ان کے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا''۔ یعنی ان کے لیے کوئی اجر و ثواب ہے ہی نہیں۔ اس لیے کہ روزے میں تو اصلاً حلال چیزیں بھی حرام ہو جاتی ہیں' جبکہ ایسے لوگ تو مستقلاً حرام چیزوں مثلاً جھوٹ بولنا' رشوت لینا' دھوکہ دہی' سودی لین دین اور اس طرح کے باقی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من لم یدع قول الزور والعمل به فی الصوم۔

کاموں کو عین روزے کی حالت میں بھی جاری رکھے ہوئے ہوں تو ظاہر بات ہے کہ یہ روزہ نہیں ہے' صرف فاقہ کشی ہے ـــــ روزے کے ایک لازمی جزو ''قیام اللیل'' کے حوالے سے مندرجہ بالا حدیث کے اگلے حصہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَکَمْ مِنْ قَائِمٍ لَیْسَ لَهُ مِنْ قِیَامِهِ اِلاَّ السَّهَرُ))(۱) ''اور کتنے ہی راتوں کو قیام کرنے والے ایسے ہیں جن کو رات کے قیام سے سوائے رت جگے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا'' ـــــ اس اعتبار سے تقویٰ درحقیقت مالی معاملات' مثلاً بیع وشراء' کاروبار اور آمدنی وغیرہ میں ہوتا ہے۔ جب تک یہ معاملات حلال و جائز طریقے سے نہ ہوں گے اس وقت تک ظاہر بات ہے تقویٰ نہیں ہوگا۔

تقویٰ کا عام فہم مفہوم

تقویٰ کی تعریف کے حوالے سے میں آپ کو ایک بہت پیارا واقعہ سنائے دیتا ہوں۔ ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ میں یہ بات زیر بحث آ گئی کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں اور تقویٰ کی جامع اور مانع تعریف کیا ہوگی۔ اس پر بہت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی آراء کا اظہار کیا' لیکن حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ خاموش بیٹھے رہے ـــــ یہ وہ صحابی ہیں جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے صحابہ میں قرآن کا سب سے بڑا عالم اور قاری اُبی بن کعب ہے ـــــ تو حضرت عمرؓ نے کہا: اُبَیّ! آپ نے کچھ نہیں کہا' آپ بتائیں تقویٰ کسے کہتے ہیں۔ اس پر انہوں نے تقویٰ کی وضاحت جس انداز میں فرمائی اس کا مفہوم کچھ یوں ہے: امیر المؤمنین! اگر کسی شخص کو کسی گھنے جنگل میں سے گزرنا پڑے اور وہاں نہ کوئی پگڈنڈی ہو' نہ کوئی راستہ ہو' بلکہ اوپر کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت ہوں اور نیچے اونچی اونچی گھاس ہو۔ ایسے میں انسان بہت چوکنا ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو یا کسی اور موذی جانور کا بل یا بھٹ ہو اور وہاں پاؤں پڑ جائے ـــــ آپ کو

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب الصيام' باب ما جاء فى الغيبة والرفث للصائم۔ ومسند احمد' ح۹۳۰۸' راوی: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔

معلوم ہے کہ ایمیزون یا کانگو جیسے گھنے جنگلات میں تو درختوں سے لٹکے ہوئے سانپ بھی موجود ہوتے ہیں۔ ان جنگلات میں سے اگر کسی کو گزرنا ہو تو وہ کس طرح چوکنا ہو کر اور احتیاط کے ساتھ وہاں پاؤں رکھے گا— درحقیقت انسان کا اپنی پوری زندگی معصیتِ الٰہی سے بچنا‘ گناہوں سے بچنا‘ اللہ کی نافرمانی سے بچنا‘ حدودِ شریعت تجاوز کرنے سے بچنا اور تمام خرافات‘ رسومات و بدعات سے بچنا تقویٰ کہلاتا ہے۔

دُنیوی زندگی: ایک مسافرخانہ

اس پہلو سے درحقیقت یہ زندگی ایک سفر ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ))(۱)

’’دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم اجنبی ہو یا راستے سے گزرنے والے (مسافر)۔‘‘

اس حدیث میں دنیا کی زندگی میں دو انداز اختیار کرنے کی نصیحت فرمائی گئی ہے‘ ایک اجنبی کا اور دوسرے مسافر کا۔ اور یہ دونوں انداز بہت قابل غور ہیں۔ اصل میں ہم دیکھتے ہیں کہ عام لوگوں کی دلچسپیاں کیا ہیں‘ لوگ کدھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ہر ایک کو دنیا کی پڑی ہوئی ہے‘ ہر کوئی بہتر سے بہتر مکان‘ عالی شان محل‘ نئی ماڈل کی کار‘ الغرض دنیوی لحاظ سے اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش و جستجو میں ہے۔ اس صورتحال میں ایک آدمی اگر ایسا ہو جو حق پر چلنے والا ہو اور جس نے اپنے آپ کو دین اسلام کے لیے وقف کر دیا ہو‘ ظاہری بات ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان دنیاداروں کے ماحول میں اجنبی پائے گا۔

دوسری بات اس حدیث میں یہ فرمائی گئی ہے کہ یا پھر اس دنیا میں ایسے رہو کہ جس طرح راستہ گزرنے والا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو راستے سے قطعاً کوئی پیار نہیں ہوتا‘ اس لیے کہ اس کی نظر میں اصل چیز منزل ہے جہاں اسے پہنچنا ہے اور راستہ تو بس اس منزل تک پہنچانے کا ایک ذریعہ ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک چٹائی پر آرام فرما تھے۔ جب آپ ﷺ

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ و سنن الترمذی‘ ابواب الزھد‘ باب ما جاء فی قصر الامل۔

اُٹھ کر کھڑے ہوئے تو آپؐ کے پہلو مبارک پر چٹائی کے نشانات تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپ کے لیے ایک بچھونا تیار کرا دیں؟ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَالِیْ وَمَا لِلدُّنْیَا ، مَا اَنَا اِلاَّ فِی الدُّنْیَا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا)) (۱)

''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میں تو دنیا میں ایسے ہی ہوں جیسے ایک سوار کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر کے لیے رکتا ہے' پھر وہ ذرا آرام کرنے کے بعد اسے چھوڑ کر چل دیتا ہے۔''

یہ درخت نہ تو اس سوار کا ٹھکانہ ہے اور نہ ہی اسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہی حیثیت ہمارے لیے دنیا کی ہے' بایں صورت کہ ہماری منزل دنیا نہیں کچھ اور ہے۔ اس لیے دنیا میں تو عام چھت کے سائے کو بھی بہت غنیمت سمجھو اور عالی شان محلات کی آرزوئیں دماغ سے نکال دو' دنیا کی چیزوں کی طلب دل سے باہر کر دو۔ سمندر میں کشتی پانی پر چلتی ہے' لیکن اگر یہ پانی کشتی میں آ جائے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا کو بھی سمندر سمجھو جس میں تمہاری کشتی چلتی ہے' لیکن اس کی محبت' اس کی آرزو' اس کی تمنا تمہارے دل میں نہ آنے پائے' ورنہ تم ڈوب جاؤ گے۔

نبی اکرم ﷺ کی مبارک باد کے مستحق کون؟

اسی حوالے سے ایک اور اہم حدیث ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا)) (۲) ''اسلام کا جب آغاز ہوا تو وہ غریب (اجنبی) تھا''۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت آپ ﷺ تنہا تھے اور معدودے چند ساتھی تھے' تو اسلام اس وقت غریب تھا۔ اس کے بعد ایک وقت آیا کہ اسلام کو اللہ

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی اخذ المال بحقه۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزھد' باب مثل الدنیا۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ان الاسلام غریباً وسیعود غریبا ...... وسنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ما جاء ان الاسلام بدأ غریبا وسیعود غریبا۔

نے طاقت دی: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝١ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝٢﴾ (النصر) ''جب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور فتح آ گئی اور آپ نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں''۔ آگے آپ ﷺ نے ایک پیشین گوئی فرمائی: ((وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ غَرِيْبًا)) ''عنقریب اسلام پھر اجنبی ہو جائے گا جیسا کہ وہ پہلے اجنبی تھا'' ––– عربی زبان میں فعل مضارع مستقبل اور حال دونوں کے لیے آتا ہے' لیکن جب فعل مضارع پر ''سَ'' یا ''سَوْفَ'' آ جائے تو س سے فعل مضارع صرف مستقبل کے لیے خاص ہو جاتا ہے' جیسے: ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ ''عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے یہ نادان لوگ کہ کس چیز نے انہیں پھیر دیا ان کے قبلے سے جس پر وہ تھے''۔ اس آیت میں تحویل قبلہ کا حکم آیا ہے اور یہاں فعل مضارع پر ''سَ'' آنے کی وجہ سے زمانہ مستقبل قریب مراد ہوگا ––– یہاں بھی فرمایا گیا: ((وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَاَ غَرِيْبًا)) کہ عنقریب اسلام پھر غریب ہو جائے گا جیسا کہ پہلے تھا' تو یہ بھی زمانہ مستقبل قریب کی بات ہے۔

اب جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان غریب نہیں رہے بلکہ امیر سے امیر تر ہوتے چلے گئے' لیکن اسلام خلافت راشدہ کے خاتمے کے ساتھ ہی غریب سے غریب تر ہوتا چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا تضاد معلوم ہوتا ہے ۔ دورِ بنو اُمیہ اور دورِ بنو عباس میں مسلمانوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اس دور میں ترقی پر ہیں' ان کی شان و شوکت ہے' اس وقت کی دنیا کی عظیم ترین سلطنت مسلمانوں کی ہے' لیکن دین اسلام غریب ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی پہلی تہہ یعنی خلافت ختم ہوئی تو ریاست اور سیاست کا معاملہ سب سے پہلے ختم ہوا۔ اس کا اسلام سے تعلق نہیں رہا' بلکہ اب جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا معاملہ ہو گیا۔ یعنی اب مشاورت سے طے نہیں ہوگا کہ کون اہل ترین آدمی ہے' کون سب سے زیادہ متقی ہے' کون سب سے زیادہ اللہ کو جاننے اور پہچاننے والا ہے' بلکہ جس کے پاس قوت ہے اسی کی حکومت ہوگی۔ اس طرح آہستہ آہستہ اسلام غریب ہونا شروع ہو گیا اور پھر حال یہ ہو گیا کہ

مسلمان بادشاہوں کے دور میں کم از کم جو قاضی ہوتے تھے اور مقدموں کا فیصلہ جو شریعت کے مطابق ہوتا تھا' وہ بھی مغربی استعمار کے آنے سے ختم ہو گیا۔ قاضی کے بجائے مجسٹریٹ آ گئے اور شریعت کے بجائے انگریز کا بنایا ہوا فوجداری اور دیوانی قانون آ گیا' البتہ انہوں نے ایک بڑی رعایت یہ کی تھی کہ ہمارے عائلی قوانین اور نماز روزے کی ہمیں اجازت دے رکھی تھی' لیکن باقی تو پورے کا پورا نظام ان کا تھا۔ تو اس طریقے سے ہوتے ہوتے اسلام غریب سے غریب تر ہو گیا۔

مندرجہ بالا حدیث کا آخری جملہ بہت غور طلب ہے۔ آپ ﷺ نے آخر میں فرمایا: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ''پس مبارک باد ہے غریبوں (اجنبیوں) کے لیے''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اسلام اپنے اجنبیت کے دور میں چلا جائے گا' تب دو راستے ہوں گے۔ یا تو آپ اسلام کا دامن چھوڑ دیں اور معاشرے میں جس چیز سے عزت و مقام ملتا ہے وہی حاصل کریں اور اسی کے لیے کوشش کریں۔ اور جو راستہ اونچائی کی طرف جاتا ہے آپ بھی اسی پر چل پڑیں ع ''چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی''۔ یا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس سب کو چھوڑ دو اور اسلام کے دامن سے چمٹے رہو۔ اسلام اگر غریب ہو گیا ہے تو تم بھی غریب ہو جاؤ۔ تمہارے جاننے پہچاننے والے' ملنے ملانے والے بھی پھر نہیں رہیں گے اور تم سے کوئی رشتہ داری کرنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ پھر تم اس معاشرے کے اندر اجنبی ہو گے' لیکن ایسے اجنبی لوگوں کے لیے نبی آخر الزماں ﷺ کی زبان مبارک سے مبارک باد کے کلمات کہے گئے ہیں: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ''پس مبارک باد ہے ایسے غرباء کے لیے'' ــــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نبی اکرم ﷺ کی اس تہنیت اور مبارک باد کا مستحق بنائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث 6

حلال' حرام اور اصلاحِ قلب

۲۸/ستمبر ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ (المؤمنون:۵۱)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (البقرۃ:۱۷۲)

عَنْ اَبِیْ عَبْدِ اللّٰهِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ :

((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ، وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ، وَبَیْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَاَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ، وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ کَالرَّاعِیْ یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِكُ اَنْ یَّرْتَعَ فِیْهِ، اَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمًی، اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ، اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ، وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ، اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ)) (۱)

ابوعبداللہ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''حلال چیزوں کا حکم بالکل واضح ہے اور حرام چیزوں کا حکم بھی واضح ہے' اور ان دونوں (حلال و حرام) کے درمیان کچھ امور متشابہ ہیں جن کی (حلت و حرمت)

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فقل من استبرأ لدینہ ۔وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترك الشبہات۔

کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جو شخص اس قسم کی غیر واضح اشیاء سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا' اور جو شخص اس قسم کے امور کو اختیار کرنے لگے وہ حرام میں جا پڑے گا' جیسا کہ کوئی چرواہا (کسی ممنوعہ) چراگاہ کے آس پاس جانوروں کو چرائے تو ہوسکتا ہے کہ جانور چراگاہ میں جا پہنچیں۔ خبردار! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی چراگاہ سے مراد اُس کی حرام کردہ اشیاء ہیں۔ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست رہتا ہے اور اگر وہ خراب ہوجائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار! وہ گوشت کا ٹکڑا دل ہے۔''

گزشتہ جمعۃ المبارک کو ''اکلِ حلال کی اہمیت'' کے عنوان کے تحت اَکلِ حلال کی اہمیت' حرام اشیاء' حرام کاموں اور حرام آمدنی سے اجتناب کی اہمیت پر مندرجہ بالا دو آیات کے حوالے سے' جو میں نے آج بھی تلاوت کی ہیں' گفتگو ہوئی تھی۔ اسی حوالے سے میں نے اربعین نووی کی حدیث نمبر ۱۰ کا مطالعہ بھی کرایا تھا۔ آج ہمارے زیر مطالعہ اربعین نووی کی حدیث نمبر ۶ ہے جو اسی موضوع سے متعلق ہے' لہٰذا آج کی گفتگو کو اسی مضمون کا تسلسل سمجھئے۔

زیر مطالعہ حدیث حضرت ابوعبداللہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی متفق علیہ حدیث ہے' یعنی اس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے نقل کیا ہے — اس حوالے سے میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ متفق علیہ حدیث سند کے مستند ہونے کے اعتبار سے سب سے بلند درجے کی ہوتی ہے — اس حدیث کا مضمون بہت اہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ)) ''حلال بالکل واضح ہے'' ((وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ)) ''اور حرام بھی بالکل واضح ہے'' ((وَبَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ)) ''اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں'' یعنی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین سے کہنا مشکل ہے کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ ((لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ)) ''ان کے (شرعی حکم) کے بارے میں لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی''۔ البتہ رسوخ فی العلم رکھنے والے علماء وفقہاء کرام جن کی قرآن' حدیث وسنت' شریعت کے مقاصد' شریعت کے محکمات اور اصولِ شریعت پر گہری نظر ہو' وہی پہچان سکتے ہیں کہ ان مشتبہات اشیاء میں سے کون سی چیز حلال کے دائرے میں آئے گی اور کون سی حرام کے دائرے میں۔

شرعی احکام اور اس کے درجات

فقہاء نے شرعی احکام کے بہت سے درجے قائم کیے ہیں۔ کرنے والے اعمال میں سب سے اونچا درجہ فرض کا ہے اور نہ کرنے والے اعمال میں سے سب سے سخت ترین ممانعت والی شے حرام ہے۔ فرض سے کم تر درجہ واجب کا ہے‘ یعنی فرض تو نہیں ہے‘ لیکن فرض کے قریب تر ہے —— مثلاً وتر کی نماز واجب ہے اور اس کی قضا لازم ہے —— اس کے بعد سنت کا درجہ ہے۔ اس سے بھی نیچے مستحب ہے‘ جس کا کرنا پسندیدہ ہے اور نہ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے‘ جبکہ سب سے اخیر میں مباح ہے۔ یہ تمام درجات اوامر یعنی کرنے والے کاموں کے ہیں‘ لیکن اگر جائز سے ناجائز اور اوامر سے نواہی کی طرف جائیں تو اس میں سب سے پہلے مکروہ آتا ہے۔ پھر مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں: سب سے نچلا درجہ مکروہ تنزیہی کا ہے اور پھر اس سے بھی آگے مکروہ تحریمی کا درجہ ہے۔ یہ اوامر میں سے واجب کے مقابلے میں ہے جو فرض کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ اسی طرح نواہی میں مکروہ تحریمی حرام کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ (شرعی احکام اور اس کی انواع و اقسام کے حوالے سے تفصیلی چارٹ خطاب کے آخر میں ملاحظہ ہو!)

اب ظاہر بات ہے کہ یہ تمام درجات فقہاء نے قائم کیے ہیں اور فقیہہ کہتے ہیں تفقہ رکھنے والے اور فہم رکھنے والے شخص کو‘ جس کی شرائط مختصراً میں نے آپ کے سامنے رکھیں کہ قرآن مجید پر بڑی گہری نگاہ رکھتا ہو‘ تدبر اور غور و فکر کیا ہو‘ حدیث اور سنت پر پوری وسعت اور پوری گہرائی کے ساتھ اس کی نظر ہو‘ شریعت کے اصل مقاصد کی پہچان ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی کم تر اہمیت والی شے کو اہم تر قرار دے دے اور زیادہ اہمیت والی کو کم تر قرار دے دے۔ شریعت کے اندر اور دین کے مختلف عناصر کے درمیان جو نسبت و تناسب (ratio proportion) ہے اس کی سمجھ بہت ضروری ہے۔ تو ان مشتبہ امور کے بارے میں بھی صرف ایسے ہی فقہاء علم رکھتے ہیں‘ جبکہ عوام کی اکثریت ان کے احکام سے لاعلم ہے۔

تقویٰ کا تقاضا: مشتبہات سے بچنا

مشتبہات سے بچنے کے حوالے سے یہ نوٹ کر لیں کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک

اس کا قانونی پہلو ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی' جبکہ اس کا دوسرا اور اہم تر پہلو تقویٰ کے حوالے سے ہے۔ اس ضمن میں تقویٰ کا پہلو یہ ہے کہ تمام مشتبہ امور اور اشیاء سے بچا جائے۔ یعنی جب شبہ والی چیز ہے تو پھر کیوں اختیار کرتے ہو! چنانچہ اسی ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے' جو آپؐ کے پیارے نواسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: ((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ))[1] "جس چیز سے تمہیں اپنے دل میں کھٹک محسوس ہو (کہ ہوسکتا ہے یہ کام غلط ہو) اسے چھوڑ دو اور وہ شے اختیار کرو جس سے تمہارے دل میں کوئی کھٹک پیدا نہ ہو" — رَابَ یَرِیْبُ رَیْبًا کے معنی ہیں کسی کو شک یا قلق میں ڈالنا۔ چنانچہ لفظی اعتبار سے حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو چیز تمہارے اندر شکوک وشبہات پیدا کرے' جس سے تمہارے دل میں کسی قسم کی کوئی خلش اور کھٹک پیدا ہو تو اس کو چھوڑ دو اور اُس چیز کو اختیار کرو جس سے تمہارے دل کے اندر کوئی خلش' کوئی پریشانی' کوئی تشویش پیدا نہ ہو۔

اس حدیث میں ایک بہت اہم نکتہ بیان ہوا ہے کہ اپنی دلی کیفیت کے مطابق فیصلہ کرو۔ اب جس دل میں ایمان ہے وہ دل سب سے بڑا مفتی ہے' لیکن یاد رکھیں کہ اس کے لیے حقیقی ایمان شرطِ لازم ہے۔ چنانچہ احادیث کے ذخیرے میں ہمیں ایک بڑی پیاری حدیث ملتی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ((اِسْتَفْتِ نَفْسَكَ ، اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ)) "تم اپنے نفس سے پوچھو' اپنے دل سے پوچھو!" اور آخر میں فرمایا: ((وَاِنْ اَفْتَاكَ النَّاسُ وَاَفْتَوْكَ))☆ "اگرچہ لوگ اس کے بارے میں تمہیں کچھ بھی فتویٰ دیں"۔ یعنی اگر کوئی مفتی تمہیں فتویٰ دے بھی کہ یہ جائز ہے' لیکن تمہارا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو تم اسے چھوڑ و۔ اس لیے کہ اللہ کا ایک مفتی ہے جو تمہارے جسم میں دل کی صورت میں موجود ہے' وہ اس کے خلاف فتویٰ دے رہا ہے۔ البتہ یہ اسی صورت میں ہے جب تمہارے دل میں ایمان موجود ہے' اور اگر

(۱) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب تفسیر المشتبھات۔ وسنن الترمذی' ابواب صفة القیامة والرقائق والورع' باب منه۔

☆ موضوع کی مناسبت سے حدیث کا مکمل متن اور ترجمہ ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔ ◄

ایمان نہیں ہے تو پھر اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ تشویش تو اسی کو لاحق ہوگی جس کے دل میں کچھ نہ کچھ ایمان موجود ہے۔ جیسے منافق اور مؤمن کا فرق بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ منافق کو بھی اپنے گناہ یا غلطی کا احساس ہوتا تو ہے' لیکن بس اتنا ہی جتنا کسی کے ناک پر مکھی بیٹھی اور اس نے ذرا ہاتھ ہلا کر اسے ہٹا دیا۔ دوسری طرف مؤمن سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے یا کوئی غلطی ہو جائے تو اس کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ تلے آ گیا ہے۔ تو یہ اندرونی احساس کی بات ہے۔ لہٰذا جس کے دل میں تشویش پیدا ہوگئی تو یہ گویا ایمان کی علامت ہے' تو وہ اپنے دل سے فتویٰ لے سکتا ہے۔

نورالدین زنگی کا سبق آموز واقعہ

اس ضمن میں ہماری تاریخ کا ایک بڑا عبرت آمیز اور سبق آموز واقعہ ہے سلطان نورالدین زنگی کا' جس کے بعد جانشین بنے فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبیؒ — عیسائیوں کا یروشلم پر تقریباً ۸۸ برس کا جو قبضہ تھا اسے واگزار کرانے والا مجاہد اعظم صلاح الدین ایوبیؒ نورالدین زنگی کے ساتھیوں اور فوجیوں میں سے تھا — نورالدین زنگی کا بیٹا شدید بیمار ہوگیا۔ ہر طرح کے علاج معالجے آزمائے گئے مگر بے سود۔ آخر اطباء نے کہا کہ اب اس کی جان بچانے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ شراب

◀ حضرت وابصہ بن معبد اسدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا ((جِئْتَ تَسْاَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْاِثْمِ)): ''تم نیکی اور گناہ کے بارے میں دریافت کرنے آئے ہو؟'' میں نے عرض کیا: جی ہاں! پھر آپؐ نے اپنی انگلیوں کو اکٹھا کر کے میرے دل پر مارا اور فرمایا: ((اِسْتَفْتِ نَفْسَکَ اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ یَا وَابِصَۃُ ثَلَاثًا — اَلْبِرُّ مَا اطْمَاَنَّتْ اِلَیْہِ النَّفْسُ وَاطْمَاَنَّ اِلَیْہِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِی النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِی الصَّدْرِ وَاِنْ اَفْتَاکَ النَّاسُ وَاَفْتَوْکَ)) (سنن الدارمی' کتاب البیوع' باب دع ما یریبک الی ما لا یریبک)

''اے وابصہ (نیکی اور گناہ کے بارے میں) اپنے آپ سے پوچھو' اپنے دل سے پوچھو — آپ ﷺ نے تین بار فرمایا — نیکی وہ ہے جس سے تمہارا نفس اور دل مطمئن ہو' جبکہ گناہ وہ ہے جو تمہارے جی میں کھٹکے اور تمہارا سینہ اس کے بارے میں متردّد ہو' خواہ لوگ اس کے بارے میں تمہیں کوئی بھی فتویٰ دیں۔''

(اضافہ از مرتب)

پی لے۔ سلطان نے کہا: معاذ اللہ! میں اپنے بیٹے کو حرام چیز استعمال کراؤں! اطباء نے بتایا کہ اس پر علماء کا فتویٰ ہے کہ جان بچانے کے لیے حرام چیز استعمال کی جا سکتی ہے۔ سلطان کو تسلی نہ ہوئی اور اس اللہ کے بندے نے فرداً فرداً چاروں مکاتب فکر کے علماء سے فتویٰ لیا تو سب نے یہی کہا کہ جان بچانے کے لیے جان بچانے کی مقدار تک حرام شے استعمال کر لینا جائز ہے۔ دیکھئے یہ شہزادہ ہے اور بیٹوں کی زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے' لیکن نورالدین زنگی کے تقویٰ کا عالم ملاحظہ ہو کہ فتویٰ آ جانے کے بعد بھی دل کو تسلی نہ ہوئی' دل میں خلش اور کھٹک باقی رہی۔ اُس نے جان بچانے کے لیے شراب کے جواز کا فتویٰ دینے والے مفتیانِ کرام کو اپنے دربار میں بلایا اور کہا: اللہ کی مشیت کے مطابق اگر میرے بیٹے کی موت کا وقت آ ہی گیا ہے تو کیا یہ شراب اسے بچا لے گی؟ انہوں نے کہا: نہیں! اُس نے پوچھا: اگر اللہ اسے صحت دینا چاہے تو کیا وہ شراب کا محتاج ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! اس پر سلطان نے کہا: تو اپنے یہ فتوے اپنے پاس رکھو! چنانچہ اُس اللہ کے بندے نے اپنے بیٹے کی قربانی دے دی' مگر اسے شراب نہیں پلوائی۔ تو تقویٰ کی یہ مثالیں ہمارے مسلم بادشاہوں میں بھی رہی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ بادشاہ خلفاء راشدین کے پائے کے لوگ تو نہ تھے' لیکن ان کے تقویٰ کا یہ عالم تھا۔ ہمارے بادشاہوں میں ہندوستان میں دو ایسے عظیم بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے خزانے سے ایک پیسہ نہیں کھایا کہ وہ تو ایک امانت ہے۔ شہنشاہ ہند اورنگزیب عالمگیر ٹوپیاں بنا کر بیچ رہا ہے اور قرآن مجید لکھ لکھ کر اُجرت لے رہا ہے۔ اس طرح کی صفات کا حامل مغلوں کے آنے سے پہلے ناصر الدین محمود ہے۔ اسی طرح نورالدین زنگی بھی ایک بہت بڑی مثال ہے۔

تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جو مشتبہات ہوں' جن کے بارے میں صراحت موجود نہ ہو ان میں ملوث ہونے کے بجائے ان سے بچا جائے۔ البتہ قانون یہ نہیں ہے' قانون یہ ہے کہ جس شے کی حرمت ثابت نہیں ہے وہ حلال ہے۔ اگر بالفرض قانون یہ ہوتا کہ صرف وہ شے حلال ہو گی جس کی حلت ثابت ہو جائے تو اس طرح حلال کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا۔ لہٰذا یہ نوٹ کر لیں کہ اس حوالے سے قانون یہ ہے کہ جس شے کی حرمت

کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے وہ حلال اور مباح (permissible) ہے۔ اس اصول کے تحت قانونی سطح پر ہمارے ہاں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

جدید اسلامی ریاست میں ازسرنو قانون سازی کی ضرورت

اس ضمن میں ایک اہم مسئلہ میں آپ کو بتا رہا ہوں — ویسے تو یہ تقدیر مبرم ہے کہ دنیا میں دوبارہ خلافت کا نظام قائم ہوگا اور وہ عالمی سطح پر ہوگا۔ یہ تو رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی خبریں ہیں جن کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ اس سے پہلے کیا کیا ہونا ہے' ہماری شامت اعمال کس کس شکل میں ہمیں بھگتنی ہے' اللہ کے عذاب کے کوڑے ہم پر کیسے کیسے برسنے ہیں' یہ دوسری بات ہے۔ ہم پاکستانیوں پر ایک کوڑا ۱۹۷۱ء میں برسا تھا جب پاکستان دولخت ہوگیا تھا۔ اب کون سا کوڑا آنے والا ہے' یہ میں نہیں کہہ سکتا' لیکن ہم سزا کے مستحق ضرور ہیں۔ ہم نے اللہ سے بے وفائی کی ہے' وعدہ خلافی کی ہے۔ ہم نے تو دعائیں مانگ مانگ کر اللہ سے یہ ملک لیا تھا۔ ہم نے کہا تھا: اے اللہ! تو ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے دے اور ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما دے تو ہم وہاں پر تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ لیکن نصف صدی گزرنے کے باوجود ہم نے اس وعدے کو پورا نہیں کیا۔ البتہ کروڑوں اربوں کے محلات ہم نے بنا لیے۔ کئی کئی کروڑ کی کوٹھی آپ کو ڈیفنس میں مل جائے گی۔ ڈیفنس کیا اب تو یہاں ماڈل ٹاؤن اور جوہر ٹاؤن کے اندر بھی ایسے ایسے محل نما گھر موجود ہیں جن کو دیکھ کر آپ کو نظر آئے گا کہ پاکستان تو جنت ہی جنت ہے' یہاں پر تو شاید غربت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب تو ہم نے کیا' لیکن وہ اسلام کہاں ہے جس کا ہم نے اپنے رب سے وعدہ کیا تھا؟ یہ یاد رکھیں کہ اس وعدہ خلافی کی سزائیں تو ہمیں ملنی ہیں۔ اس موضوع پر میری ایک کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' کا ضرور مطالعہ کیجیے جس میں میں نے اُمتِ مُسلمہ کے ماضی اور حال پر بھی روشنی ڈالی ہے اور مستقبل کی جھلک بھی پیش کی ہے۔ بدقسمتی سے آج کا انسان بس حال میں پھنسا ہوا ہے اور اُسے بس اسی کی فکر ہے کہ میرا آج کا مسئلہ کیا ہے' میرے اِس وقت

کے مسائل اور معاملات کیا ہیں اور میں کس طرح انہیں حل کر سکتا ہوں۔ نہ اسے ماضی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ مستقبل کی فکر۔ میرا ایک مشغلہ (hobby) سا ہے کہ کوئی نیا ملاقاتی آتا ہے تو میں اس کا پس منظر جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ شخص مہاجر ہے اور جمنا پار کا ہے۔ پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ ہم یوپی سے ہیں۔ بھئی کس جگہ سے ہیں؟ یہ اُسے نہیں پتا ہوتا۔ اس کو اتنی دلچسپی نہیں ہے کہ میرے باپ دادا کہاں سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ماضی قریب سے اتنی عدم دلچسپی ہو چکی ہے تو اس سے آگے کی تاریخ آپ کہاں پڑھیں گے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ ہے' اس میں کیا کیا نشیب و فراز آئے ہیں' ان میں کیا کیا خیر کے پہلو تھے اور کیا کیا شر کے' یہ جاننے کی کیونکر فکر ہو گی؟ اسی طرح مستقبل کی بھی کوئی فکر نہیں ہے۔ بس کل کی روٹی' اپنے کاروبار' پروفیشن اور ملازمت وغیرہ کی فکر ہے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

بہرحال میں کہہ رہا تھا کہ یہ تو یقینی بات ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو گی' لیکن اس حوالے سے عام طور پر خیال یہ ہے کہ جیسے ہی اسلامی ریاست قائم ہو گی تو فقہ جو مرتب شدہ ہے' بس وہ نافذ کر دی جائے گی۔ یہ بڑی ہی ناسمجھی کی بات ہے۔ اول تو سوال پیدا ہو گا کہ کون سی فقہ نافذ کی جائے — حنفی' شافعی' مالکی' یا حنبلی؟ اہلِ تشیّع نے ایران میں خون بہا کر' جانیں دے کر انقلاب برپا کیا' بادشاہ کو بھگایا اور پھر وہاں جعفری فقہ نافذ کی — لیکن ایران کا معاملہ بالکل الگ ہے' اس لیے کہ وہاں اہلِ سنت بہت معمولی سی اقلیت ہیں اور ''مین لین'' یعنی ایران کے درمیان کے دائرہ میں اہلِ سنت موجود ہی نہیں۔ البتہ جنوب مشرق میں کچھ بلوچ' جنوب مغرب (صوبہ اہواز) میں کچھ عرب' شمال مغرب میں کچھ کُرد اور شمال مشرق میں کچھ افغان یا ترک سنی ہیں' جبکہ باقی سارے ایران میں شیعہ ہیں۔ انہوں نے تو وہاں جعفری فقہ نافذ کی ہے' مگر آپ یہاں کون سی فقہ نافذ کریں گے' یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ آپ کے ہاں تو شیعہ سُنّی یوں رہتے ہیں کہ اوپر کے فلیٹ میں سُنّی ہے تو نیچے شیعہ' یا نیچے سُنّی ہے تو اوپر شیعہ۔

اس حوالے سے دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ یہ فقہیں آج سے تقریباً ایک ہزار سال

پہلے مرتب ہوئی تھیں۔ وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے‘ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو چکے ہیں جو ان فقہوں میں نہیں ہیں۔ پھر بدقسمتی سے ہمارے علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے‘ جبکہ اہلِ تشیّع نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور ان کے ہاں بڑے علماء مجتہد کہلاتے ہیں۔ سب سے اوپر مراجع ہیں جو آخری اتھارٹی سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آیت اللہ خمینی نے ’’ولایت الفقیہہ‘‘ کی بنیاد ڈالی جو آج بھی ایران میں رائج ہے۔ اس کے مطابق اصل حکمرانی فقہاء و علماء کی ہے۔ اگرچہ انتخابات ہوتے ہیں‘ لیکن انتخابات میں کون حصہ لے سکتا ہے اور کون نہیں‘ اس کا فیصلہ علماء کی شوریٰ کرتی ہے اور جس کو وہ مسترد کر دیں تو پھر وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انقلابِ ایران کے بعد بنی صدر ایران کے پہلے صدر بنے تھے اور انہوں نے غالباً ۹۹ فیصد ووٹ حاصل کیے تھے‘ لیکن آیت اللہ خمینی نے کان سے پکڑ کر انہیں نکال دیا۔ تو وہاں اصل حکومت علماء کی ہے اور یہ اس دور کے اندر تھیوکریسی کی بڑی نمایاں مثال ہے۔

بہرحال اللہ ہمیں توبہ کی توفیق عطا فرما دے اور پاکستان حقیقی معنوں میں ایک اسلامی ملک بن جائے — اگرچہ اس کے آثار کوئی نہیں ہیں — تو یہاں قانون سازی (legislation) از سرِ نو ہو گی۔ مباحات کے دائرے میں آپ نئے نئے قوانین بنائیں گے۔ جو چیز کتاب و سنت سے ثابت ہو گئی وہ تو بعینہٖ اسی طرح نافذ ہو جائے گی۔ پھر پرسنل لاء میں تمام فقہوں کو acknowledge کیا جائے گا‘ یعنی ذاتی معاملات مثلاً شادی بیاہ‘ وراثت اور عبادات وغیرہ خواہ آپ فقہ حنفی کے تحت کرنا چاہتے ہیں یا فقہ شافعی کے تحت یا فقہ جعفری کے تحت‘ آپ کو آزادی ہو گی — یہ عبادات‘ عائلی قوانین اور وراثت وغیرہ کے معاملات پرسنل لاء کے دائرے میں آتے ہیں — لیکن قانونِ ملکی (Law of the land) میں کوئی فقہ تشکیل نہیں دی جائے گی‘ اس لیے کہ ساری فقہیں ہماری مشترکہ وراثت علمی (common heritage) ہیں کہ کسی ایک معاملے میں امام ابوحنیفہ‘ امام مالک‘ امام شافعی‘ امام احمد بن حنبل‘ امام ابن تیمیہ اور امام جعفر صادق کی آراء کیا ہیں۔ اس طرح تو ہمارے پاس علم کا خزانہ آ گیا — جیسا کہ آپ کو معلوم ہے

عدالتوں کے اندر نظائر (precedents) پیش کیے جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں سپریم کورٹ میں کوئی مقدمہ زیرِ سماعت ہے تو اس کے لیے کہاں کہاں سے نظیر ڈھونڈ کر لانی پڑتی ہے کہ پریوی کونسل برطانیہ نے فلاں سن میں فلاں مقدمہ میں یہ فیصلہ دیا تھا۔ تو ان precedents کو فیصلہ کن اہمیت حاصل ہوتی ہے — خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کے بعد فقہاء کی آراء کی حیثیت بھی ہمارے لیے نظائر کی ہو جائے گی اور انہیں ازسرِنو قانون سازی میں بہت اہمیت حاصل ہو گی۔

مشتبہات سے بچنے کا قانونی پہلو

اربعین نووی کی زیرِ مطالعہ حدیث کے حوالے سے میں نے بتایا تھا کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ تقویٰ کا تقاضا تو یہ ہے کہ شبہات سے ہر صورت بچا جائے، لیکن اس کا قانونی پہلو اس کے بالکل برعکس ہے کہ جو شے کتاب و سنت کے دلائل اور نصوص سے حرام ثابت نہ کی جا سکے تو وہ جائز ہے۔ اس میں آپ pick and choose کر سکتے ہیں، اکثریت (majority) سے بھی قانون بنا سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ نے دو جائز و حلال چیزوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ہے تو آپ ریفرنڈم کرا لیں، ووٹنگ کرا لیں یا کوئی اور طریقہ اختیار کر لیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے لیے میں سادہ سی مثال دیا کرتا ہوں کہ فرض کیجیے آپ کو اپنے گھر میں دعوتِ افطار کا اہتمام کرنا ہے، اب اس میں مشروب کون سا پیش کیا جائے اس کے بارے میں مختلف آراء سامنے آ سکتی ہیں — شراب تو سرے سے زیرِ بحث نہیں آ سکتی، اس لیے کہ وہ تو کتاب و سنت کی رو سے حرام ہے — باقی سیون اپ، روح افزا یا کوئی اور شربت ووٹنگ کے ذریعے منتخب ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ یہ تمام حلال مشروبات ہیں۔ لہٰذا مشتبہات کے حوالے سے دونوں پہلو سامنے رکھیے۔ زیرِ مطالعہ حدیث میں اس حوالے سے تقویٰ کا پہلو بیان ہوا کہ جو مشتبہات ہیں، جن کے بارے میں تیقن کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے تو اس سے بچو!

آگے آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ))

''پس جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچ گیا تو اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا''۔ یہ انفرادی سطح پر تقویٰ کا طرزِ عمل ہوگا کہ جو چیز بھی مشتبہ ہے اس کو آپ ترک کر دیں اور اس کو اختیار نہ کریں۔ ((وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ)) ''اور جو ان مشتبہ چیزوں کے اندر پڑ گیا' وہ حرام میں بھی پڑ جائے گا''۔ یعنی ابھی تو ایک مشتبہ چیز کا مسئلہ تھا' لیکن آگے انسان کے اندر اُس کی نفسانیت' حیوانیت' بہیمیت اور اس کے نفسانی تقاضے جب بڑھیں گے تو پھر وہ حرام تک پہنچ جائے گا۔ جیسے آپ پنجابی میں کہتے ہیں ''جھاکا کھل گیا'' یعنی جھجک اگر ختم ہوگئی تو گویا اس کا بھی اندیشہ ہے کہ مشتبہ امور کو استعمال کرتے کرتے آپ حرام کے اندر بھی منہ مارنے لگیں۔

حرام کے قریب جانے کی بھی ممانعت

آگے آپ ﷺ نے اس بات کو ایک مثال سے سمجھایا: ((كَالرَّاعِي يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ)) ''جیسا کہ کوئی چرواہا (کسی ممنوعہ) چراگاہ کے آس پاس جانوروں کو چرائے تو ہوسکتا ہے کہ جانور چراگاہ میں جا پہنچیں''۔ حِمٰی کہتے ہیں محفوظ چراگاہ کو۔ یعنی کسی بادشاہ' جاگیردار یا وڈیرے نے اپنے چوپاؤں' مثلاً گائیں بھینسوں' بھیڑ بکریوں' اونٹ اور گھوڑوں وغیرہ کے لیے ایک خاص علاقے کو محفوظ کر لیا ہو کہ یہاں صرف ان کے جانور چریں گے اور اس میں عوام کا کوئی جانور داخل نہیں ہوگا' تو وہ اس کی حِمٰی ہے۔ اب اگر کوئی چرواہا اس طرح کی کسی محفوظ اور مخصوص چراگاہ کے قریب اپنا ریوڑ چرا رہا ہوگا تو اس کا اندیشہ ہے کہ اس ریوڑ کے چند جانور اس چراگاہ میں گھس جائیں اور وہاں چرنے لگیں۔ اس طرح یہ چرواہا شاہی مجرم قرار پائے گا اور اس پر اسے سزا بھی ہوسکتی ہے' لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے دُور دُور رہو' Keep at a safe distance۔ بالکل یہی معاملہ مشتبہات کے بارے میں ہے کہ ان سے دُور رہا جائے' کہیں یہ نہ ہو کہ آپ بالکل حرام کی سرحد پر پہنچ جائیں۔ اور اگر آپ سرحد پر پہنچ گئے تو ہوسکتا ہے کسی وقت آپ جذبات کی رو میں بہہ کر اس سرحد کو عبور کر کے حرام میں پہنچ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ حرام کے قریب جانے سے بھی

روکتا ہے چہ جائیکہ حرام کا ارتکاب کیا جائے۔ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں نہ تو زنا کے بارے میں کہیں آیا ہے: لَا تَزْنُوْا یعنی ''زنا نہ کرو'' اور نہ ہی کہیں شراب کے بارے میں حرام کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی کو بنیاد بنا کر ہمارے ملک کے ایک دانشور کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں شراب کے لیے حرام کا لفظ کہیں نہیں آیا' اس لیے یہ حرام نہیں ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ اللہ کے بندے! عقل کے ناخن لو۔ جب شراب اور جوئے کے لیے ایسے ایسے سخت الفاظ آئے ہیں: ﴿رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ ''یہ شیطانی عمل میں سے گندے ترین اعمال ہیں' پس ان سے دور رہو''۔ تو حرام کا لفظ ان سے زیادہ سخت تو نہیں ہے۔ آگے فرمایا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ○﴾ ''پھر تم باز آتے ہو کہ نہیں؟'' یہ غصے کا انداز کیوں اختیار کیا گیا؟ اس لیے کہ اس سے پہلے مرحلہ وار احکام دیے جا چکے تھے۔ بہت پہلے تم سے کہہ دیا گیا تھا: ﴿فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (البقرۃ:۲۱۹) کہ شراب اور جوئے میں اگرچہ کچھ منفعت کے پہلو بھی ہیں' لیکن ان میں گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے زیادہ ہے۔ جب یہ پہلا حکم آیا تھا تو تمہیں اُسی وقت ان دونوں کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ تقویٰ کا تقاضا بھی یہی تھا کہ اسی وقت چھوڑ دیتے —— بہت سے صحابہ کرامؓ نے اسی وقت شراب چھوڑ دی تھی —— پھر ہم نے تمہیں ایک اور وارننگ دی تھی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ (النساء:۴۳) ''اے ایمان والو! جب شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ''۔ تو اس سے بھی تمہیں معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ ان احکام میں شراب اور جوئے کی حرمت کی طرف اشارہ ہے' لیکن اس کے باوجود چند لوگ پھر بھی باز نہ آئے تو پھر سورۃ المائدۃ میں تیسرا اور آخری حکم آیا جس میں بہت سخت الفاظ وارد ہوئے: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴿۹۱﴾﴾ ''اب بھی باز آتے ہو کہ نہیں؟'' —— اب ان سارے سخت ترین الفاظ کو پس پشت ڈال کر ایک دانشور کہہ رہے ہیں کہ قرآن میں شراب کے لیے کہیں حرام کا لفظ نہیں آیا اس لیے شراب حرام نہیں ہے۔ ایک ملاقات میں' میں نے ان سے کہا تھا کہ حرام کا لفظ تو زنا کے لیے بھی نہیں آیا تو اس کے جواز کا بھی فتویٰ دے دیجیے!

دراصل قرآن حکیم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ حرام کے قریب جانے سے بھی روکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زنا کے حوالے سے قرآن نے فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی﴾ (بنی اسرائیل:۳۲) ''اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو''۔ یعنی زنا تک جانا تو بہت دور کی بات ہے ایسے اعمال تک بھی نہ جاؤ جو زنا تک لے جانے کا باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے لیے ہمارا سارا عائلی نظام ہے' پردہ ہے' مخالف جنسوں میں تفریق (seggregation of sexes) ہے کہ مخلوط معاشرہ نہ ہو' لڑکوں کے تعلیمی ادارے علیحدہ ہوں اور لڑکیوں کے علیحدہ۔ عورتوں کے ہسپتال علیحدہ ہوں جہاں عورتیں مریض' عورتیں ڈاکٹر اور عورتیں ہی نرس ہوں' جبکہ مردوں کے ہسپتالوں میں مرد مریض' مرد ڈاکٹر اور مرد ہی نرس ہونے چاہئیں۔ مردوں کے ہسپتالوں میں کوئی عورت نہ تو ڈاکٹر ہو اور نہ ہی نرس۔ یہ سراسر شریعت کے خلاف ہے' اور پھر جو کچھ وہاں ہوتا ہے وہ آپ سب کو معلوم ہے' کون نہیں جانتا۔ یہ سب وہ اعمال ہیں جو زنا تک لے جانے کا باعث بن سکتے ہیں' اس لیے ان سب سے منع کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں جا بجا فرمایا گیا: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی حدود ہیں' ان سے تجاوز مت کرو''۔ ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی حدود ہیں' ان کے قریب بھی مت جانا''۔ تو زیر مطالعہ حدیث میں بھی فرمایا کہ ان مشتبہات کے قریب بھی نہ جاؤ' ہوسکتا ہے تم حرام میں پڑ جاؤ۔

اللہ کی مخصوص و محفوظ چراگاہ ''محرّمات'' ہیں!

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِكٍ حِمًی' اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ)) ''آگاہ ہو جاؤ کہ ہر بادشاہ کی ایک محفوظ اور مخصوص چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی مخصوص چراگاہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء ہیں''۔ تو جیسے کسی محفوظ چراگاہ کے قریب اپنے ریوڑ کو لے جانے والا ہمیشہ اس خطرے میں رہے گا کہ اس کی بھیڑ بکریاں چھلانگ لگائیں اور اس محفوظ چراگاہ میں چلی جائیں اور اس طرح یہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا' ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی چراگاہ اس کی محرمات ہیں' لہٰذا ان کے قریب بھی مت جاؤ' مبادا کہ تم ان میں مشغول ہو جاؤ!

نبی مکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے یہ الفاظ جوامع الکلم میں سے ہیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک موقع پر فرمایا: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ)) ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔ یہ بالکل صحیح ہے' اس لیے کہ فصیح ترین عربی قرآن کی ہے اور اس کے بعد حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی۔ اسی طرح آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ((بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ)) (متفق علیہ) ''مجھے جوامع الکلم کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے''۔ جوامع الکلم کہتے ہیں بڑی جامع باتیں' یعنی چھوٹے چھوٹے جملے مگر مفہوم کے حوالے سے وسیع تر۔ مثلاً روزہ کے بارے میں آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ)) (متفق علیہ) ''روزہ ڈھال ہے''۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جیسے ڈھال کے ذریعے اپنے آپ کو تلوار سے بچاتے ہو اسی طرح نفس کے حملوں سے بچانے کے لیے روزہ بھی ایک ڈھال ہے۔ تمہارا جو نفس امارہ ہے' تمہارا جو id اور libido ہے' تمہارے جو جوانی کے تقاضے اور حیوانی جبلتیں ہیں' ان سب کے خلاف تم اپنے آپ کو روزے کے ذریعے بچا سکتے ہو۔ اپنی انا کو' اپنی خودی کو اور اپنی روح کو نفس کی ظلمانیت سے بچانا ''اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ'' کے مفہوم میں شامل ہے — زیر مطالعہ حدیث کے اگلے کلمات بھی جوامع الکلم میں سے ہیں' ان میں وسیع مفہوم پوشیدہ ہے۔

قلب اور اصلاحِ قلب کی اہمیت

آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مزید فرمایا: ((اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ)) ''آگاہ ہو جاؤ کہ جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے' جب وہ درست ہوتا ہے تو پورے کا پورا جسم درست ہوتا ہے'' ((وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ)) ''اور جب اس میں کوئی خرابی (یا برائی) ہو تو پورا جسم برا ہو جاتا ہے''۔ ((اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)) آگاہ ہو جاؤ کہ وہ دل ہے!'' یہ ہے وہ بات جو قرآن کے حکمت اور فلسفے کی ہے۔ یہ تین levels ہیں: نفس امارہ' قلب اور روح۔ انہی کی نشاندہی فرائیڈ نے کی ہے اور اس حوالے سے میں اس کے مشاہدے کے ادراک (acquaintance of vision) کا قائل ہوں' مگر اس کی تاویل اس نے غلط کی ہے۔ جہاں تک id' libido اور پھر ego کی بات ہے تو وہ صحیح ہے' لیکن super ego کو وہ بالکل سمجھ نہیں سکا۔ اس نے

دیکھ لیا کہ خودی (ego) سے اوپر بھی انسان میں کوئی اور شے ہے‘ لیکن وہ پہچان نہیں پایا کہ وہ کیا ہے؟ تو وہ روح ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ یا تو انسان کے قلب کا رخ روح کی طرف ہوتا ہے‘ اس اعتبار سے قلب ایک آئینہ کی مانند ہوتا ہے‘ بایں معنی کہ روح کی ساری تجلیات اور انوارات اس میں منعکس ہو جائیں گے اور پورا وجود منوّر ہو جائے گا۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ قلب کا رخ نفس امارہ کی طرف ہو جائے گا تو نفس امارہ کی ساری ظلمات‘ تاریکیاں اس میں منعکس ہو جائیں گی اور سارا جسم خراب ہو جائے گا۔

اب خاص طور پر دلچسپی کی بات یہ ہے کہ قلب کا مادہ ق ل ب ہے جس کے معنی بدلنے کے ہیں۔ چنانچہ قلب کو قلب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ لفظ انقلاب بھی اسی سے بنا ہے بمعنی بدل جانا۔ قرآن حکیم میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ﴾ (التوبۃ:٤٨) یعنی اے نبی ﷺ! یہ منافق آپ کے معاملات کو تلپٹ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں — حضور ﷺ کی اپنی ایک پلاننگ ہوتی تھی‘ لیکن منافق بیچ میں کوئی ایسا رخنہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ پلاننگ خراب ہو جائے۔ تو قلب کے معنی ہی یہی ہیں کہ اسے سکون نہیں ہے‘ وہ ہر وقت حرکت میں ہے۔ آپ کے پورے جسم میں ہر عضو کے لیے آرام کا وقت ہوتا ہے۔ آپ کے دماغ کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔ آپ سوتے ہیں تو دماغ آرام کرتا ہے— یہ اور بات ہے کہ دماغ کو آرام کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنا ہم سوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سو رہے ہوتے ہیں لیکن دماغ جاگ کر اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور پھر خواب بھی اسی کیفیت میں آتے ہیں۔ دوسری طرف قلب یعنی دل ہمارے جسم کا ایسا عضو ہے جس کے لیے نہ کوئی آرام ہے اور نہ کوئی چین‘ اور نہ ہی یہ ایک حالت میں رہتا ہے‘ کبھی پھیل رہا ہے کبھی سکڑ رہا ہے۔ اب اگر یہ دل یکسو ہو کر مستقل طور پر روح کی طرف رخ کر لے تو روح کی تجلیات— روح کا تعلق چونکہ امر ربی سے ہے اس لیے وہ ربانی تجلیات — پورے وجود میں سرایت کر جائیں گی۔ اس کیفیت کا نام ہے ’’نفسِ مطمئنہ‘‘۔ جس کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴿۲۸﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ﴿۲۹﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴿۳۰﴾﴾ ''اے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل' تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا اور میری بہشت میں داخل ہو جا''۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو وہ نفس مطمئنہ عطا کرے' آمین!)۔ لیکن اگر خدانخواستہ قلب کا مستقل رخ نفس امارہ کی طرف ہو جائے تو یہ وہ کیفیت ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''بے شک نفس انسان کو برائی پر ہی اکساتا رہتا ہے''۔ اس کے علاوہ کچھ لوگوں کا قلب ڈانواں ڈول رہتا ہے' اس کو ''نفسِ لوامہ'' کہتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی اچھا کام کیا تو اندر سے شاباش ملتی ہے کہ تم نے ٹھیک کیا ہے اور اگر کوئی برا کام کیا تو روح ملامت کرتی ہے۔ اس کیفیت کو سورۃ التوبہ میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے: ﴿خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا﴾ (آیت ۱۰۲) ''(کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں) جو خلط ملط کر لیتے ہیں اچھے کاموں کے ساتھ دوسرے برے کام بھی''۔

مشتبہات اور سود کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

اسی حدیث کے حوالے سے میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے بعض معاملات ایسے تھے جن کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں آیا ہے۔ اس زمانے میں آپ کو معلوم ہے کہ بات کو آگے تک پہنچانے کے ذرائع محدود تھے۔ اُس وقت نشریاتی چینلز تو تھے نہیں کہ اعلان ہو جاتا کہ آج سے یہ حکم نافذ العمل ہو گا اور اس طرح پورے ملک میں وہ حکم نامہ پہنچ جاتا۔ اس تناظر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت سعید بن میّب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ آيَةُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قُبِضَ وَلَمْ يُفَسِّرْهَا' فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيْبَةَ (۱)

''قرآن کریم میں سب سے آخری آیت سود سے متعلق نازل ہوئی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے انتقال سے قبل اس کی مکمل وضاحت کا موقع نہیں مل سکا۔ اس

(۱) مسند احمد' کتاب مسند العشرة المبشرين بالجنة' باب اول مسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

لیے سود کو بھی چھوڑ دو اور جس چیز میں ذرا بھی شک ہو اسے بھی چھوڑ دو۔''☆

سود کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل ہمارے سامنے ہے' مگر مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارا تو سارا معاشی نظام ہی سودی بینکاری کے گرد گھومتا ہے' جبکہ سودی بینکاری کا یہ نظام یہودیوں کے بدمعاش ترین ذہن کی پیداوار ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؂

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے خام!

یعنی یہ بینک تو یہودیوں کی عیارانہ فکر کی پیداوار ہے جس نے سینۂ آدم کے اندر جو روحانیت کا نور تھا اس کو نکال کر دور پھینک دیا اور انسان کو درندہ اور حیوان بنا دیا ہے۔ اب اس نظام کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ سارا نظام تہ و بالا نہیں ہو گا' تلپٹ نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے کہاں کی دانش' کہاں کی تہذیب' کہاں کا دین! یعنی کسی بھی چیز کا کوئی امکان نہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو پہچاننے اور اپنی انفرادی زندگیوں میں ہر طرح سے مشتبہات سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے' آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

☆ سنن دارمی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذکورہ فرمان یوں بیان ہوا ہے:

یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا لَا نَدْرِیْ لَعَلَّنَا نَاْمُرُکُمْ بِاَشْیَاءَ لَا تَحِلُّ لَکُمْ وَ لَعَلَّنَا نُحَرِّمُ عَلَیْکُمْ اَشْیَاءَ ھِیَ لَکُمْ حَلَالٌ ـــــ اِنَّ آخِرَ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ آیَۃُ الرِّبَا وَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ لَمْ یُبَیِّنْھَا لَنَا حَتّٰی مَاتَ فَدَعُوا مَا یَرِیْبُکُمْ اِلٰی مَا لَا یَرِیْبُکُمْ (سنن الدارمی)

''اے لوگو! بے شک ہم نہیں جانتے' ہو سکتا ہے ہم تمہیں ایسی شے کا حکم دیں جو تمہارے لیے حلال نہ ہو اور شاید ہم تم پر ایسی اشیاء کو حرام قرار دے دیں جو درحقیقت تمہارے لیے حلال ہوں ـــــ قرآن میں سب سے آخر میں سود سے متعلق آیت نازل ہوئی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے ابھی ہمارے سامنے اس کی وضاحت نہیں کی تھی کہ آپؐ کا وصال ہو گیا۔ اس لیے جو چیز تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے چھوڑ کر اسے اختیار کرو جو تمہیں شک میں مبتلا نہ کرے۔''

(اضافہ از مرتب)

شرعی احکام اور اس کی انواع واقسام

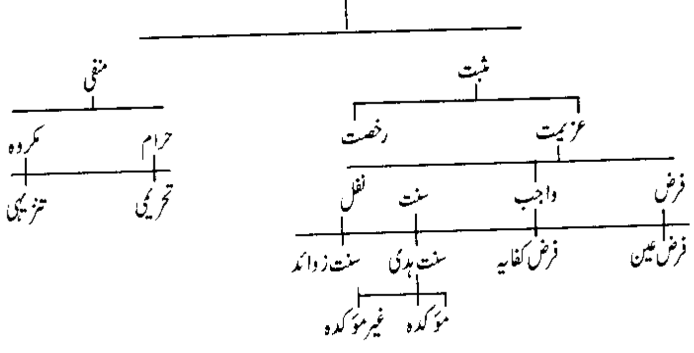

☆ **مثبت : اوامر**

☆ عزیمت : جو اصلاً مطلوب ہو اور عوارضات سے متعلق نہ ہو۔

☆ رخصت : بوجہ عذر مکلف دشواری ختم کرنے اور سہولت حاصل ہونے کے لئے کسی امر میں تبدیلی کرنا رخصت ہے۔

☆ فرض : ایسی دلیل قطعی سے ثابت جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو جیسے قرآن پاک اور حدیث متواتر۔

☆ واجب : جس کی دلیل میں شبہ ہو قطعیت نہ ہو جیسے نماز وتر' صدقہ فطر وغیرہ کہ ان کا ثبوت خبر واحد سے ہے۔ واجب من حیث العمل فرض ہوتا ہے یعنی فرض کی طرح اس پر بھی عمل کرنا لازم ہے اور من حیث الاعتقاد نفل ہوتا ہے۔ پس اس کا منکر کافر نہ ہوگا۔

☆ سنت : وہ کام جس کو نبی ﷺ نے بطریق مداومت کیا ہو اور اس کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے پر ملامت ہو۔

☆ سنت ہدیٰ : اس کا تعلق عبادات سے ہے۔

☆ سنت زائدہ : اس کا تعلق عادات سے ہے۔

☆ سنت مؤکدہ : جس پر حضور اکرم ﷺ نے واجب کیے بغیر عمل کیا ہو۔ اگر آپ ﷺ کا یہ عمل بطریق ہمیشگی ہو تو یہ سنت مؤکدہ ہے۔

☆ سنت غیر مؤکدہ : کبھی کبھی ترک کے ساتھ کیا ہوا عمل غیر مؤکدہ ہے اور اس کو مستحب اور مندوب سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

☆ نفل : اس کے لغوی معنی زیادتی کے ہیں۔ اصطلاحاً وہ عمل جو فرائض اور واجبات پر زائد ہو۔

☆ **منفی : منہیات و ممنوعات**

☆ حرام : جو بدلیل قطعی ممنوع ہو جیسے شراب' خمر وغیرہ۔

☆ مکروہ تحریمی : جو بدلیل ظنی ممنوع ہو جیسے سوسمار (گوہ) کا کھانا اور شطرنج کھیلنا وغیرہ۔ امام محمد مکروہ تحریمی کو حرام ہی کی ایک قسم مانتے ہیں لیکن حرام قطعی بھی نہیں کہتے۔

☆ مکروہ تنزیہی : جس کا ترک عمل کرنے سے اولیٰ ہو۔

حدیث 7

اخلاص' خیرخواہی اور وفاداری

۲۰/اور۲۶/اکتوبر۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۝ (الاعراف)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۝ (الاعراف)

عَنْ اَبِیْ رُقَيَّةَ تَمِيْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِيِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ :

((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ : ((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) (۱)

''ابورقیہ سیدنا تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
''دین خیرخواہی کا نام ہے''۔ ہم (صحابہ) نے کہا (خیرخواہی) کس کے لیے ہو؟
آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے لیے' اُس کی کتاب کے لیے' اُس کے رسول کے لیے' مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کے لیے۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی ﷺ الدِّيْنُ النَّصِيْحَة لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ ...... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان اَنَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَة۔

شرعی احکام اوراس کی انواع واقسام

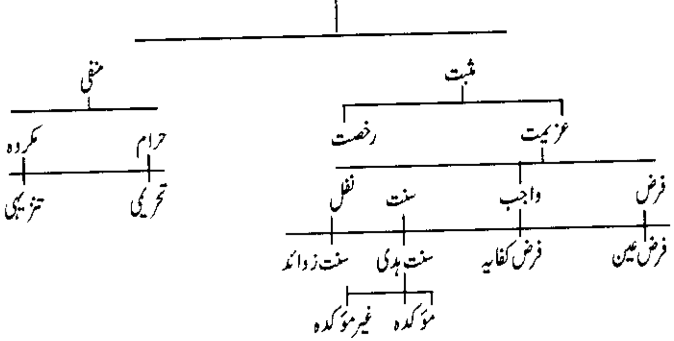

☆مثبت : اوامر

☆ عزیمت : جو اصلاً مطلوب ہو اور عوارضات سے متعلق نہ ہو۔

☆ رخصت: بوجہ عذر مکلف دشواری ختم کرنے اور سہولت حاصل ہونے کے لئے کسی امر میں تبدیلی کرنا رخصت ہے۔

☆ فرض: ایسی دلیل قطعی سے ثابت جس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو جیسے قرآن پاک اور حدیث متواتر۔

☆واجب: جس کی دلیل میں شبہ ہو قطعیت نہ ہو جیسے نماز وتر، صدقہ فطر وغیرہ کہ ان کا ثبوت خبر واحد سے ہے۔ واجب من حیث العمل فرض ہوتا ہے یعنی فرض کی طرح اس پر بھی عمل کرنا لازم ہے اور من حیث الاعتقاد نفل ہوتا ہے۔ پس اس کا منکر کافر نہ ہوگا۔

☆ سنت: وہ کام جس کو نبی ﷺ نے بطریق مداومت کیا ہو اور اس کے کرنے میں ثواب اور نہ کرنے پر ملامت ہو۔

☆ سنت ہدیٰ: اس کا تعلق عبادات سے ہے۔

☆ سنت زائدہ: اس کا تعلق عادات سے ہے۔

☆ سنت مؤکدہ: جس پر حضور اکرم ﷺ نے واجب کیے بغیر عمل کیا ہو۔ اگر آپ ﷺ کا یہ عمل بطریق ہیشگی ہو تو یہ سنت مؤکدہ ہے۔

☆سنت غیر مؤکدہ: کبھی کبھی ترک کے ساتھ کیا ہوا عمل غیر مؤکدہ ہے اور اس کو مستحب اور مندوب سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

☆نفل: اس کے لغوی معنی زیادتی کے ہیں۔ اصطلاحاً وہ عمل جو فرائض اور واجبات پر زائد ہو۔

☆ منفی: منہیات و ممنوعات

☆حرام: جو بدلیل قطعی ممنوع ہو جیسے شراب، خمر وغیرہ۔

☆مکروہ تحریمی: جو بدلیل ظنی ممنوع ہو جیسے سوسمار (گوہ) کا کھانا اور شطرنج کھیلنا وغیرہ۔ امام محمد مکروہ تحریمی کو حرام ہی کی ایک قسم مانتے ہیں لیکن حرام قطعی بھی نہیں کہتے۔

☆ مکروہ تنزیہی: جس کا ترک عمل کرنے سے اولیٰ ہو۔

حدیث
7

اخلاص' خیرخواہی اور وفاداری

۲۰/اور ۲۶/ اکتوبر ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ (الاعراف)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ۝ (الاعراف)

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ۝ (الاعراف)

عَنْ اَبِیْ رُقَيَّةَ تَمِيْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِيِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ :

((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ)) قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ : ((لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ)) (۱)

''ابورقیہ سیدنا تمیم بن اوس داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''دین خیرخواہی کا نام ہے''۔ ہم (صحابہ) نے کہا (خیرخواہی) کس کے لیے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے لیے' اُس کی کتاب کے لیے' اُس کے رسول کے لیے' مسلمانوں کے حکمرانوں اور عوام کے لیے۔''

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ ...... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان انَّ الدِّيْنَ النَّصِيْحَةُ۔

معزز سامعین کرام!

ان اجتماعات میں امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمہ اللہ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعین نوویؒ'' کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا جارہا ہے اور آج اس کتاب کی ساتویں حدیث ہمارے زیرِ مطالعہ ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میری یہ عادت ہے کہ میں حدیث سے مناسبت رکھنے والی کوئی نہ کوئی آیت ابتدا میں ضرور تلاوت کرتا ہوں' لہٰذا میں نے موضوع کی مناسبت سے سورۃ الاعراف کی چند آیات تلاوت کی ہیں۔

سورۃ الاعراف میں جہاں حضرت نوح' حضرت صالح' حضرت ہودؑ حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام جیسے اولوالعزم رسولوں کا تذکرہ ہے وہاں بار بار نصیحت کا لفظ آیا ہے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کی اصل روح نصیحت اور خیر خواہی تھی۔ اُن کے پیش نظر قوم پر اپنی شخصیت کا رعب گانٹھنا' اپنی علّامیت کی دھونس جمانا یا اپنے تقویٰ و تدیّن کا رعب بٹھانا نہیں تھا' بلکہ انبیاء و رسل تو خالصتاً لوگوں کی خیر خواہی اور ان کا بھلا چاہنے کے لیے دعوت و تبلیغ کرتے تھے۔ چنانچہ تلاوت کردہ سورۃ الاعراف کی آیات ۶۱ و ۶۲ میں حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ ہے کہ جب انہوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنی دعوت رکھی اور قوم کو اللہ کی بندگی اور اُس کی توحید کی طرف بلایا تو ان کی قوم نے کہا: اے نوح! ہمیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تم پر کوئی دیوانگی طاری ہوگئی ہے' تم مخبوط الحواس ہو گئے ہو' اسی لیے تم ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو جو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ حضرت نوحؑ نے اس کا جواب بایں الفاظ دیا: ﴿يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! مجھے کوئی خبط لاحق نہیں ہوا''۔ یعنی نہ میں دیوانہ ہوا ہوں اور نہ ہی پاگل ہوا ہوں۔ ﴿وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦١﴾ ''بلکہ میں تو تمام جہانوں کے پروردگار کا ایلچی ہوں''۔ ﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ﴾ ''میں تو تمہیں اپنے ربّ کے پیغامات پہنچا رہا ہوں''۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا' بلکہ بالفاظِ قرآنی: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝٤﴾ (النجم) ''یہ تو وحی ہے (اللہ کی) جو میری طرف کی گئی ہے (اور میں تمہیں وہی پہنچا رہا ہوں)''۔ ﴿وَاَنْصَحُ لَكُمْ﴾ ''اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں''۔ یعنی میں تو تمہارے ساتھ

وفاداری اور خیر خواہی کا حق ادا کر رہا ہوں۔ ﴿وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴿٦٢﴾﴾ ''اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم حاصل ہوا ہے جو تم نہیں جانتے''۔ یعنی اگر تم نے میری بات کو رد کر دیا اور میری دعوت پر لبیک نہ کہا تو تمہاری جو شامت آنے والی ہے وہ مجھے معلوم ہے اور تم اس سے بے خبر ہو۔ میں تو تمہیں اس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں اور تمہیں بار بار کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی روش کو بدلو اور عذاب کے بجائے اللہ کی رحمت کو پکارو، مگر تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اس طرح حضرت صالح علیہ السلام کی قوم پر بھی جب ان کی طرف سے دعوت و تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا اور نتیجتاً ان پر عذابِ الٰہی آ گیا تو حضرت صالحؑ نے فرمایا: ﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! میں نے تو پہنچا دیا تھا تمہیں اپنے رب کا پیغام اور میں نے تو تمہاری خیر خواہی چاہی تھی، لیکن تم ہو کہ اپنے خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے''۔ یعنی تمہارے اندر تمیز ہی ختم ہو گئی ہے اور تم یہ پہچاننے سے قاصر ہو کہ تمہارا خیر خواہ کون ہے اور بدخواہ کون۔ تمہاری بصیرتِ باطنی زائل ہو چکی ہے اور تم اندر سے اندھے ہو گئے ہو۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم نصیحت کرنے والے خیر خواہ کا شکریہ ادا کرتے، مگر تمہارا معاملہ اس کے برعکس رہا اور تم نے اس کا نتیجہ بھگت لیا۔

اسی طرح کے الفاظ حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے کہے تھے۔ جب ان کی قوم ان کی دعوت کو رد کر کے تباہ و برباد ہو گئی تو انہوں نے بڑی ہی حسرت کے ساتھ کہا: ﴿يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿٩٣﴾﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا تھا، تو اب میں کافروں پر (عذاب نازل ہونے سے) رنج و افسوس کیسے کروں!'' یعنی یہ تمہارا اپنا انتخاب (choice) ہے جس کا نتیجہ تم نے بھگت لیا ہے تو میں اب تمہاری ہلاکت پر رنج کروں تو کیونکر کروں!—— یہ انتہائی رنج اور غم والا جملہ ہے کہ قوم کی تباہی کی وجہ سے حضرت شعیب علیہ السلام کی طبیعت پر

رنج وصدمہ طاری ہو رہا ہے لیکن وہ اپنے دل کو سمجھا رہے ہیں کہ میرا رنج وافسوس اب کس بات پر ہے؟ یہ تو ان کے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ ہے جو ان پر وارد ہوا ہے۔

اب یہ لفظ ''نصیحت'' جو انبیاء ورسل علیہم السلام کے ضمن میں قرآن مجید میں بار بار آیا ہے' اسی پر ایک بہت جامع حدیث ہے جو آج ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ یہ حدیث جوامع الکلم میں سے ہے ـــــ میں نے اس سے پہلے بھی آپ کو بتایا ہے کہ کئی مواقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والے خصوصی انعامات کا تذکرہ کیا ہے تو ان میں سے ایک خصوصی انعام یہ ہے کہ: ((اُوْتِیْتُ جَوَامِعُ الْکَلِمِ)) (مسند احمد) ''مجھے نہایت جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں''۔ جوامع الکلم سے مراد یہ ہے کہ کم سے کم الفاظ میں بہت بڑی حقیقت بیان کر دینا' جسے ہم محاورے میں کہتے ہیں: ''دریا کو کوزے میں بند کر دینا''۔ مثلاً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کے حوالے سے فرمایا: ((اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ)) (متفق علیہ) ''روزہ ڈھال ہے''۔ کہنے کو تو یہ صرف دو الفاظ ہیں' مگر ان میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی بے شمار کلمات ہیں جنہیں جوامع الکلم کہا جاتا ہے ـــــ تو ان جوامع الکلم میں سے زیر مطالعہ حدیث بھی ہے۔

حدیث کی تشریح

اس حدیث کے راوی حضرت تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کی کنیت ابو رقیہ ہے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) ''دین تو نام ہے نصیحت (خلوص وخیر خواہی) کا'' ـــــ اصل میں نصح کا لفظ عربی زبان میں اس شے پر بولا جاتا ہے جو اپنی اصلیت پر برقرار ہو اور اس میں کوئی شے شامل نہ کی گئی ہو۔ اسی طرح انسان کی نیت جب صاف اور شفاف ہو اور اس کے اندر کوئی کھوٹ وغیرہ شامل نہ ہو تو وہ نصیحت کہلاتی ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ آپ کسی کو کسی اچھی بات کی دعوت دے رہے ہیں۔ کام تو اچھا ہے' لیکن ہو سکتا ہے کہ اس میں آپ اُس پر اپنی برتری ثابت کر رہے ہوں' تو یہ بات خالص نہیں رہی بلکہ اس کے اندر ملاوٹ آ گئی۔ خلوص واخلاص تب ہوگا جب آپ کو صرف اُس کی خیر خواہی مطلوب ہو' نہ کہ آپ کے مقصودِ نظر

اپنے علم کا رعب گانٹھنا ہو' یا اپنے تقویٰ کا اشتہار دینا ہو' یا اپنے نفس کو مطمئن کرنا ہو کہ یہ مجھ سے کمتر ہے اور میں اس سے بہتر ہوں۔ اگر یہ شے شامل ہو گئی تو اب وہ بات خالص نہیں رہی۔ یہ دودھ خالص نہیں رہا' اب اس کے اندر پانی ہی نہیں' بلکہ جوہڑ یا کسی گندی نالی کا پانی ملا دیا گیا ہے۔ تو نصح کہتے ہی اس چیز کو ہیں جو بالکل خالص ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دین تو نام ہی خیر خواہی' وفاداری اور خلوص و اخلاص کا ہے۔ تو یہ دین کا خلاصہ ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ اللہ کا دین ایک حقیقت واحدہ ہے' البتہ اس کو بیان کرنے اور سمجھانے کے اسلوب جدا جدا ہیں۔ کبھی کسی حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے' کبھی کسی اصطلاح میں بات ہو رہی ہے' کبھی اصطلاحات بدل کر کچھ اور انداز اختیار کیا گیا ہے' مگر جب غور کریں گے تو بات وہیں ایک نکتہ پر پہنچ جائے گی۔ اس کے لیے میں فیصل آباد میں موجود گھنٹہ گھر کی مثال دیا کرتا ہوں۔ شہر کے آٹھ بازار ہیں جو اس گھنٹہ گھر پر آ کر جمع ہو رہے ہیں۔ آپ جس دروازے اور جس بازار سے بھی داخل ہوں تو گھنٹہ گھر سامنے ہی آئے گا۔ اسی طرح دین کی حقیقت واحدہ کو بیان کرنے کے لیے بھی بے شمار اسلوب ہیں' جیسے کسی نے کہا ہے: ع ''اِک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں''۔ اب یہ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کا ایک مظہر ہے کہ وہ ایک پھول کی تعریف کس انداز میں اور کن کن پہلوؤں سے کر رہا ہے۔ تو یہاں دین کی حقیقت کو ایک جملہ میں واضح کیا گیا ہے کہ دین تو نام ہی خیر خواہی اور خلوص و اخلاص کا ہے۔

اس پر حضرت تمیم بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا: ((لِمَنْ؟)) یعنی اے اللہ کے رسول ﷺ! دین خیر خواہی تو ہے مگر وہ خیر خواہی اور خلوص و اخلاص کس کے ساتھ اور کس کے لیے ہے؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ)) ''(۱) اللہ کے لیے' (۲) اُس کی کتاب کے لیے' (۳) اُس کے رسول کے لیے' (۴) مسلمانوں کے اماموں کے لیے' اور (۵) عام مسلمانوں کے لیے''۔ گویا ایک بندۂ مسلم کو یہ پانچ وفاداریاں نبھانی ہیں۔ اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ پانچ اعتبارات سے اس میں خلوص اور اخلاص ہو' یعنی بغیر کسی

ملاوٹ اور کھوٹ (impurity) کے وہ ان پانچ کا حق ادا کرے۔

اب غور کیجیے کہ ان پانچ میں سے پہلی تین چیزیں تو وہ ہیں جن کے نصح و خیر خواہی کے چار تقاضے ہیں: (۱) ایمان: اللہ پر ایمان' اس کی کتاب (قرآن) پر ایمان' اس کے رسول (محمدﷺ) پر ایمان۔ (۲) اطاعت: اللہ کی اطاعت' اُس کی کتاب کی اطاعت' اُس کے رسول کی اطاعت۔ (۳) محبت: اللہ سے محبت' اللہ کی کتاب سے محبت' اللہ کے رسول سے محبت۔ اور (۴) وفاداری: اللہ کے ساتھ وفاداری' اللہ کی کتاب سے وفاداری' اللہ کے رسول کے ساتھ وفاداری۔

اللہ' قرآن اور رسولؐ کے ساتھ خیر خواہی کا پہلا تقاضا: ایمان

دیکھیے اللہ تعالیٰ' قرآن مجید اور حضرت محمدٌ رسول اللہﷺ کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا پہلا تقاضا ایمان ہے۔ ایمان کے حوالے سے بہت تفصیلی بحثیں ہیں۔ ایک قانونی وفقہی ایمان ہے جس کی بنیاد پر دنیا میں ہم ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کا تعلق اقرار باللسان سے ہے' یعنی کسی نے زبان سے کہا: اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ تو اب وہ مسلمان ہے۔ اب ہمیں پتا نہیں ہے کہ وہ خلوصِ دل سے اس کا اقرار کر رہا ہے یا منافقت کے ساتھ کہہ رہا ہے۔ یہ ہم نہیں جانتے اور نہ ہی ہم اس سے بحث کر سکتے ہیں' اس لیے کہ اس کے دل میں اُتر کر دیکھنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ یہ اصل ایمان نہیں ہے۔ یہ ایمان تو صرف دنیا میں کام آتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس قانونی ایمان کی ہمارے آپس کے تعلقات کے ضمن میں بہت اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ میں مسلمان ہوں تو میری بیٹی کا نکاح کسی مسلمان ہی سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا مجھے دیکھنا پڑے گا کہ جدھر سے رشتہ آیا ہے وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں! اسی طرح اسلامی ریاست کا سربراہ مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی چاہے اسلامی ریاست دنیا میں کہیں نہیں ہے لیکن جتنے بھی مسلمان ممالک ہیں ان میں یہ طے ہے کہ وہاں کا سربراہ مسلمان ہوگا۔ اب کون مسلمان ہے' کون نہیں ہے اور پھر اس کے معیارات کیا ہیں' یہ میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی جو شخص زبان سے اللہ

کی وحدانیت اور محمد ﷺ کے آخری نبی ہونے کا اقرار کرے تو وہ مسلمان شمار ہوگا۔

یہ تو قانونی ایمان ہے' جبکہ اس کے مقابلے میں ایک حقیقی ایمان ہے جو اصل میں نام ہے یقینِ قلبی کا۔ جب یہ شہادت کسی کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تو وہ شخص حقیقی معنوں میں ''مؤمن'' ہے— علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر یاد آ گیا: ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا اللہ
لغتِ غریب' جب تک ترا دل نہ دے گواہی!

عرب وہ ہے جس کی زبان عربی ہے اور اسے لا الٰہ الا اللہ کے معنی معلوم ہیں جبکہ بیچارے عجمی کو پتا ہی نہیں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی کیا ہیں۔ لیکن یہ الفاظ ادا کرنے والا خواہ عرب ہو یا عجم' یہ اُس شخص کی اپنی زبان کے الفاظ شمار نہیں ہوں گے جب تک کہ اس کا دل اس کی گواہی نہیں دے گا۔ اس اعتبار سے ایمان کا تقاضا صرف زبانی گواہی اور شہادت سے پورا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کا یقین ہونا بے حد ضروری ہے۔ البتہ اس یقینِ قلبی کے پھر مدارج اور مراحل ہیں جو ہم حدیثِ جبریل کے ضمن میں پڑھ چکے ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان میں اس قدر یقین پیدا ہو جائے گویا وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہمارا اسلوبِ بیان ہے۔ جس چیز کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اُس پر ہمارا یقین ہو جاتا ہے۔ جیسے ہزار آدمیوں نے آ کر کسی واقعہ کے بارے میں خبر دی تو ہم یہی سمجھیں گے کہ یہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے' آخر انہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے' لیکن دل میں ایک خلش سی ہوگی کہ شاید ایسا نہ ہو۔ پورا یقین تب ہوگا جب اپنی آنکھوں سے خود جا کر دیکھ لیں گے۔ مثلاً کسی نے آ کر بتایا کہ فلاں جگہ آگ لگی ہوئی ہے' خود جا کر دیکھ لیا' تو یقین آ گیا۔ ایسا یقین جو بچشمِ سر مشاہدہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے اگر اللہ پر' آخرت پر' بعث بعد الموت پر' وحی پر' فرشتوں پر' جنت پر' دوزخ پر' رسولوں پر' نبیوں پر' کتابوں پر پیدا ہو جائے تو یہ ایمان کا سب سے بڑا درجہ ہے۔ اس حوالے سے حدیثِ جبریل میں فرمایا گیا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ)) ''(احسان یہ ہے کہ) تم اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو''— اس سے ایک کم تر درجہ

بیان فرما دیا گیا: ((فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) یعنی یہ ہر وقت مستحضر رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، میں اُس کی نگاہوں میں ہوں۔ کم سے کم یہ درجہ تو ہو ورنہ پھر یقین والی بات نہیں رہے گی۔ ویسے یقین کی گہرائی کا تو ہم اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے شاید پہلے بھی سلطان باہو کا ایک شعر آپ کو سنایا ہے — مجھے پنجابی زیادہ نہیں آتی اور پنجابی صوفیاء کے کلام کا میں نے خاص مطالعہ بھی نہیں کیا، لیکن بعض چیزیں جو سننے میں آتی ہیں وہ واقعتاً محسوس ہوتی ہیں کہ بہت گہری باتیں ہیں — سلطان باہو کہتے ہیں: ؎

دل دریا سمندروں ڈونگھے
کون دلاں دیاں جانے ہو!

یعنی آپ دل کو ناپ نہیں سکتے کہ یہ کتنا گہرا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل مسکن ہے روح کا اور روح کی گہرائی کو آپ جان ہی نہیں سکتے کہ روح کا تعلق تو ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل) ''(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے''۔ تم روح اور اللہ کی ذات کی حقیقت کو کیا سمجھو گے؟ تم تو بس اللہ کی صفات کو سمجھنے کی کوشش کرو، اللہ کی نشانیوں پر ایمان لاؤ! اللہ کی ذات کے بارے میں تو سوچنے سے بھی روک دیا گیا ہے، اس لیے کہ وہ انسانی طاقت سے ماوراء ہے اور یہ بات **تکلیف ما لا یطاق** کے زمرے میں آتی ہے، یعنی دماغ کو خواہ مخواہ ایک ایسی مشق میں ڈال دینا جس کی اس کے اندر طاقت ہی نہیں ہے۔

دوسرا اور تیسرا تقاضا: اطاعت اور محبت

اس کے بعد دوسرا تقاضا ہے: اطاعت، یعنی اللہ کی اطاعت، اس کی کتاب قرآن مجید کی اطاعت اور اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کی اطاعت — پھر تیسرا تقاضا محبت ہے، یعنی صرف اطاعت نہیں بلکہ محبت کے ساتھ اطاعت مطلوب ہے، اس لیے کہ اطاعت تو مجبوراً بھی کی جاتی ہے۔ جیسے ہم انگریزوں کے مجبوراً مطیع تھے، کیونکہ ہم ان کے غلام

تھے۔ وہ یہاں آئے اور انہوں نے یہ علاقہ فتح کر لیا۔ اب ہمارے پاس اُن کی اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ لیکن یہ اطاعت محبت کی وجہ سے نہیں' بلکہ مجبوراً تھی۔ اسی طرح بنی اسرائیل فرعون کے غلام ہونے کی وجہ سے اس کے اطاعت گزار تھے' تو یہ بھی مجبوری کی اطاعت تھی' لیکن یہاں اللہ' اللہ کے رسول اور اللہ کی کتاب کی اطاعت مجبوراً نہیں بلکہ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر مطلوب ہے۔

اللہ کے لیے اطاعت + محبت = عبادت

اس ضمن میں ایک بڑا عجیب سا نکتہ ہے۔ یہ اصطلاحات کا معاملہ ہے جس کو سمجھنا چاہیے۔ اللہ کی ذات کے ساتھ اطاعت اور محبت جمع ہو جائیں تو اس کا نام عبادت ہے' اور یہی ہمارا مقصد تخلیق ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''

عبادت کے حوالے سے تفصیلی گفتگو ''اربعین نووی'' کی تیسری حدیث کے مطالعہ میں ہو چکی ہے' جس میں عبادت کا مفہوم تفصیل سے بیان کیا گیا تھا کہ لفظ عبادت عبد سے نکلا ہے جس کے معنی غلام کے ہیں۔ غلام کو ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ اپنے آقا کی اطاعت کرنا ہوتی ہے' اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ آقا اسے جہاں سونے کو کہے گا وہاں سونا ہوگا اور جہاں اور جس وقت جانے کو کہے گا جانا ہوگا۔ بالکل یہی عبادت کا مفہوم ہے کہ اللہ (جو ہمارا آقا ہے) کی اطاعت میں عبدیت (غلامی) کا تصور ہر وقت ذہن میں نقش رہے۔ البتہ غلامی اور عبادت میں ایک فرق ملحوظ رہے کہ غلام اپنے آقا کی اطاعت مجبوری سے کر رہا ہوتا ہے' جبکہ بندہ مجبور ہو کر نہیں بلکہ محبت الٰہی کے جذبۂ مستانہ سے سرشار ہو کر اپنی جبین نیاز کو بارگاہِ الٰہی میں اس ادا سے رکھتا ہے کہ جسم ظاہری کے روئیں روئیں سے انا عبدك ' انا عبدك کی صدائے حق بلند ہوتی ہے۔ اگر ربّ العالمین کی اطاعت کلی انتہائی محبت کے ساتھ ہو تب عبادت کا حق ادا ہوتا ہے۔

اس حوالے سے میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہماری عبادت کا اس مقام و مرتبہ تک پہنچنا انتہائی مشکل کام ہے' لہٰذا اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہوگا کہ آپ طے کر لیں کہ مجھے

چلنا اسی راستے پر ہے۔ پھر اس راہ میں نشیب و فراز آئیں گے' کہیں قدم ڈگمگائیں گے' کہیں جذبات کا غلبہ ہوگا' کبھی ناامیدی ہی ناامیدی چھائے گی اور کسی جگہ اُمید کی کرن نظر آئے گی' مگر آپ کو بندگی اور پرستش کے راستے پر مسلسل چلتے رہنا ہے۔ اگر کہیں قدم پھسل گیا' یا اندر سے نفسِ امارہ کے اُبال کے نتیجہ میں کوئی گناہ سرزد ہو گیا تو اب وہیں کیچڑ میں پڑے نہیں رہنا' کبھی بھی کسی گناہ پر مصر نہیں ہونا اور ڈیرہ ڈال کر نہیں بیٹھنا' بلکہ فوراً اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے اور استغفار کرنا ہے۔ ہزار بار بھی گناہ سرزد ہو جائے تو توبہ کرو' اللہ معاف کر دے گا: ؎

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ!

یعنی یہ میری درگاہ نا اُمیدی والی جگہ نہیں ہے' اگر سو مرتبہ پہلے بھی توبہ کر کے توڑ چکے ہو تو کوئی بات نہیں' دوبارہ توبہ کرو' میں تمہاری توبہ قبول کروں گا۔ توبہ کا دروازہ تو ما لم یغرغر کی کیفیت یعنی موت کے آثار نظر آنے سے پہلے تک ہمیشہ کے لیے کھلا ہے' لیکن یہاں یہ بھی یاد رہے کہ اگر ایک گناہ پر آپ ڈیرے جما کر بیٹھ گئے تو یہ ایک گناہ ہی تباہی' ہلاکت اور خلود فی النار کے لیے کافی ہے۔ یہ ہے عبادت کا جامع مفہوم!

رسولؐ کے لیے اطاعت + محبت = اتباع

اگر یہ اطاعت اور محبت رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے تو یہ ''اتباع'' بنے گا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ رسول کی عبادت نہیں' اتباع اور پیروی ہوتی ہے' جبکہ اللہ کا اتباع ممکن ہی نہیں ہے۔ اس حوالے سے یہ جان لیجیے کہ اطاعت کی جاتی ہے کسی کے حکم کی' یعنی کسی نے کہا یہ کرو' یہ نہ کرو' اور آپ نے وہ بات مان لی تو یہ اطاعت ہے۔ اتباع یہ ہے کہ کسی کی پسند اور معمولاتِ زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ خود سے ہی اس کی پیروی کریں۔ آپ دیکھیں کہ ان کا نہج اور انداز کیا ہے' وہ رات کو سوتے کیسے ہیں' وہ چلتے کیسے ہیں' ان کا طرزِ تخاطب کیا ہے' ان کو پسند کیا ہے۔ اگر آپ بغیر ان کی طرف سے حکم دیے ان سب باتوں کی پیروی کرتے ہیں تو یہ اتباع ہے۔ اس اعتبار سے اللہ کا اتباع تو ممکن نہیں ہے' اس

لیے اللہ کی صرف عبادت ہو گی‘ جبکہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ایسا ممکن ہے تو ان کا اتباع ہو گا۔قرآن حکیم نے بھی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا حکم دیا ہے۔سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾(آیت ۳۱) ’’(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو‘ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔‘‘

سورۂ آل عمران کی اگلی آیت میں اللہ اور رسول دونوں کے لیے اطاعت کا لفظ آیا ہے۔فرمایا: ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ ’’کہہ دو کہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کا حکم مانو۔ پھر اگر وہ نہ مانیں تو (یاد رکھیں کہ) اللہ بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا‘‘۔یعنی اگر اللہ اور رسول میں سے کسی ایک کی بھی اطاعت نہیں ہے تو پھر آپ کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں‘ چاہے یہ کفر معنوی ہے۔خواہ آپ نے حد عبور نہیں کی اور اسلام سے نکل کر کفر میں نہیں گئے‘ لیکن یہ فعل اصلاً کفر ہو گیا۔ جیسے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ جِهَارًا))(۱) ’’جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اُس نے علانیہ کفر کیا‘‘۔ترکِ صلاۃ کافرانہ فعل ہے اور اس میں کفر مضمر ہے‘ البتہ آپ تارکِ صلاۃ کو کافر نہیں کہیں گے‘ اس لیے کہ اس نے حقیقی کفر کا ارتکاب نہیں کیا —— الغرض یہ یاد رکھیں کہ اللہ کے لیے اطاعت جمع محبت‘ عبادت بن گئی اور رسول کے لیے اطاعت جمع محبت اتباع بن گیا۔

اسی حوالے سے ایک بات اور نوٹ کیجیے کہ جب بھی ایمان یا اطاعت کا ذکر آئے گا تو اللہ کے فوراً بعد رسول کا ذکر ہو گا‘ جبکہ یہاں زیر مطالعہ حدیث میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اللہ کے بعد پہلے کتاب کا ذکر ہے اور پھر رسول کا —— لِلّٰهِ وَلِكِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ —— اب یہ ترتیب بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اور اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ میں کتاب پر ایمان اور کتاب کی اطاعت اللہ پر ایمان اور اللہ کی اطاعت ہی میں شامل ہے۔کتاب چونکہ اللہ کا کلام ہے اس حوالے سے

(۱) الجامع الصغیر للسیوطی‘ ح:۸۵۸۷۔ مجمع الزوائد للھیثمی: ۱/۳۰۰۔

ہاں پر اس کو الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن یہاں خیر خواہی اور وفاداری کا تذکرہ ہے اور اللہ اور اس کی کتاب کے ساتھ وفاداری کے تقاضے چونکہ الگ الگ ہیں اس لیے یہاں کتاب کو الگ بیان کیا گیا ہے۔

چوتھا تقاضا: وفاداری

اللہ' اُس کے رسول ﷺ اور کتاب کے ساتھ خیر خواہی کا چوتھا تقاضا وفاداری ہے۔ یہ وفاداری مسلمانوں کے امراء اور عام لوگوں کے لیے بھی ہے' فرق اتنا ہے کہ ان پانچوں —— (۱) اللہ عزوجل' (۲) اللہ کی کتاب قرآن مجید' (۳) اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ' (۴) ائمۃ المسلمین (اس کے مصداق آگے بیان ہوں گے)' اور (۵) عام مسلمان یعنی عوام —— کے لیے وفاداری کے تقاضے مختلف ہیں۔ یہاں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ ایک بندۂ مسلم کو یہ پانچ وفاداریاں نبھانی ہیں۔ ذیل میں اب ان پانچوں میں سے ہر ایک کی وفاداری اور خیر خواہی کے تقاضوں کو بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ عزوجل کے ساتھ وفاداری کے تقاضے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی سطح پر اُس کے تمام احکام پر عمل پیرا ہوا جائے اور اجتماعی سطح پر بھی اس کے قوانین کو نافذ کیا جائے۔ انفرادی سطح پر وفاداری یہ ہے کہ جن احکام پر عمل کرنا ممکن ہے' چاہے کتنا ہی مشکل ہو' ان پر عمل کیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے' یعنی مشکل اعمال پر عمل نہیں کیا جاتا تو یہ اللہ کے ساتھ بے وفائی ہے۔ انفرادی سطح پر بے وفائی کی ایک صورت یہ ہے کہ اَحکامِ الٰہیہ میں تفریق کر دی جائے کہ کچھ احکام تو سر آنکھوں پر ہوں اور کچھ اَحکام پاؤں تلے روندے جائیں۔ اس پر قرآن مجید میں بدترین وعید آئی ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (البقرة)

''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟ پس کوئی سزا

نہیں ہے ان کی جو یہ طرزِ عمل اختیار کریں سوائے اس کے کہ دنیا میں ذلیل وخوار کر دیے جائیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں۔ اور اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

طاغوتی نظام کو بدلنے کی جدّوجُہد: اللہ کے ساتھ وفاداری کا لازمی تقاضا

اس حوالے سے یہ بھی یاد رہے کہ جن احکاماتِ الٰہیہ پر عمل ممکن نہیں ہے ان کا تو معاملہ ہی الگ ہے' مثلاً آج ہمارے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم چور کا ہاتھ کاٹیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ سود سے بالکلیہ بچ جائیں۔ سود کا دخان یعنی اس کا غبار یا اس کا دھواں تو میرے اندر جائے گا ہی' لیکن براہِ راست سود میں شمولیت میرا جرم ہے' اس لیے کہ اس کو تو میں چھوڑ سکتا ہوں۔ اس اعتبار سے اللہ کے ساتھ وفاداری کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ شریعت کے جن احکام پر عمل ممکن ہو' چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو' ان پر عمل کیا جائے۔ وفاداری کا دوسرا تقاضا اجتماعی سطح پر ہے کہ جن احکام پر عمل ناممکن ہے ان پر عمل کرنے کے لیے اس نظام کو بدلنے کی جدوجہد کی جائے۔ اگر آپ جدوجہد نہیں کر رہے ہے تو آپ اللہ کے وفادار کہاں سے ہوئے! آپ تو اللہ کے باغیوں کے وفادار ہیں جن کے ساتھ آپ تعاون کر رہے ہیں۔ جب آپ نے اللہ کے غداروں کی قیادت اور ان کی حکومت تسلیم کر لی تو اللہ کے ساتھ وفاداری کہاں رہی؟ اس لیے کہ یہ مسلّمہ اصول ہے کہ غدار کا ساتھی بھی غدار ہے۔ نائن الیون کے بعد بش نے یہ الفاظ کہے تھے:

"You are with us or against us."

یعنی یا تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے دشمن ہو' درمیان میں کوئی شے نہیں ہے۔ اگر افغانستان میں ہمارا ساتھ نہیں دو گے تو ہماری دشمنی کے لیے تیار ہو جاؤ! یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا' جس پر ہمارا کمانڈو صدر☆ کانپ گیا اور سارے مطالبات ایک فون کال پر تسلیم کر لیے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اللہ پر تو یقین ہے نہیں اور نہ اللہ کے ساتھ وفاداری ہے۔ چنانچہ جب ہم اللہ کے ساتھ وفادار نہیں تو وہ ہماری مدد کیوں کرے گا؟ وہ تو فرماتا ہے: ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ۝۷﴾ (محمد) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو

☆ ڈاکٹر صاحب کے یہ خطابات ۲۰۰۷ء کے ہیں جب جنرل پرویز مشرف پاکستان کے صدر تھے۔

گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا''۔ یہ نہیں کہ تم نے تو کسی اور کی طرف رخ پھیرا ہوا ہے' اللہ کے دشمنوں کے ساتھ تمہاری دوستیاں ہیں' اور اللہ تمہاری نصرت میں لگا رہے گا' معاذ اللہ! تو جب اللہ پر بھروسہ نہیں تو پھر بش سے تو ڈرنا ہی ڈرنا ہے۔

حال ہی مجھے معلوم ہوا ہے کہ اصل میں یہ (You are with us or against us) بش کے نہیں' بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ ہیں جو بائبل میں اس طرح آئے ہیں:

"He who is not with me is against me."

تو اللہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ میرے ساتھ ہو یا میرے خلاف ہو! درمیان میں کوئی بات نہیں۔ اگر میرے وفادار ہو تو میرے باغیوں کے خلاف تمہارا اعلانِ جنگ ہونا چاہیے۔ ان سے تعاون کیسا؟ ان کی چاکری کیسی؟ ان کو تقویت دینا چہ معنی دارد!

یہ اللہ کے ساتھ وفاداری کا کٹھن تقاضا ہے اور اس وفاداری کے بغیر عبادت کا تقاضا بھی پورا نہیں ہوتا۔ عبادت کے حوالے سے میں نے کہا تھا کہ ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ جہت اللہ کی اطاعت ہو۔ جب نظام کافرانہ ہے تو آپ کی اطاعت مکمل ہو ہی نہیں سکتی' اس لیے کہ کسی باطل نظام کے تحت رہتے ہوئے آپ کُلّی اطاعت کر ہی نہیں سکتے۔ الغرض جن احکام پر عمل ممکن ہے اگر وہ بھی نہیں کرتے تو آپ مجرم ہیں' لیکن جن پر عمل ممکن نہیں ہے تو اس کے بارے میں' میں نے بارہا بیان کیا ہے کہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کی جدوجہد کرو' اس کے لیے تن من دھن لگاؤ۔ یہ اللہ کے ساتھ وفاداری کا تقاضا ہے' البتہ آگے اس کے درجے ضرور ہیں۔

انسدادِ منکر کے تین درجات

ہم نے یہ حدیث کئی بار پڑھی ہے:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''تم میں سے جو شخص کسی منکر (برائی) کو دیکھے تو اسے اپنے زورِ بازو سے بدل ڈالے۔ پھر اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اسے برا کہے۔ پھر اگر اس کی طاقت

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان......

بھی نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا جانے' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

ہمارے سامنے سب سے بڑا منکر طاغوت کا نظام ہے۔ کسی نے چھوٹی سی چیز چوری کر لی' ٹھیک ہے برا کام ہے' جرم ہے' گناہ ہے' مگر طاغوتی نظام جو اللہ کی بغاوت پر مشتمل ہے یہ سب سے بڑا منکر ہے۔ اس نظام (سیکولرازم) کے تصورات ملاحظہ ہوں کہ ہم کسی آسمانی ہدایت کو نہیں مانتے' کسی آسمانی قانون کو نہیں مانتے۔ ہم تو خود حاکم ہیں اور عوامی حاکمیت (popular sovereignty) کی بنیاد پر جمہوریت (democracy) چلے گی۔ ہم خود طے کریں گے کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز۔ ہم چاہیں گے تو جنس پرستی کو جائز قرار دیں گے' ہم چاہیں گے تو زنا کو کوئی جرم یا کوئی گناہ قرار دیں گے' نہیں چاہیں گے تو نہیں دیں گے۔ [چنانچہ مغرب میں زنا بالرضا کوئی جرم نہیں ہے' البتہ اگر نابالغ لڑکی سے یا کسی سے زبردستی زنا (rape) کیا ہے تو یہ جرم ٹھہرے گا۔] اسی طرح ہمارا معاشی نظام سود پر چلے گا' ملینز کی لاٹریاں ہوں گی۔ ہم قحبہ گری کو قانونی تحفظ فراہم کریں گے اور سیکس ورکرز کو باقاعدہ طور پر ہیلتھ سرٹیفکیٹ اور لائسنس ایشو کریں گے کہ یہ ایڈز اور مہلک بیماریوں کے جراثیم سے پاک ہیں۔

یہ نظام یقینی طور پر اللہ کے خلاف بغاوت پر مشتمل ہے' بایں طور کہ اللہ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اس نظام میں ان تمام کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ تو اب اللہ کے ساتھ وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس نظام کو بدلنے کی جدوجہد کریں۔ ماقبل بیان کی گئی حدیث میں منکر کے خلاف تین درجات بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے کم اور آخری درجہ یہ ہے کہ آپ کے دل میں اس باطل اور طاغوتی نظام کے خلاف شدید ترین نفرت ہو۔ آپ کو یہ پریشانی لاحق رہے کہ میں کہاں رہ رہا ہوں' کیوں رہ رہا ہوں۔ پھر آپ اس ماحول پھلنے پھولنے کی کوشش کرنے کے بجائے قُوتِ لایموت پر گزارہ کریں اور اپنا پورا وقت اور صلاحیت مجموعی طور پر فارغ کر کے اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ تو آخری درجہ ہے۔ اس سے اوپر کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ زبان سے اس نظام کو برا کہیں۔ یعنی اپنی زبان اور قلم سے اتنا تو کہیں کہ یہ نظام کافرانہ ہے' طاغوتی اور

باطل نظام ہے‘ اس لیے میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ سب سے اوپر تیسرا درجہ یہ ہے کہ آپ اس نظام کے خلاف ہاتھ کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے میدان میں آ جائیں اور نظام کو جڑ سے اُکھیڑ کر دین کے نظام کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔ یہ سب کریں گے تو اللہ کے ساتھ وفاداری کے تقاضے پورے ہوں گے‘ ورنہ بے وفائی ہی بے وفائی ہے۔

قرآن کے ساتھ وفاداری کے تقاضے

دوسرے نمبر پر ایک مسلمان کو قرآن کے ساتھ وفادار ہونا بھی لازم ہے۔ قرآن کے ساتھ وفاداری میں بھی اللہ کے ساتھ وفاداری کے سارے تقاضے آ جائیں گے۔ کتاب اللہ کے ساتھ ایک جذباتی تعلق تو ہمارے ہاں پایا جاتا ہے اور قرآن مجید کی اگر بے حرمتی ہو تو ہم تڑپ اٹھتے ہیں۔ یہ حمیت ایک جذباتی معاملہ ہے — ایک دفعہ ہمارے ہاں قرآن مجید کی بے حرمتی پر بڑی احتجاجی مہم چلی تھی۔ اس ضمن میں مسجد شہداء میں ایک بڑا جلسہ ہوا تھا‘ آس پاس کی ساری سڑکیں عوام سے بھری پڑی تھیں۔ وہاں میں نے کہا تھا کہ اصل میں تو ہم خود قرآن کو ذبح کر رہے ہیں‘ قرآن کے احکام کو توڑ رہے ہیں‘ اصل بے حرمتی تو ہم خود کر رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ)) (۱)

”وہ شخص قرآن پر ایمان نہیں لایا جس نے اس کے حرام کو حلال ٹھہرالیا۔“

اسی طرح اگر حضور ﷺ کی توہین ہو جائے تو بجا طور پر ایک طوفان اُٹھ جائے گا‘ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو آپ ﷺ کی توہین تو ہم خود بھی کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ کی سنت کا اتباع نہ کر کے اور آپؐ کے احکام کو پاؤں تلے روند کر ہم خود نبی اکرم ﷺ کی گویا توہین کر رہے ہیں‘ لیکن اگر کوئی غیر مسلم توہین کر دے تو ہمارا خون کھول اٹھتا ہے۔ یہ اچھی بات ہے‘ اتنی حمیت تو ہونی چاہیے‘ لیکن یہ معاملہ صرف جذباتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ وفاداری‘ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے ساتھ وفاداری کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الأجر۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے پانچ حقوق

قرآن کے ساتھ وفاداری کے ضمن میں میرا کتابچہ ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا مطالعہ بہت مفید رہے گا۔ یہ کتابچہ میرے دو خطاباتِ جمعہ پر مشتمل ہے جو میں نے نصف صدی قبل جامع مسجد خضریٰ' سمن آباد میں دیے تھے۔ بعد میں' میں نے ازخود ترتیب دے کر انہیں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ الحمد للہ! اب تک یہ کتابچہ لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکا ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے لوگوں نے خود کرا کر مجھے دیے ہیں۔ ایک صاحب نے عربی میں ترجمہ کیا۔ ایک صاحب جو کسی یونیورسٹی کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے اور جن سے میں واقف بھی نہیں تھا' انہوں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ایک صاحب ہیلے کالج آف کامرس میں انگلش کے پروفیسر تھے' انہوں نے انگلش میں ترجمہ کیا اور پھر چھپوانے کا اہتمام بھی خود کیا۔ اس کے علاوہ بہت سی زبانوں مثلاً سندھی' پشتو' بنگلہ' مہاراشٹر کی زبان' تامل زبان اور ہندوستان میں بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں خالص ہندی میں چھپا ہوا نسخہ میرے پاس آیا۔

اس مختصر سے کتابچہ میں' میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق بیان کیے ہیں۔ اگر آپ ان پانچ حقوق کو ادا کرتے ہیں تو پھر آپ قرآن کے ساتھ وفادار ہیں' ورنہ نہیں۔ وہ پانچ حقوق یہ ہیں:

پہلا حق: ایمان و تعظیم: یعنی اس پر یقین والا ایمان ہو اور پھر اس کے نتیجے میں اس کی تعظیم ہو۔ یہ تعظیم ظاہری بھی ہو کہ گر گیا تو آپ نے اٹھا کر چوما اور کچھ مال خیرات کر دیا۔ اسی طرح اس کو اونچی جگہ پر رکھنا اور وضو کے بغیر اس کو ہاتھ نہ لگانا' یہ سب چیزیں اس کی تعظیم میں شامل ہیں۔ لیکن اس کی حقیقی تعظیم یہ ہے کہ اس کے احکام کو مانو' ان پر عمل کرو۔ اگر احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتے تو پھر ظاہر بات ہے کہ آپ اس کی حقیقی تعظیم نہیں کر رہے۔

دوسرا حق: تلاوت و ترتیل: یعنی اسے پڑھو جیسے کہ پڑھنے کا حق ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ﴾ (البقرۃ:۱۲۱) ''وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی

ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے''——قرآن کی تلاوت کا حق اور اس کی ادائیگی کی شرائط بھی ہیں' مثلاً تجوید کے ساتھ پڑھنا' روزانہ کا معمول بنانا' خوش الحانی سے تلاوت کرنا' آدابِ ظاہری و باطنی کا خیال رکھنا' اور ترتیل کے ساتھ پڑھنا' یعنی نماز اور خصوصاً نمازِ تہجد میں قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر توقف سے پڑھنا۔

تیسرا حق: تذکر و تدبر: یعنی اسے سمجھو جیسے کہ سمجھنے کا حق ہے۔ اس کے دو درجے ہیں: تذکر بالقرآن اور تدبر بالقرآن' یعنی قرآن سے نصیحت حاصل کرنا اور قرآن مجید کی آیات میں غور وفکر کرنا۔

چوتھا حق: حکم و اقامت: یعنی ہر مسلمان اس کے اَحکام کو مانے' اس پر عمل کرے اور اسی کو اپنے درمیان حَکَم (منصف) بنائے۔

پانچواں حق: تبلیغ و تبیین: یعنی اسے پہنچاؤ' اس کی تبلیغ کرو اور اسے عام کرو۔ تبیین' تبلیغ کا بلند ترین درجہ ہے —— الغرض یہ پانچ حق ادا کریں گے تو آپ قرآن کے ساتھ وفاداری کا حق نبھا رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کے تقاضے

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کے چار تقاضے سورۃ الاعراف کی ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف)

''تو جو لوگ ان پر ایمان لائے' اور ان کی تعظیم کی' اور ان کی مدد کی' اور جو نور ان کے ساتھ نازل ہوا ہے اس کی پیروی کی' تو یہی مراد پانے والے ہیں۔''

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کے چار حقوق کا تذکرہ ہے' جن کے ادا کرنے سے ہی رسولؐ کے ساتھ وفاداری کا حق ادا ہوگا۔

پہلا تقاضا: ایمان: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا پہلا تقاضا ایمان ہے' یعنی آپؐ پر دلی یقین والا ایمان ہو۔ اس حوالے سے تفصیلی گفتگو ماقبل ہوگئی ہے۔

دوسرا تقاضا: تعظیمِ رسولؐ : دوسرا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی کما حقہٗ تعظیم ہو۔ جب آپ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا نام لیا جائے اور آپ ان پر درود نہ بھیجیں تو آپ گویا رسول اللہ ﷺ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تو یہ بھی لازم تھا کہ ان کی آواز حضور ﷺ کی آواز سے اونچی نہ ہو جائے۔ اس حوالے سے سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴿۲﴾﴾ (الحجرات)

''اے اہل ایمان! اپنی آوازیں پیغمبرؐ کی آواز سے اونچی نہ کرو' اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو' مبادا تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ سے بلند آواز سے اس طرح بات نہ کر بیٹھنا جیسے کہ آپس میں ایک دوسرے سے کر لیتے ہو۔ میری اور آپ کی کسی بات پر بحث ہو رہی ہے' آپ نے زور سے آواز بلند کی تو میں نے آپ سے بڑھ کر آواز بلند کی۔ یہ ہم آپس میں تو کر سکتے ہیں' لیکن اگر ایسا معاملہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔

اس قرآنی حکم ﴿لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ پر عمل کی ہمارے لیے صورت یہ ہے کہ کسی موضوع پر میں اپنا خیال پیش کر رہا ہوں' آپ اپنا خیال پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنی رائے پر نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث بیان کی' تو اس قرآنی حکم کا تقاضا یہ ہے کہ اب میری زبان بند ہو جانی چاہیے۔ اس کے بعد بھی اگر میں کچھ کہتا ہوں تو یہ رسول اللہ ﷺ کی توہین ہے اور میں اس قرآنی حکم کے خلاف کر رہا ہوں۔ ہاں بعد میں مَیں تحقیق کروں گا کہ یہ حدیث جو بیان کی گئی ہے صحیح ہے یا نہیں' اس کی سند درست ہے یا نہیں' محدثین کے ہاں اس حدیث کا کیا مقام ہے' اسماء الرجال کے ماہرین اس حدیث کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ بعد میں تحقیق تو کروں گا' مگر اُس وقت میری زبان بند ہو جانی چاہیے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے اور اپنی رائے پر ڈٹے رہتے

ہیں تو گویا ہم نے رسول کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کر دیا۔

تیسرا تقاضا: نصرتِ رسولؐ: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ کی مدد کی جائے۔ اب مدد کس کام میں کرنی ہے' یہ بہت اہم بات ہے۔ اس بارے میں نوٹ کر لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی مدد سے اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے کی جدوجہد مراد ہے۔ اللہ کے ساتھ وفاداری کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اُس کے دین کی مدد کی جائے۔ اس اعتبار سے یہاں اللہ اور رسول کے ساتھ خلوص اور اخلاص جڑ گئے ہیں کہ اللہ کے دین کو قائم کرنا میرے ایمان کا تقاضا بھی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی بھی تھا۔ لہٰذا آپؐ کی نصرت اسی کام کے لیے ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی حکومت بنانے کے لیے تو کوئی جدوجہد نہیں کی تھی۔ وہ تو جب آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپ ہی سربراہِ مملکت اور وقت کے خلیفہ تھے' لیکن اس وقت بھی آپؐ کے گھر میں فاقے تھے' اس وقت بھی کئی کئی دن آپؐ کے گھر کے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔ تو آپؐ نے اپنی سلطنت' اپنی حکومت یا اپنی کوئی جائیداد نہیں بنائی۔ اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ بنی نوعِ انسان کے سب سے زیادہ باصلاحیت انسان نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ تھے' لیکن آپؐ نے اپنی ان صلاحیتوں اور توانائیوں سے اپنی ذات کے لیے کبھی کچھ حاصل نہیں کیا۔ تو یہاں نصرتِ رسولؐ وہی اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے ہے اور یہ معرکہ ابھی بھی جاری ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

بلکہ اب ایک مرتبہ پھر یہ بھٹی بہت دہکنے والی ہے۔ ایک بہت بڑی جنگ —— احادیث میں جس کو ''المَلحمَۃ العُظمٰی'' کہا گیا ہے —— ہونے والی ہے جو پچھلی صدی کی دونوں عالمی جنگوں کو مات دے جائے گی۔ ان جنگوں میں بھی کروڑوں انسان قتل ہوئے تھے' اب بھی کروڑوں قتل ہوں گے۔ یہ جنگ زیادہ دور نہیں ہے' اس کے لیے سٹیج تیار ہو رہا ہے۔ بہرحال اب بھی اگر آپ اطمینان سے بیٹھے ہیں اور غلبۂ دین کی جدوجہد

میں حصہ نہیں لے رہے تو گویا آپ نہ اللہ کے دین کی وفاداری کا ثبوت دے رہے ہیں اور نہ رسول اللہ ﷺ کی نصرت کا تقاضا پورا کر رہے ہیں۔

حضورِ اکرم ﷺ نے خبر دی ہے کہ قیامت سے پہلے کل روئے ارضی پر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام قائم ہوگا۔ اب اس جدوجہد میں جو لوگ اپنا حصہ ڈالیں گے وہ کامیاب ہو جائیں گے اور جو اپنے دھندوں میں مگن رہ کر اپنی زندگی گزاریں گے، یا جن کے پیش نظر وہی معاش کی بھاگ دوڑ، وہی صرف اپنے اور اپنے اہل وعیال کی فکر رہے گی، یا جن کے پیش نظر صرف دنیوی مستقبل رہے گا، جبکہ دینی یا اُخروی مستقبل سے انہیں کوئی غرض ہی نہیں ہوگی تو وہ محروم رہ جائیں گے۔ البتہ یہ یاد رکھیے کہ چاہے آپ اس معرکہ میں شامل ہوں یا نہ ہوں، یہ لازماً ہو کر رہے گا۔ اس کی خبر علامہ اقبال بھی ساٹھ سال پہلے دے گئے ہیں: ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

رسول اللہ ﷺ انتہائی غیور انسان تھے!

نصرتِ رسولؐ کے ضمن میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ انتہائی غیور انسان تھے، آپؐ نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔ میری آنکھوں میں ہمیشہ آنسو آ جاتے ہیں جب بھی میں وہ واقعہ بیان کرتا ہوں کہ ہجرت کا حکم تو آ گیا تھا، لیکن حضور ﷺ کو ابھی مکہ چھوڑنے کا حکم (express permission) نہیں ہوا تھا —— اور رسول اُس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا جب تک کہ اللہ کی طرف سے اسے اپنی بستی چھوڑنے کا حکم نہ آ جائے۔ حضرت یونس علیہ السلام سے یہی غلطی ہوئی تھی، چنانچہ ان کی گرفت ہوئی —— اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر دو اونٹنیاں خوب کھلا پلا کر تیار کی ہوئی تھیں تاکہ انہیں راستے میں غذا کی ضرورت پیش نہ آئے، اور اونٹ میں یہ صلاحیت

ہوتی ہے کہ وہ کئی دن بغیر کھائے پیے زندہ رہ سکتا ہے۔ ایک دن اچانک دوپہر کے وقت حضورﷺ اپنا چہرۂ مبارک اپنے عمامہ میں لپیٹے ہوئے تشریف لائے۔ گھر والوں نے دور سے دیکھا تو انہیں حیرانی ہوئی' اس لیے کہ یہ وقت تو ملاقات کا نہیں ہے —— عام طور پر ظہر و عصر کے درمیان کسی کو ملنے جانا اہل عرب کے ہاں آداب کے خلاف ہے' اس لیے کہ یہ قیلولے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت بازار بھی بند ہو جاتے ہیں —— خیر حضور اکرمﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ابوبکر! اجازت آ گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے خوشی سے (اس خیال سے کہ حضورﷺ شاباش دیں گے) عرض کیا: اے اللہ کے رسولﷺ! میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں۔ آپؐ نے ذرا سا توقف فرمایا اور کہا: اچھا ٹھیک ہے' میں ایک استعمال کروں گا لیکن اس کی قیمت ادا کروں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے کہ حضورﷺ میرے ساتھ یہ مغائرت!

حضرت ابوبکر کا مقام تو دیکھیں کہ آپؓ نے اپنا سارا اثاثہ حضورﷺ کے مشن میں لٹا دیا' جو بچا کھچا تھا وہ ساتھ لے گئے اور گھر میں ایک پیسہ تک نہیں چھوڑا' حالانکہ گھر میں پیچھے بیٹیاں تھیں' بیوی تھی' اندھا بوڑھا باپ ابوقحافہ تھا۔ پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپﷺ نے ایک اشارہ کیا تھا کہ عائشہ کی مجھ سے شادی کرا دیں تو صرف ایک جملہ کہا تھا کہ وہ تو آپ کی بھتیجی ہے' یعنی میں آپ کا دینی بھائی ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: دینی اخوت کا معاملہ قانونی اور شرعی اخوت سے علیحدہ ہے۔ آپؓ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضورﷺ کے نکاح میں دے دی' حالانکہ حضرت عائشہ کی عمر اُس وقت چھ سال تھی۔ رخصتی اگرچہ بعد میں نو سال کی عمر میں ہوئی' لیکن چھ سال کی عمر میں نکاح تو ہو گیا —— بہرحال اس ساری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ حضورﷺ بہت غیور تھے اور آپؐ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ سوال اگر تھا تو یہ کہ اللہ نے میرے ذمے بہت بڑا بوجھ ڈالا ہے کہ میں اُس کے دین کو غالب کروں' تو کون ہے اس راستے میں میرا مددگار؟ اس معاملے میں آپ سائل بن کر در در گئے ہیں' عام لوگوں سے بھی ملے ہیں اور قبیلوں کے سرداروں سے بھی جا کر ملے ہیں اور ان سے

درخواست کی ہے کہ میرا ساتھ دو۔تو رسول اللہ ﷺ سے وفاداری کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے دین کی مدد کی جائے۔

چوتھا تقاضا: قرآن کی پیروی : رسول اللہ ﷺ سے وفاداری کا چوتھا تقاضا جو اس آیت میں بیان کیا گیا وہ یہ ہے کہ جو نور یعنی قرآن آپؐ کے ساتھ نازل کیا گیا اس کی پیروی کی جائے۔اس حوالے سے بھی تفصیلی گفتگو ماقبل بیان ہوگئی ہے کہ قرآن کے ساتھ وفاداری کے پانچ حقوق ہیں۔ان حقوق کو بجالانے سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری کا ایک حق بھی ادا ہو جائے گا۔اس اعتبار سے یہاں رسول اور قرآن کے ساتھ وفاداری کے تقاضے جڑ گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وفاداری اور خیر خواہی کے تقاضے کے حوالے سے بھی میرا ایک کتابچہ ''نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں'' موجود ہے۔یہ میری ایک تقریر پر مشتمل ہے جو میں نے اوائل ۱۹۷۳ء میں ناظم آباد کراچی کی ایک جامع مسجد میں ماہِ ربیع الاول کی مناسبت سے کی تھی۔اس کتاب کو معمولی حک و اضافہ کے ساتھ ۱۹۷۴ء میں کراچی ہی سے شائع کر دیا گیا۔میری خواہش یہ تھی کہ اسے ازسرِنو مرتب کر کے ''مسلمانوں پر نبی اکرم ﷺ کے حقوق'' کے عنوان سے شائع کروں' لیکن بوجوہ اس کی نوبت نہ آئی۔اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلقات کی اساسات اور ان کے مضمرات کا صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور ان پر عملاً کاربند ہونے کی توفیق بھی مرحمت فرمائے۔آمین!

ائمۃُ المُسلِمین کے ساتھ نُصح و خیر خواہی کے تقاضے

اللہ' کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے بعد اب باری آتی ہے مسلمانوں کے اُمراء کی خیر خواہی اور وفاداری کی۔اس کے بعد آخر میں عام مسلمانوں کی خیر خواہی کا تذکرہ ہے۔غور طلب بات یہ ہے کہ ائمہ کو پہلے اور عوام کو بعد میں کیوں لایا گیا۔اس لیے کہ ائمہ کی بھلائی سے کروڑوں کا بھلا ہوتا ہے' جبکہ عوام کی بھلائی سے صرف انہی کا بھلا ہوگا۔جیسے کہا جاتا ہے کہ ایک لڑکے کی تعلیم سے ایک مرد ہی سنورتا ہے' جبکہ ایک لڑکی کی تعلیم سے ایک پورا خاندان سنورتا ہے۔اسی طرح کا معاملہ ائمہ اور عوام کا ہے۔اگر کوئی

کہیں پر امام ہے‘ صاحب الامر ہے‘ اس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں تو اس کی ایک غلطی یا کوتاہی سے لاکھوں انسانوں پر اس کے منفی اثرات پڑیں گے اور اس کی ایک بھلائی اور ایک نیکی کی برکات لاکھوں اور کروڑوں انسانوں تک پہنچیں گی۔ لہٰذا ”اَئِمَّةَ الْمُسْلِمِيْنَ“ کو مقدم کیا گیا اور ”عَامَّتِهِمْ“ یعنی عام مسلمانوں کو آخیر میں رکھا گیا۔

ائمہ کی نصح وخیر خواہی کے تقاضوں کو بیان کرنے سے پہلے ایک بات یہ ذہن نشین کر لیں کہ مسلمانوں کے امراء سے مراد کون ہیں؟ ٹھیک ہے مسجد کا امام بھی امام تو ہے‘ لیکن آج ہمارے ہاں اس کی جو پوزیشن ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ بقولِ اقبال ؎

قوم کیا چیز ہے‘ قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام!

بہرحال اصل امام تو وہ ہیں جو ایوانِ حکومت میں بیٹھے ہیں۔ وہ چاہے مرکزی یا صوبائی ارکانِ اسمبلی ہوں یا آپ کے ہاں کی کسی ذیلی حکومت یا بلدیاتی نظام کے منتخب رکن ہوں‘ اصل امام تو وہ ہیں۔ پھر یہ کہ جماعتوں اور تحریکوں کے امراء ہیں‘ اور پھر ہر گھر کا سربراہ (head) بھی اس گھر کا امیر ہے۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) (۱) ”تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی“۔ تو ائمّة المُسلمين سے گھر کا سربراہ‘ جماعتوں اور تحریکوں کے امراء اور اربابِ حکومت درجہ بدرجہ سب مراد ہیں۔

پہلا تقاضا: اطاعت فی المعروف: امراء کی خیر خواہی کا پہلا تقاضا اطاعت فی المعروف ہے‘ یعنی معروف میں ان کی اطاعت کی جائے۔ معروف سے مراد ہر وہ بھلا کام ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو — میں نے آپ کو حلال وحرام کے حوالے سے اسلام کا یہ اصول بتایا تھا کہ جس شے کی حرمت ثابت نہیں وہ حلال ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس کی حلت ثابت نہیں وہ حرام ہے۔ اس طرح حلال اور اس کے ضمن میں معروف کا دائرہ بہت وسیع

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجمعة‘ باب الجمعة فی القری والمدن۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الامارة‘ باب فضیلة الامام العادل وعقوبة الجائر......

ہے۔اب اگر امراء کوئی ایسا حکم دیں جو چاہے قرآن وسنت پر مبنی نہیں ہے لیکن قرآن وسنت کے خلاف بھی نہیں ہے تو ان کی اطاعت کی جائے گی' اس لیے کہ یہ معروف کے ضمن میں ہے۔

دوسرا تقاضا: عدم تنازع: اُمراء کے ساتھ خیر خواہی اور وفاداری کا دوسرا تقاضا ''عدم تنازع'' ہے' یعنی نہ تو ان کے ساتھ جھگڑنا ہے اور نہ کھینچ تان کرنی ہے' بلکہ ان کے ساتھ تعاون کرنا اور ان کی بھلائی چاہنا ہے۔ یہ تقاضا ''عدم تنازع'' آج کے دور میں بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس لیے کہ آج کی دنیا میں جمہوری تماشے کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس میں درحقیقت تنازع پیدا ہوتا ہے کہ تم اقتدار سے ہٹ جاؤ' اب ہم آئیں گے۔ یہ خالص غیر اسلامی کام ہے۔ ہاں ان سے مطالبہ کرو کہ خلافِ اسلام چیزیں ختم کرو' اسلام کے احکام نافذ کرو۔ اس حد تک تو ٹھیک ہے' لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا کہ تم ہٹو ہم اقتدار میں آئیں گے' یہ مغربی جمہوریت کی روح ہے۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ خلفائے راشدین کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر خطبہ دے رہے تھے کہ ایک درویش صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ـــــ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے اہل بیت میں سے قرار دیا: ((سَلمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ)) (۱) ـــــ ایک پھٹی پرانی چادر لیے ہوئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ یعنی نہ سنیں گے اور نہ مانیں گے! حضرت عمرؓ نے یہ نہیں کہا کہ بیٹھ جاؤ! بلکہ کہا: کیا بات ہے سلمان؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا: آپ نے جو کُرتا پہن رکھا ہے یہ اُن یمنی چادروں سے بنا ہے جو مالِ غنیمت میں آئی تھیں اور ہر مسلمان کو جتنا کپڑا اس میں سے ملا ہے اس سے کُرتا نہیں بنتا' جبکہ آپ تو ہم میں سے ویسے بھی طویل القامت انسان ہیں' تو آپ کا کُرتا کیسے بن گیا؟ بھرے مجمع میں حضرت سلمان فارسیؓ کی اتنی سخت بات پر حضرت عمرؓ نہ تو غصے میں آئے اور نہ یہ کہا کہ یہ میرا انفرادی معاملہ ہے' بلکہ بیٹے سے کہا: عبداللہ! تم جواب دو۔ انہوں نے اس معاملے کو justify کیا

(۱) الجامع الصغير للسيوطی' ح:٤٦٩٦ ـ مجمع الزوائد للهيثمی:١٣٣/٦ ـ

کہ مالِ غنیمت میں ملنے والے کپڑے سے نہ میرا کُرتا بن رہا تھا اور نہ ابا جان کا۔ میں نے اپنے حصے کا کپڑا ابا جان کو دے دیا تو ان کا کُرتا بن گیا۔ یہ سنتے ہی حضرت سلمان فارسیؓ نے فوراً کہا: **الآن نَسمع ونُطیع** ''اب ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے''۔ یہ ہے اصل میں اسلامی جمہوریت۔ یہاں وہ رسہ کشی نہیں جو ہماری جمہوریت میں ہوتی ہے کہ جیسے ہی حکومت بنی' اپوزیشن نے حکومت کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ جھوٹے الزامات لگاؤ' جھوٹے پروپیگنڈے کے طوفان کھڑے کردو' جو بھی کرو ان کی ٹانگ تو گھسیٹنی ہی گھسیٹنی ہے۔

اس حوالے سے یہ یاد رکھیں کہ بدقسمتی سے یہ سب ہمارے ہاں ہوتا ہے ورنہ مغرب کی جمہوریت میں بھی ایسا نہیں ہے۔ وہاں ایک اپوزیشن ہوتی ہے جو چیک اینڈ بیلنس رکھتی ہے۔ وہ تنقید بھی کرتی ہے' لیکن وہ تسلیم کرلیتی ہے کہ پانچ سال تک ان کی حکومت رہے گی۔ اس میں جو بھی بہتری (improvemnet) ہو سکے گی وہ ہم کروائیں گے' جہاں کسی غلط رجحان کو رکوا سکے تو رکوائیں گے' لیکن یہ کہ اربابِ حکومت کے خلاف جھوٹ کے طوفان کھڑے کر کے' غلط پروپیگنڈے کر کے اور ان کو ذلیل و رسوا کر کے ان کی حکومت کو کمزور کیا جائے یا ان کی حکومت کا خاتمہ کیا جائے' ایسا نہیں ہوتا۔

تیسرا اور چوتھا تقاضا: صائب مشورہ اور مثبت تنقید: اُمراء کے ساتھ خیر خواہی کا تیسرا تقاضا ان کو صائب مشورہ دینا ہے۔ صحیح مشورہ دینا امراء کی بہترین خیر خواہی ہوتی ہے۔ اسی طرح خیر خواہانہ تنقید اُمراء کے ساتھ وفاداری کا چوتھا تقاضا ہے' لیکن یہ یاد رہے کہ یہ تنقید ان کی بھلائی کے لیے ہو نہ کہ ان کو نیچا دکھانے اور ان پر اپنی فوقیت جمانے کے لیے۔ اسی طرح آپ کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہ ہو کہ اگر میں نے ان کو اچھی بات بتا دی اور یہ اسے کر گزرے تو ان کی حکومت اور مضبوط ہو جائے گی' لہٰذا انہیں بھٹکنے دو۔ یہ جتنا بھٹکیں گے اتنا ہی ہمیں ان کو بدنام کرنے کا موقع ملے گا۔ اس کے برعکس مثبت اور تعمیری تنقید ہونی چاہیے۔ اس کا اندازہ اس شخص کو ہو جاتا ہے جس پر تنقید کی جا رہی ہے۔ اس کا دل گواہی دے گا کہ یہ شخص کس نیت سے تنقید کر رہا ہے ؏ ''دل را بہ دل

راہیست''یعنی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ چاہے زبان سے وہ بات نہیں نکلی ہے لیکن میرے دل میں وہ بات آ گئی ہے جو آپ کے دل میں ہے — آج تو دنیا میں حواسِ خمسہ یعنی دیکھنا' سننا' سونگھنا چکھنا اور چھونا کے علاوہ extra censory perceptions کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

پانچواں تقاضا: ظالم و فاسق حکمران سے نجات: اُمراء کی خیر خواہی کے حوالے سے پانچواں تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ شریعت کے خلاف حکم دے رہے ہوں' یا شریعت کے خلاف حکم تو نہیں دے رہے' لیکن ان کے طرزِ عمل میں ظلم ہے' استبداد ہے' اور اپنی ذات میں فسق و فجور ہے تو ان کو تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد کرنا ان کے ساتھ بھی خیر خواہی ہے اور عوام کے ساتھ بھی۔ ظاہر بات ہے کہ امراء کے فسق و فجور کے اثرات عوام تک پہنچیں گے' اس لیے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے انداز کو اختیار کرتے ہیں— اس حوالے سے ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے: ((اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ)) [1] کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہی ہے کہ لوگ اپنے لیڈروں کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور کسی ایک لیڈر کا فسق و فجور کروڑوں کے لیے فسق و فجور کی دلیل بن جاتا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر داڑھی منڈاتے ہیں۔ چنانچہ آج داڑھی منڈانے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ محمد علی جناح اور علامہ اقبال کی تو داڑھی نہیں تھی۔ واضح رہے کہ یہ ہمارے لیے کوئی دلیل نہیں ہے' محمد علی جناح اور علامہ اقبال کا کوئی فعل ہمارے لیے قابل تقلید نہیں ہے۔ ہمارے لیے تو بس ایک ہی ذات میں ابدی اُسوہ ہے اور وہ ذات ہے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی۔ البتہ محمد علی جناح نے قوم کی بھلائی اور علامہ اقبال نے قوم کی نظری وفکری راہنمائی کے لیے جو کچھ کیا اس کی قدر دانی کیجیے۔ ایسا رویہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک آدمی سے محبت ہے تو اس کی ہر بری چیز سے غضِ بصر کرنا اور ایک سے نفرت ہے تو اس کی ہر اچھی بات کو بھی نظر انداز کر دینا۔ اس معاملہ میں عدل کا تقاضا اختیار کرنا چاہیے۔

---

(۱) الاسرار المرفوعة لملا علی قاری' ح ۳۵۲۔ قیل: لا اصل له او باصله موضوع۔

ظالم حکمرانوں سے نجات کا طریقہ

ظالم یا فاسق و فاجر حکمرانوں سے نجات کا طریقہ کیا ہوگا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ پچھلے زمانے میں تو اس کے لیے سوائے مسلح بغاوت کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن مسلح بغاوت میں بہر حال فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ موجود ہے۔ اس لیے کہ وہ حاکم ظالم یا فاسق و فاجر ہونے کے باوجود آخر کلمہ گو تو ہے۔ وہ اپنے محل کی چار دیواری میں اگرچہ رنگ رلیاں مناتا ہے' لیکن اس کا حکم تو بہر حال وہ نہیں دے رہا ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان حاکم کے خلاف مسلح بغاوت میں یہ اندیشہ بہر حال موجود ہے کہ مسلمانوں کے اندر فتنہ پیدا ہو جائے یا وسیع پیمانے پر خون خرابہ ہو جائے۔ لہٰذا اس معاملے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اول تو اگر کسی کو ان حکمرانوں تک رسائی حاصل ہو جائے تو انہیں زبان سے سمجھاؤ' ان کے غلط رویے پر تنقید کرو۔ مگر ان حکمرانوں اور بادشاہوں تک رسائی حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ خطوط پر خطوط لکھے جائیے' ان تک پہنچیں گے ہی نہیں' ان کا نچلا سٹاف ہی اٹھا کے ردی میں پھینک دے گا۔ کوئی بہت کرم کریں گے تو آپ کو acknowledgment دے دیں گے۔ میں نے ۱۹۸۲ء میں جنرل ضیاء الحق کو ایک بڑا طویل خط لکھا تھا۔ یہ خط میں نے acknowledgement due کے ساتھ بھیجا تھا' لیکن جب اس کی رسید واپس آئی تو اس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ بہر حال اگر کسی کو ان تک رسائی حاصل ہو جائے تو وہ ان کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ دورِ ملوکیت میں تو کسی بادشاہ کے سامنے اس پر تنقید کرنا جان جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ آپ نے خلیفہ ہارون الرشید کے قصے تو سنیں ہوں گے کہ فلاں صاحب نے ان کو نصیحت کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹھیک ہے ایسا ہوتا تھا۔ آخر ہر انسان کے اندر خلوص و اخلاص کے ساتھ نصیحت کرنے والوں کی قدر ہوتی ہے' لیکن اگر کسی وقت مزاجِ شاہانہ کا رنگ کوئی اور ہے تو وہی ہارون الرشید اسی وقت جلاد کو حکم دے گا اور وہ ناصح کی گردن اڑا دے گا۔ لہٰذا اکثر واقعات میں آتا ہے کہ جب کسی بزرگ نے بادشاہ کو نصیحت و خیر خواہی کے لیے تنقید شروع کی تو پہلے اچھی طرح اپنے کپڑے سمیٹ لیے تا کہ ایسا نہ ہو کہ میری گردن فوراً

اڑا دی جائے اور میرا سر کھل جائے۔ اس لیے کہ پھر وہاں دیر نہیں لگتی تھی۔ وہاں یہ نہیں تھا کہ عدالتوں میں جاؤ اور پہلے جرم ثابت کرو۔ وہ تو بادشاہت ہے ؏ ''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن نہ دارد!'' کسی کی کوئی بات بری لگی تو فوراً گردن اڑا دی یا عمر بھر کے لیے قید خانے میں ڈال دیا اور اس حبسِ بے جا کے خلاف کسی عدالت میں اپیل دائر نہیں کی جاسکتی تھی۔ مگر بہر حال ایسے بادشاہ بھی تھے جو بھلی بات سنتے تھے اور بھلی بات کہنے والوں کی قدر بھی کرتے تھے' لیکن یہ سب کچھ ان کے مزاج پر منحصر تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج دنیا کے جدید نظام میں خوش قسمتی سے ایک اچھائی کا پہلو بھی ہے ــــ میں نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ دنیا میں شرِ محض کا وجود ہی نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے شر میں بھی کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو موجود ہوتا ہے' ورنہ شر اپنے پاؤں پر کھڑا ہی نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آکاس بیل درخت کے اوپر تو چڑھ جاتی ہے' لیکن اس کے خود سے اوپر چڑھنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اسی طرح حق اور خیر کا کوئی ایک شمہ لے کر ہی باطل اس کے اوپر اپنی دکان سجا سکتا ہے۔ تو آج کی دنیا کے جدید نظام میں خوبیاں بھی بہر حال موجود ہیں اور ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کو آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق (right of self expression) حاصل ہے۔ اسی طرح انتخاب کے ذریعے کسی شخص کا پارلیمنٹ سے جانا اور کسی کا آنا (transfer of power) سیاسی نظام کے اعتبار سے واقعتاً بہت بڑی کامیابی (acheivement) ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا میں اس جدید عمرانی دور میں بہت ترقی ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں' چاہے لولی لنگڑی اور ٹوٹی پھوٹی جمہوریت ہے' لیکن ہمیں اپنی بات کہنے کا حق تو حاصل ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میری بات کو اخبارات اہمیت نہیں دیں گے اور کسی سیاسی لیڈر کی چھوٹی سی بات کو شائع کر دیں گے۔ یہ تو ان اخبارات کا اپنا معاملہ ہے ورنہ حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ تو یہ آزادیٔ رائے اور تنظیم سازی کی آزادی عہدِ حاضر کی دو عمدہ چیزوں میں سے ہے۔ ان کے تحت آپ پُرامن طریقے سے لوگوں کو ظالم اور فاسق وفاجر بادشاہوں اور حکمرانوں سے نجات دلا سکتے

ہیں۔ یہ آزادی ہمارے ملک میں تو حاصل ہے‘ لیکن سعودی عرب میں یہ آزادی نہیں ہے۔ وہاں تو آپ کوئی جماعت بنا ہی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ انڈونیشیا‘ ملائشیا اور بنگلہ دیش میں بھی یہ آزادی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے یہ آزادی ترکی میں بھی ہے۔ اگرچہ وہ ایک سیکولر ملک ہے لیکن ان کے ہاں بھی آزادی کا یہ پہلو بہرحال موجود ہے۔

یاد رہے کہ عوام کو ان حکمرانوں کے ظلم واستبداد سے نجات دلانے اور معاشرے کو ان کے فسق وفجور کے اثرات سے بچانے کی جدوجہد اس لیے نہ ہو کہ آپ کے دل میں کھوٹ ہو اور آپ خود اقتدار میں آنا چاہتے ہوں۔ یہاں سارا دارومدار نیتوں پر ہوگا‘ جیسے ہم نے اربعین کی پہلی حدیث میں پڑھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''— یہ نہیں کہ تم ہٹو میں حکومت چلاؤں گا۔ نہیں! بلکہ ہمیں تو اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی درکار ہے‘ ہمیں تو شریعتِ الٰہی کا نفاذ چاہیے‘ حکومت ہرگز ہمارا مقصودِ نظر نہیں ہے‘ جیسے کہ مختلف جماعتوں کے لوگ ایک دوسرے کے لیے کہتے بھی ہیں کہ فلاں کو اسلام نہیں‘ اسلام آباد چاہیے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کل کی ہماری سیاست کا اصل معاملہ یہی پاور پالیٹکس ہے۔

اُمراء کے ساتھ خیرخواہی کے تقاضوں کا خلاصہ

آخر میں ایک بار پھر امراء کے ساتھ خیرخواہی کے تقاضوں کا خلاصہ نوٹ کرلیں:
(۱) اطاعت فی المعروف‘ (۲) عدم تنازع— یہ نہیں کہ ہم تم سے اقتدار چھین لیں گے۔ یہ تنازع کا لفظ درحقیقت عربی میں چھینا جھپٹی کے لیے ہی آتا ہے اور نزع کہتے ہیں کھینچنے کو۔ تنازع یہ ہے کہ ایک طرف سے وہ کھینچ رہا ہے اور ایک طرف سے تم کھینچ رہے ہو۔ رسہ کشی (tug of war) تنازع کی بہترین تعبیر ہے کہ اِدھر سے ایک ٹیم کھینچ رہی ہے‘ اُدھر سے دوسری ٹیم کھینچ رہی ہے‘ اب جو ٹیم کھینچ کرلے جائے گی وہ جیت جائے گی۔ (۳) خیرخواہی کے تحت صحیح مشورہ دینا‘ (۴) مثبت‘ تعمیری‘ اور خیرخواہانہ تنقید‘ اور (۵) جس میں ائمہ اور عوام کے حقوق دونوں شامل ہوجاتے ہیں کہ حکمران اور ائمہ اگر ظالم‘ غاصب یا فاسق وفاجر ہوں تو ان کو بدلنے کی کوشش اور جدوجہد کرنا— ظاہر بات ہے کہ

اگر کسی کے پاس دولت ہے‘ لیکن اخلاق و کردار نہیں ہے تو وہ دولت کے ذریعے عیاشیاں اور بدمعاشیاں کرے گا تو یہ دولت نعمت نہیں رہے گی بلکہ اس کے حق میں زحمت بن جائے گی۔ اسی طرح غلط شخص کے لیے اقتدار بھی زحمت ہے جو اس کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ہے۔ اس سے اس کو چھٹکارا دلانا گویا اس کے ساتھ خیر خواہی کرنا ہے۔☆

عوام کے ساتھ نُصح و خیر خواہی کے تقاضے

اب آیئے عوام کے ساتھ نصح و خیر خواہی کے تقاضوں کی طرف۔ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کچھ حقوق مقرر کر دیے گئے ہیں جو ہر حال میں ادا کرنے ہیں۔ حضرت علیؓ سے مروی حدیث(۱) میں چھ حقوق بیان کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ سِتٌّ)) ’’ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ (خاص) حق ہیں‘‘۔

پہلا حق: سلام کرنا: ((اِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ)) ’’جب تمہاری اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرو‘‘۔ پھر سلام میں بھی سبقت کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگرچہ سلام کے حوالے سے کچھ آداب سکھائے گئے ہیں کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں‘ آنے والا پہلے

☆ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ظالم کو اُس کے ظلم سے روکنا گویا اُس کی مدد کرنا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا)) فَقَالَ رَجُلٌ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَنْصُرُهُ اِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا اَفَرَاَيْتَ اِذَا كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ اَنْصُرُهُ؟ قَالَ: ((تَحْجُزُهُ اَوْ تَمْنَعُهُ مِنَ الظُّلْمِ فَاِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ)) (صحیح البخاری‘ کتاب الاکراہ‘ باب یمین الرجل لصاحبہ انہ اخوہ ......)

’’اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم!‘‘ ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آتا ہے‘ لیکن میں ظالم کی کس طرح مدد کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ’’ظالم کو اس کے ظلم سے روکنا گویا اس کی مدد کرنا ہے۔‘‘ (اضافہ از مرتب)

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب السلام‘ باب من حق المسلم للمسلم رد السلام۔

سے محفل میں موجود کو سلام کرے' سوار پیدل کو سلام کرے' لیکن بہر حال جتنی سبقت کی جائے اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔

دوسرا حق: دعوت قبول کرنا: ((وَإِذَا دَعَاكَ فَأَجِبْهُ)) ''جب وہ تمہیں مدعو کرے تو اُس کی دعوت قبول کرو (بشرطیکہ کوئی شرعی عذر مانع نہ ہو)''۔ اگر کوئی عذر یا کوئی مجبوری ہے تو آپ معذرت کر لیں' لیکن یاد رکھیں کہ دعوت قبول کرنا ایک حق ہے۔ ٹھیک ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ غریب ہے' زیادہ مرغن غذائیں نہیں کھلا سکتا' کوئی دال روٹی ہی پیش کرے گا پھر بھی آپ جایئے۔

مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میری اہلیہ کے ایک چچا بہت درویش منش انسان تھے۔ ویسے وہ نہ تو مولوی تھے اور نہ صوفی' لیکن حد درجہ درویش مزاج کے آدمی تھے۔ وہ کسی محکمہ میں ایک اچھی پوسٹ پر تھے۔ انہوں نے ایک دن اپنے چپڑاسی سے کہا کہ آج روزہ میرے ساتھ افطار کرنا۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ آج میں ان کے ہاں افطار کروں گا وہاں خوب کھانے کو ملے گا۔ جب وہ چپڑاسی ان کے گھر پہنچا تو دیکھا کہ نہ کوئی دستر خوان بچھا ہے اور نہ ہی کوئی کھانا چنا گیا ہے۔ جب اذان ہوئی تو انہوں نے ایک کھجور اپنی جیب میں سے نکالی' آدھی خود کھائی اور آدھی اس چپڑاسی کو دے دی — دیکھئے ایک حدیث میں باقاعدہ طور پر کھجور کے ٹکڑے پر افطار کرانے کا ذکر ہے اور اس کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح جہاں پانی نہایت کمیاب ہوتا ہے وہاں کسی کو روزہ افطار کرنے کے لیے پانی ہی مہیا کر دیا جائے تو یہ بڑی فضیلت کی بات ہے۔ البتہ ایسا نہ ہو کہ آپ خود تو شربت روح افزا سے روزہ افطار کرتے ہوں' جبکہ کسی کو سادہ پانی سے روزہ افطار کروائیں۔

تیسرا حق: مخلصانہ مشورہ: ((وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانْصَحْ لَهُ)) ''جب وہ تم سے نصیحت (یا مخلصانہ مشورہ) کا طالب ہو تو اسے اچھا مشورہ دو''۔ دیکھئے صحیح مشورہ دینا امراء کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے اور عوام کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا بھی۔

چوتھا حق: چھینک آنے پر دعا دینا: ((وَإِذَا عَطَسَ فَحَمِدَ اللّٰهَ فَشَمِّتْهُ)) ''جب اس کو چھینک آئے اور وہ الحمدُ لِلّٰه کہے تو تم (یَرْحَمُكَ اللّٰهُ کے ساتھ) اسے جواب

دو‘‘۔ چھینک آنے پر اس کے لیے دعا کرنا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے یہ اس کا حق ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ناک کے اندر کوئی irritation ہوتی ہے تو چھینک آتی اور یہ زکام کا آغاز بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ آپ اسے کہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے۔ اس پر مزید یہ بھی آتا ہے کہ پھر وہ شخص کہے: ((يَهْدِيكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ)) ’’اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہارے کام سنوارے۔‘‘

پانچواں اور چھٹا حق: عیادت کرنا اور جنازے میں جانا: ((وَاِذَا مَرِضَ فَعُدْهُ)) ’’جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو‘‘۔ چھٹا حق یہ ہے کہ: ((وَاِذَا مَاتَ فَاتَّبِعْهُ)) ’’اور جب وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ۔‘‘

سنن الترمذی[1] کی ایک روایت میں ساتواں حق یہ بھی بیان ہوا ہے: ((وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) ’’اور اس کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے‘‘۔ اس آخری بات کو یوں سمجھئے کہ ’’ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں‘‘ کے مصداق بہت جامع بات ہے۔ یہ بھی درحقیقت جوامع الکلم میں سے ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور مثبت تنقید: ان حقوق کے علاوہ عوام کے ساتھ خیر خواہی کے اور بھی تقاضے ہیں‘ مثلاً امر بالمعروف و نہی عن المنکر عوام کا بھی حق ہے‘ یعنی انہیں بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ اس طرح ان پر مثبت تنقید کرنا بھی ان کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ سیاسی آدمی کو تو چونکہ ووٹ چاہیے اس لیے وہ عوام پر تنقید نہیں کرسکتا۔ وہ تو کہے گا کہ ساری خرابی کی جڑ اوپر بیٹھا ہوا حکمران طبقہ ہے۔ گویا باقی سب پاک صاف ہیں اور عوام کے اندر تو کوئی خرابی ہے ہی نہیں۔ عوام کے سامنے کھڑے ہو کر ان پر تنقید کرنا بڑی ہمت کی بات ہوتی ہے۔ لیکن وہاں بھی وہی اصول رہے گا کہ یہ تنقید خیر خواہی کے جذبے کے تحت ہو نہ کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے۔

نہی عن المنکر کے حوالے سے یاد رکھیں کہ اگر کوئی آپ کے مسلسل منع کرنے کے باوجود برائی سے باز نہیں آتا تو آپ اس کے ساتھ عدم اختلاط کریں‘ یعنی اس کے ساتھ

---

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الادب‘ باب ماجاء فی تشمیت العاطس۔

اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا سب ترک کر دیں۔ اس لیے کہ اگر آپ ان معاملات میں شریک رہیں گے تو پھر آپ کی ساری محنت ضائع ہو جائے گی ـــــ ایک حدیث میں بنی اسرائیل کی خرابیوں کے تذکرہ میں اُن کی ایک بڑی خرابی یوں بیان کی گئی ہے کہ ان کے علماء ان کی برائیوں پر تنقید تو کرتے تھے' لیکن اُن کے ساتھ کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا بھی چلتا رہتا تھا ـــــ دعائے قنوت میں بھی ہم یہ اقرار کرتے ہیں: وَنَخۡلَعُ وَنَتۡرُكُ مَنۡ يَّفۡجُرُكَ ''اور ہم ان سے علیحدہ ہوتے ہیں اوران سے ترکِ تعلق کرتے ہیں جو تیرے احکام کی دھجیاں بکھیرتے ہیں۔''

طاغوتی نظام سے نجات دلانا: عوام کی خیر خواہی کے حوالے سے آخری بات وہی ہے جو میں قبل ازیں بیان کر چکا ہوں کہ عوام کو اس طاغوتی نظام اور معاشی بوجھوں سے نجات دلائی جائے۔ اس وقت دنیا میں جو غلط معاشی نظام قائم ہیں' جن کی وجہ سے عوام چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہے ہیں' اس نظام کو بدلو تا کہ تقسیم دولت کا منصفانہ نظام قائم ہو۔ یہ کیا ہے کہ امیر' امیر سے امیر تر اور غریب' غریب سے غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرنا اور انہیں مستبد اور ظالم حکمرانوں سے نجات دلانا عوام کا حق ہے۔ یہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ دو طرفہ حق ہے' ائمہ کا بھی اور عوام کا بھی۔

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ((اَلدِّيۡنُ النَّصِيۡحَة)) کے تمام پہلوؤں پر مکمل طور پر پورا اترنے اور ماقبل بیان کردہ پانچ اعتبارات سے مکمل طور پر مخلص و وفادار ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اَقُولُ قَوۡلِیۡ هٰذَا وَاسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ لِیۡ وَلَكُمۡ وَلِسَائِرِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمَاتِ○○

حدیث 8

نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو حکمِ قتال اور قتال کی تین صورتیں

۹/اور ۱۶/ نومبر ۲۰۰۷ء کے خطاباتِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبۃ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ (التوبۃ)

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ (العنکبوت)

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ :

((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْھَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ، وَیُؤْتُوا الزَّکَاةَ ، فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا

مِنِّیْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلاَّ بِحَقِّ الْاِسْلَامِ ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)) (۱)

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کرتا رہوں تا آنکہ وہ گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ یہ کام کرلیں تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کرلیں گے سوائے کسی اسلامی حق کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگا۔''

معزز سامعین کرام!

آج اربعین نووی کی آٹھویں حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے اور یہ مضمون اس حدیث میں بھی آ چکا ہے جو اگرچہ اربعین نووی کا حصہ نہیں ہے لیکن ہم نے اس کتاب کے آخر میں اس کو شامل کیا ہے— وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی بڑی طویل روایت ہے جس کا مطالعہ ہم اس سلسلہ ہائے خطابات کے تین مسلسل خطابات میں ''حکمت دین کا ایک عظیم خزانہ'' کے عنوان سے کر چکے ہیں۔ ☆

حدیث کی تشریح

زیر مطالعہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ)) ''مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ جاری رکھوں'' ((حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ)) ''یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور (گواہی دیں کہ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں'' ((وَیُقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوا الزَّکَاةَ)) ''اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں'' ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلاَّ بِحَقِّ الْاِسْلَامِ)) ''تو جب وہ یہ کام کرلیں تو وہ محفوظ کرلیں گے مجھ سے اپنی جانیں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الامر بقتالِ النّاس حتّٰی یقولوا لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رسولُ اللّٰه۔

بھی اور اپنے مال بھی‘ مگر یہ کہ اسلام کے کسی حق کے ضمن میں‘‘ —— یعنی شہادتین‘ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے ایک مسلمان کو امان مل جائے گی‘ لیکن اگر شریعت کے کسی حکم کے ضمن میں اس حق پر کوئی آنچ آ جائے یا کوئی شرعی حد قائم ہو رہی ہو تو وہ ضرور نافذ ہو گی‘ مثلاً چوری کریں گے تو ہاتھ کٹے گا‘ اسی طرح شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے گا تو اس کو رجم کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑے لگائے جائیں گے وغیرہ۔ اسلام کا یہ حق ہر مسلمان پر ہے اور اس پر عائد رہے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان تین چیزوں کی وجہ سے آپ کو امان کی ضمانت دے دی گئی ہے تو بس آپ جو چاہے کریں۔

آگے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ)) ’’اور باقی رہ گیا حساب تو وہ اللہ کے ذمے ہے‘‘۔ یعنی وہ دل سے ایمان لائے ہیں یا صرف زبان سے اقرار کر رہے ہیں اور ان کے دل ابھی بھی کافر ہیں تو اس معاملے میں میرا کوئی ذمہ نہیں ہے اور نہ اس معاملے میں مجھ سے کوئی محاسبہ کیا جائے گا۔ اس کا حساب اللہ لے لے گا کہ کون صرف جان بچانے کے لیے جھوٹ موٹ کا ایمان لایا ہے اور کون واقعی دل سے ایمان لایا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کا آخری حصہ بھی دہرا لیجیے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یہ بڑی طویل اور بہت عمدہ حدیث تھی کہ انسان کچھ دیر کے لیے اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے کہ وہ اسی ماحول کا ایک جزو ہے۔ اس حدیث کے اخیر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ((وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ)) ’’اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں‘‘ ((حَتّٰى يُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ)) ’’یہاں تک کہ وہ (۱) نماز قائم کریں‘ (۲) زکوٰۃ ادا کریں‘‘ ((وَيَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)) ’’اور (۳) وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں‘ وہ تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے‘ اور (گواہی دیں کہ) محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں‘‘۔ ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا)) ’’پھر جب وہ یہ (تینوں) کام کر گزریں گے تو وہ محفوظ ہو جائیں گے اور وہ بچا لیں گے اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی سوائے اس کے کہ ان پر کوئی حق آتا ہو‘‘۔

((وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ)) ''اور ان کا حساب اللہ عزوجل کے ذمے ہے۔''

آپ نے دیکھا ان دونوں احادیث میں ترتیب اور الفاظ کا تھوڑا سا فرق ہے۔ اس حوالے سے میں نے ان سلسلہ ہائے خطابات کے ابتدا میں بیان کیا تھا کہ احادیث کے معاملہ میں کسی لفظی فرق کا واقع ہونا یا الفاظ کی ترتیب کا آگے پیچھے ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مذکورہ احادیث میں بھی بات ایک ہی ہے بس الفاظ آگے پیچھے ہیں۔ زیر مطالعہ حدیث میں پہلے کلمہ شہادت کا ذکر ہے اور بعد میں نماز اور زکوٰۃ کا' جبکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں پہلے نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ہے اور بعد میں کلمہ شہادت کا۔ پھر کلمہ شہادت کے الفاظ بھی بعینہٖ وہ نہیں ہیں بلکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی کے ساتھ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی کے ساتھ عَبْدُهٗ کی گواہی بھی شامل ہے۔ اسی طرح زیر مطالعہ حدیث میں ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّىْ دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ)) کے الفاظ ہیں' جبکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَ هُمْ وَاَمْوَالَهُمْ)) کے الفاظ آئے ہیں۔ مزید برآں زیر مطالعہ حدیث کے آخر میں اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ ہے' جبکہ وہاں اِلَّا بِحَقِّهَا کے الفاظ آئے ہیں۔

سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کا شانِ نزول

ان دونوں احادیث کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ اگر صرف انہی پر نگاہ جما دی جائے اور ان احادیث کا پس منظر اور بقیہ احادیث سامنے نہ ہوں تو بہت بڑی گمراہی پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ ان احادیث کے متن سے تو صاف یہ مطلب نکلتا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعے بالجبر پھیلا ہے' حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے' بلکہ ان احادیث کا ایک خاص پس منظر ہے۔ اس ضمن میں اصولی طور پر جان لیجیے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ اگر ان کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو تو انسان ایک مغالطے میں پڑ سکتا ہے۔ اسی تاریخی پس منظر کو اصولِ تفسیر کی اصطلاح میں ''شانِ نزول'' کہتے ہیں کہ کس معاملے میں' کس وقت' کب اور کن حالات کے اندر یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

بعینہٖ یہی معاملہ احادیث کا بھی ہے۔ اگر یہ پیش نظر نہ رہے کہ حضور اکرم ﷺ کا یہ قول کس دور کا تھا اور کن حالات میں یہ بات کہی گئی تھی تو جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ پھر بہت بڑی گمراہی پیدا ہو جائے گی۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب حضرت معاذ بن جبلؓ کی طویل حدیث ہمارے زیر مطالعہ تھی تو اس وقت ہم نے دوسری احادیث کے حوالے سے ایک بات کو سمجھا تھا کہ درحقیقت قتال فی سبیل اللہ کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس اہم بات کو سمجھانے کے لیے میں نے سورۃ التوبہ کی آیات کے حوالے سے تفصیل سے بات کی تھی۔ آج بھی میں نے آغاز میں سورۃ التوبہ کی دو آیات تلاوت کی ہیں۔ ان آیات کا پس منظر اور شانِ نزول جاننا بہت اہم ہے۔

سورۃ التوبہ کی ابتدائی چھ آیات ۹ ہجری میں اُس وقت نازل ہوئیں جب حج کے لیے قافلہ مدینہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ حضور اکرم ﷺ خود تشریف نہیں لے گئے تھے بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج کا قافلہ بھیجا تھا۔ وہ قافلہ کافی سفر طے کر چکا تھا جب یہ آیات نازل ہوئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان آیات میں موجود مشرکین مکہ سے متعلق قتل عام کے خصوصی حکم کو دیکھتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قافلہ کے پیچھے روانہ کیا اور حکم دیا کہ میرے نمائندے کی حیثیت سے حج کے اجتماع میں ان آیات کا اعلانِ عام کر دو۔ اب ظاہر بات ہے جو قافلہ جا رہا تھا اس کی رفتار سست تھی جبکہ حضرت علیؓ تنہا جا رہے تھے اور تیز رفتار سواری پر تھے تو راستے ہی میں قافلے سے جا کر ملے—— بڑی عجیب بات ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے پہلا سوال یہ کیا: اَمِيْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ؟ کیا حضور ﷺ نے میرے بجائے آپ کو امیر الحج بنا کر بھیج دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو آپ اِدھر آیئے‘ امارت سنبھالیے اور میں اُدھر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے اور آپ میرے مامور ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: مَاْمُوْرٌ! میں امیر نہیں مامور ہوں‘ البتہ یہ جو چھ آیات نازل ہوئی ہیں ان کو پڑھ کر سنانے کا کام حضور ﷺ نے میرے ذمے لگایا ہے—— حضرت علیؓ کو یہ ذمہ داری سونپنے کی ایک خاص وجہ ہے کہ جس قدر اہم بات ان آیات میں کہی گئی ہے وہ جب تک حضور اکرم ﷺ بنفس نفیس یا آپؐ کا کوئی قریبی عزیز

اس کا اعلان نہ کرتا عام قبائلی زندگی کی رو سے وہ بات مستند نہ سمجھی جاتی۔ وہ اہم بات یہ تھی کہ آج کے بعد سے مشرکین کے ساتھ سارے معاہدات ختم ہیں' سوائے ان کے جن کا معاہدہ خاص مدت تک ہو اور انہوں نے اس ضمن میں کوئی خلاف ورزی بھی نہ کی ہو' تو ایسے معاہدوں کی مدت پوری کر دی جائے گی۔ لیکن نہ تو آج کے بعد مشرکین کے ساتھ کوئی نیا معاہدہ ہوگا اور نہ کسی معاہدہ کی تجدید ہوگی۔

سورۃ التوبہ کی پہلی آیت میں فرمایا: ﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ①﴾ ''اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا (اعلانِ) بیزاری ہے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب کوئی عہد و پیمان نہیں' کوئی امن و امان کی ضمانت نہیں' بس اب مشرکین کے لیے ایک ہی صورت ہے کہ اگر اسلام لے آئیں تو جان بخشی ہوگی۔ اس کے لیے چار مہینے ﴿اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ﴾ کی مہلت ہے۔ اور اگر ان چار ماہ میں ایمان نہیں لاتے تو مسلمانوں کو حکم دے دیا گیا: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ﴾ ''پس قتل عام کرو ان مشرکین کا جہاں بھی پاؤ' اور پکڑو ان کو' اور گھیراؤ کرو ان کا' اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ میں گھات لگا کر بیٹھو''۔ آگے استثنائی صورت بیان کر دی: ﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ⑤﴾ ''پس اگر وہ توبہ کر لیں (یعنی شرک سے تائب ہو کر کلمہ شہادت کی گواہی دیں) اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے۔''

نبی اور رسول میں فرق

سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں جو حکم دیا گیا ہے' اس کے پیچھے ایک پورا فلسفہ ہے' جس کے بارے میں جاننے کے لیے نبی اور رسول کے مابین مناسبت کو سمجھ لیجیے۔ نبی اور رسول قرآن کی دو اصطلاحات ہیں اور یہ ان تین اصطلاحات کے جوڑوں میں سے ہیں جو مترادف بھی شمار ہوتے ہیں اور مختلف بھی: (۱) مؤمن اور مسلم' (۲) جہاد اور قتال' (۳) نبی اور رسول۔ ان کے بارے میں علماء کے نزدیک دو اصول متفق علیہ ہیں۔ پہلا

اصول یہ ہے :اذا اجتمعا تفرقا واذا تفرقا اجتمعا یعنی ان جوڑوں کے دونوں فرد اگر اکٹھے آ جائیں یا قریب قریب ہوں تو ان کے معنی مختلف ہوں گے اور اگر ان کا ذکر دور دور ہو رہا ہے تو یہ مترادف شمار ہوں گے۔ دوسرا متفقہ اصول یہ ہے کہ ان میں سے ایک عام ہے اور ایک خاص۔ مؤمن خاص ہے اور مسلم عام‘ یعنی ہر مؤمن تو لازماً مسلم بھی ہے لیکن ہر مسلم مؤمن نہیں ہوسکتا — حدیث جبریل کی روشنی میں ایمان کی بحث کے ضمن میں ہم یہ بات تفصیل سے پڑھ چکے ہیں — اسی طرح قتال خاص ہے اور جہاد عام‘ یعنی قتال تو لازماً جہاد ہے لیکن جہاد لازماً قتال نہیں ہے۔ اسی طرح رسول خاص ہے اور نبی عام‘ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوسکتا۔

اس حوالے سے یہ بھی نوٹ کرلیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعداد بہت زیادہ ہے جبکہ رسولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ایک حدیث کی رو سے انبیاء کرامؑ سوا لاکھ کے قریب آئے ہیں جبکہ رسول صرف ۳۱۳ آئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ روایت کے اعتبار سے اس حدیث کا درجہ کیا ہے‘ لیکن بہرحال مشہور یہی ہے کہ نبی سوا لاکھ آئے اور یہ عدد ملتا ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعداد سے جو خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضورﷺ کے سامنے بیٹھے تھے‘ جبکہ رسول ۳۱۳ تھے اور یہ عدد ہے اصحابِ بدر کا۔ واللہ اعلم!

نبی اور رسول میں فرق کیا ہے‘ اس میں مختلف لوگوں نے اپنے فہم‘ اپنے فکر اور اپنی سوچ کے مطابق رائے قائم کی ہے۔ بعض نے کہا کہ جو نبی کتاب لے کر آتا ہے وہ رسول ہے۔ یہ رائے صحیح نہیں ہے‘ اس لیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور دی گئی لیکن وہ رسول نہیں‘ نبی تھے۔ بعض نے کہا کہ جو نبی نئی شریعت لے کر آئے وہ رسول ہوتا ہے۔ یہ بھی غلط ہے‘ اس لیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کوئی نئی شریعت لے کر تو نہیں آئے لیکن وہ رسول ہیں۔ الغرض کوئی تعریف (definition) پوری نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت اور رسالت میں فرق کچھ اور ہے۔

نبوت مرتبہ اور رسالت عہدہ ہے: نبوت و رسالت میں فرق کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جس بات کی طرف میری ہدایت اور رہنمائی کی ہے وہ یہ ہے کہ نبوت ایک

خاص مرتبہ‘ جبکہ رسالت ایک منصب ہے‘ یعنی جب کسی نبی کو کسی خاص جگہ پر تعین کر کے بھیج دیا جاتا تھا تو وہ رسول ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے ہاں سول سروس کے کیڈرز (cadres) ہیں‘ وفاقی سطح پر CSP اور صوبائی سطح پر PCS آفیسرز ہوتے ہیں۔ جو CSP افسر ہے وہ ساری عمر CSP رہے گا‘ اس لیے کہ یہ اس کا مرتبہ ہے‘ البتہ اس کے منصب بدل سکتے ہیں۔ منصب کی حیثیت سے کبھی یہ ڈپٹی کمشنر‘ کبھی کمشنر اور کبھی سیکرٹری ہوگا۔ اسی طرح ایک PCS افسر کبھی تحصیل دار‘ کبھی افسر مال اور کبھی افسر خزانہ لگ سکتا ہے‘ لیکن رہے گا PCS‘ اس لیے کہ یہ اس کا مرتبہ ہے۔

نبوت بھی ایک کیڈر اور مرتبہ ہے اور رسالت منصب ہے۔ جب کوئی نبی کسی خاص مقام اور خاص قوم کی طرف بھیج دیا جائے تو وہ رسول ہو جاتا ہے۔ اس رائے کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ نبی کا لفظ بنا ہے نَبأ سے‘ بمعنی خبر دینے والا۔ اللہ تعالیٰ نبی کی طرف وحی بھیجتا ہے اور وہ لوگوں تک اس کا پیغام اور غیب کی خبریں پہنچاتا ہے‘ جبکہ رسول‘ رسل سے ہے‘ بمعنی بھیجا ہوا‘ تو رسول کسی قوم اور علاقے کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

نبی ولی اللہ ہوتا ہے: اس حوالے سے ایک اور بات سمجھئے کہ نبی اپنی ذات میں ولی کامل ہوتا ہے ___ جو بھی ولی اللہ ہوگا‘ چاہے وہ نبی اور رسول نہیں ہے‘ اُس کی ذات سے خیر پھیلے گا‘ وہ اللہ کی طرف ہی لوگوں کو دعوت دے گا‘ اس لیے کہ یہ تو اس کی فطرت اور نوعِ انسانی کے ساتھ خلوص واخلاص کا تقاضا ہے۔ اگرچہ ولی اللہ اس کام کے لیے مامور من اللہ نہیں ہے لیکن وہ خیر خواہی تو کرتا رہے گا۔ مثلاً بابا فرید الدین گنج شکر اللہ کی طرف سے مامور (appointed) تو نہیں تھے‘ نہ ان پر وحی آتی تھی‘ لیکن وہ دعوت الی اللہ کا فریضہ بخوبی نبھاتے رہے۔ اسی طرح نبی بھی روحانیت‘ شخصیت اور کردار کے اعتبار سے اللہ کا ولی یا صدیق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے اگر اس پر وحی آ گئی تو وہ نبی ہو گیا۔ اب یا تو وہ نبی ہی رہا‘ رسول بنا ہی نہیں‘ تو بھی وہ دعوت تو دے گا‘ اللہ کے پیغام کو پھیلائے گا‘ لیکن اگر اسے کسی خاص قوم یا علاقہ کی طرف بھیج دیا جائے ___ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا گیا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ”جاؤ فرعون کی طرف کہ وہ سرکش ہو گیا ہے“ ___ تو

اس اعتبار سے وہ مامور من اللہ ہے اور اب وہ دعوت وتبلیغ صرف اپنی طبیعت کے تقاضے سے نہیں کر رہا ہے' بلکہ یہ اس کا فرضِ منصبی ہے۔ اسی فرق کی وجہ سے نبیوں کے لیے ''قصص النبیّین'' جبکہ رسولوں کے لیے ''انباء الرسل'' کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔

نبی اور رسول کی دعوت کا بنیادی فرق: نبی اور رسول کی حیثیت میں فرق کی بنا پر نبی اور رسول کی دعوت میں بھی ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ نبی یہ نہیں کہتا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔۔۔۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بہت تفصیل سے بیان ہوا ہے' لیکن انہوں نے کسی مرحلے پر بھی یہ نہیں کہا کہ پہلے مجھ پر ایمان لاؤ پھر میں تمہارا ساتھ دوں گا' بلکہ خدمتِ خلق کے جذبے سے انہوں نے کام کیا۔ ظاہر بات ہے کہ ان پر ان کی قوم تو ایمان نہیں لائی تھی اور نہ ہی انہوں نے مطالبہ کیا تھا' البتہ دعوت انہوں نے جیل میں بھی دی۔ اپنے دو قیدی ساتھیوں کو دعوت دینے کا ذکر قرآن حکیم میں بھی آیا ہے۔ اس دعوت میں آپؑ نے یہ نہیں کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو' بلکہ ان سے کہا:

﴿یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلَّاۤ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۚ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ (یوسف)

''میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا کئی جدا جدا آقا اچھے یا (ایک) اللہ یکتا و غالب؟ جن چیزوں کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں' اللہ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ (سن رکھو کہ) اللہ کے سوا کسی کی حکومت نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے' لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

اس کے برعکس رسول کا معاملہ ایسا نہیں ہے' وہ تو اللہ کا نمائندہ بن کر آتا ہے' اس لیے وہ اپنی دعوت کے آغاز ہی میں کہتا ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ اور میرا حکم مانو۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا: ﴿یٰقَوْمِ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ

اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾ (نوح) ’’اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا (رسول) ہوں۔ (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!‘‘

رسول کی تکذیب پر عذابِ استیصال کا نزول: نبی اور رسول کے حوالے سے ایک اور فرق ملاحظہ ہو کہ اگر کسی نبی کی بات نہیں مانی گئی تو قوم پر عذاب نہیں آتا۔ جو لوگ بھی نبی کی دعوت و اصلاح سے مستفید ہو جائیں گے وہ اپنی عاقبت سنوار لیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اگر قوم نے نبی کی دعوت قبول نہ کی تو وہ قوم ہلاک کر دی جائے گی۔ اس کے برعکس رسول اگر اپنی دعوت‘ اپنے پیغام اور اپنے عمل کے ذریعے سے لوگوں پر اتمامِ حجت کر دے اور وہ لوگ پھر بھی نہ مانیں اور ایمان نہ لائیں تو وہ لوگ مجموعی طور پر سب کے سب عذابِ الٰہی کے ذریعے سے ختم کر دیے جاتے ہیں۔ آپ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن میں قومِ ہودؑ قومِ نوحؑ قومِ صالحؑ قومِ شعیبؑ قومِ لوط اور آلِ فرعون کا ذکر بتکرار آتا ہے کہ ان کی طرف رسول بھیجے گئے۔ انہوں نے انکار کیا تو ان پر ایسا عذاب آیا کہ ساری کی ساری قوم ہلاک ہوگئی —— ایسا عذاب جس سے پوری کی پوری قوم ہلاک ہو جائے اس کو ’’عذابِ استیصال‘‘ کہتے ہیں۔ استیصال‘ اصل سے ہے اور اصل کہتے ہیں جڑ کو‘ جبکہ استیصال کا معنی ہے: کسی شے کو جڑ سے اکھاڑ دینا۔ اگر آپ نے کسی پودے کو اوپر سے کاٹ دیا تو امکان موجود ہے کہ اس میں دوبارہ پتے نکل آئیں‘ پھر شاخیں آ جائیں‘ لیکن جس درخت کو جڑ سے ہی اکھیڑ دیا جائے تو اس میں کسی بھی قسم کی نشوونما کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

اس کو یوں سمجھئے کہ کوئی فوجی ہمارے ہاں اگر سادہ کپڑوں میں پھر رہا ہے اور کسی نے اس کے خلاف کوئی اقدام کیا تو اس کے جرم کی نوعیت عام شہری کے خلاف اقدام کرنے جیسے ہوگی‘ لیکن اگر وہ اپنے یونیفارم میں ہے اور آپ نے اس پر حملہ کیا تو یہ حکومت کے خلاف بغاوت شمار ہوگی۔ اسی طرح نبی اور رسول کی تکذیب اور ان کے خلاف اقدام کی نوعیت میں فرق ہے۔

نبی کے برعکس رسول قتل نہیں ہوسکتا: رسول چونکہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ بن کر کسی علاقے میں گیا ہوتا ہے تو وہ کسی صورت قتل اور مغلوب نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے قرآن میں دو ہم عصر شخصیتوں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی مثال موجود ہے۔ سورۂ آل عمران میں دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اللہ نے جو مدح کی ہے اس میں آخری جملہ ﴿نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ''(یحییٰ) نبی ہوگا صالحین میں سے'' آیا ہے' جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدح کے آخر میں فرمایا: ﴿رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ (آیت ۴۹) ''(عیسیٰ کو) رسول بنا کر بھیجا گیا بنی اسرائیل کی طرف'' ـــــ اب یہاں نبی اور رسول کے الفاظ ایک جگہ آ گئے تو ان کا مفہوم جدا جدا ہوگا' بایں طور کہ حضرت یحییٰ نبی اور حضرت عیسیٰ رسول قرار پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر دیا گیا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنا تو اللہ نے انہیں زندہ اٹھالیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں دو جگہ بڑے اہتمام سے فرمایا گیا ہے کہ رسول قتل نہیں ہوسکتا: (۱) سورۃ المجادلہ میں فرمایا: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ (آیت ۲۱) ''اللہ نے طے کرلیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے''۔ (۲) سورۃ الصافات میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ ''ہماری یہ بات تو رسولوں کے بارے میں طے ہو چکی ہے کہ لازماً ان کی مدد ہوگی' اور ہمارا لشکر لازماً فتح مند ہوگا'' ـــــ اسی تناظر میں حضرت نوح علیہ السلام کی فریاد آ گئی ہے جس کا تذکرہ سورۃ القمر میں بایں الفاظ آیا: ﴿فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴾ ''پس اس نے اپنے رب کو پکارا (اے رب!) میں تو مغلوب ہوا جا رہا ہوں پس تو بدلہ لے ان سے'' ـــ البتہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر قتل کا لفظ رسولوں کے ساتھ بھی آیا ہے' لیکن وہاں میرے نزدیک رسول کا لفظ نبی کی جگہ آیا ہے۔ اس حوالے سے میں نے یہ تمہید باندھی تھی کہ نبی اور رسول کا لفظ ایک دوسرے کی جگہ بھی استعمال ہوسکتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی دو بعثتیں

نبی اور رسول کے درمیان مندرجہ بالا نسبت کو بیان کرنے کے بعد اب اصل

موضوع کی طرف آتے ہیں۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے دو بعثتوں کے ساتھ بھیجا ہے۔ آپ ﷺ کی خصوصی بعثت بنی اسماعیل یعنی امیین کی طرف تھی اور حضور ﷺ بھی انہی میں سے تھے۔ بمصداق قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعۃ: ۲) ''وہی تو ہے جس نے اَن پڑھوں میں انہی میں سے ایک پیغمبر (محمد ﷺ) مبعوث فرمایا'' —— قریش نہ تو پڑھے لکھے لوگ تھے اور نہ ان کے پاس اس سے پہلے کوئی آسمانی کتاب تھی —— آپ ﷺ کی اصل بعثت ان کی طرف ہے اور ان کے لیے آپؐ کی حیثیت رسول کی ہے۔ ثانیاً آپ ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کی طرف ہے۔ بمصداق الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا: ۲۸) ''اور (اے محمد ﷺ!) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔ اس اعتبار سے نوعِ انسانی کے لیے آپؐ کی حیثیت نبی کی ہے۔

نبی اکرم ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں مشابہت

اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ حضور اکرم ﷺ سے مشابہ ترین رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ دونوں صاحبِ کتاب، صاحبِ شریعت اور صاحبِ ہجرت ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی دو بعثتیں ہوئی ہیں۔ ایک بعثت تھی آلِ فرعون کی طرف، لیکن آلِ فرعون نے نہیں مانا تو وہ غرق کر دیے گئے۔ اس لیے کہ آلِ فرعون کے لیے آپؑ بحیثیت رسول مبعوث ہوئے اور اللہ کا قانون ماقبل بیان ہوا ہے کہ رسول کی دعوت کو اگر نہ مانا جائے تو پھر نہ ماننے والوں پر عذابِ استیصال آتا ہے اور پوری قوم ہلاک ہو جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دوسری بعثت بنی اسرائیل کی طرف تھی اور ان کے لیے آپؑ کی حیثیت نبی کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی نافرمانی پر نافرمانی کرتے رہے، لیکن ان کو صرف سزا دی گئی اور ان پر عذابِ استیصال نہیں آیا —— اس سے بڑی نافرمانی کیا ہو گی کہ جب قتال کا حکم ہوا تو انہوں نے کورا جواب دے دیا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ (المائدۃ) ''جاؤ تم اور تمہارا رب جنگ کرو ہم تو یہیں بیٹھے

ہیں''۔اس جواب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اتنی بیزاری ہوئی کہ آپؑ نے دعا مانگی: ﴿رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (المائدۃ) ''پروردگار! مجھے اختیار ہے تو بس اپنی جان کا یا اپنے بھائی (ہارون) کی جان کا' پس تو ہمارے اور اس نابکار قوم کے درمیان تفریق پیدا کر دے''۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس بیزاری کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ چھ لاکھ کے مجمع میں سے صرف دو افراد یوشع بن نون اور کالب بن یوفنا قتال کے لیے تیار ہوئے۔اس طرح حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو ملا کر یہ چار ہو گئے۔اب چار آدمی تو جنگ نہیں کر سکتے — اتنے بڑے جرم پر بھی عذابِ استیصال نہیں آیا' اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیثیت ان کے لیے رسول کی نہیں' بلکہ نبی کی تھی۔البتہ اس جرم پر ان کو سزا دی گئی کہ چالیس سال تک ارضِ مقدس سے محروم رہے اور اسی صحرا میں بھٹکتے پھرے۔ان چالیس سالوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہو گیا اور وہ نسل ختم ہو گئی جس نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا اور اس کی جگہ ایک نئی نسل نے لے لی جو یہاں صحرا میں پیدا ہوئی' یہیں پلی بڑھی' اس نے مختلف قسم کی سختیاں جھیلیں' تب ان کے اندر جہاد کا ولولہ پیدا ہوا اور پھر انہوں نے حضرت یوشع بن نون کی زیرِ قیادت جہاد اور قتال کیا۔

بنی اسماعیل اور اُمیین کے لیے عذابِ استیصال کا حکم

اسی طرح محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت بحیثیت رسول امیین کی طرف تھی' لہٰذا امیین پر ان کی زبان میں کتاب نازل ہوئی' جبکہ باقی بنی نوع انسان کی زبان میں تو قرآن نازل نہیں ہوا۔اسی طرح حضور اکرم ﷺ کی ذات اُمّیین کے لیے کوئی اجنبی نہ تھی' اس لیے کہ آپؐ انہی میں سے تھے۔دوسری قوموں کے لیے ظاہر بات ہے کہ حضور ﷺ اجنبی تھے۔تو اتمامِ حجت اصلاً امیین پر ہوا ہے۔اب اگر اُمّیین نے نہیں مانا تو وہ عذابِ استیصال کے مستحق ہو گئے تھے کہ ان کو جڑ سے اکھیڑ دیا جائے' لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہوئی کہ انہیں دو قسطوں میں عذاب دیا گیا۔پہلے تو جیسے بین بجا کر بل میں سے سانپ نکالتے ہیں اس طرح قریش کو مکہ سے نکالا گیا اور میدانِ بدر میں ان کی پیٹھ پر عذاب کا

کوڑا برسایا گیا‘ بایں طور کہ سارے بڑے بڑے سردار ختم ہو گئے۔ اس جنگ میں فرشتے بھی مسلمانوں کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں کسی کافر کی طرف اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ میرے تلوار چلانے سے پہلے ہی اس کی گردن اڑ گئی۔ یہ دراصل عذابِ الٰہی کی ایک شکل تھی۔ عذاب کی آخری قسط نبی اکرم ﷺ کے آخری دور میں نازل ہوئی جب سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں‘ جن میں مشرکین مکہ کو آخری وارننگ دے دی گئی کہ ایمان لے آؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ لہٰذا سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات عام نہیں ہیں‘ بلکہ اس پس منظر میں ان کا حکم خاص اُمیین اور بنی اسماعیل کے لیے ہے۔

اسی طرح زیر مطالعہ حدیث اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث کا وہ حصہ جو قبل ازیں میں نے آپ کے سامنے بیان کیا ہے‘ یہ دونوں اس پس منظر کے ساتھ خاص ہیں۔ اگر یہ پورا پس منظر سامنے نہ ہو اور ان احادیث کو عام سمجھ لیا جائے تو بہت بڑی غلط فہمی اور بہت بڑی گمراہی پیدا ہو سکتی ہے کہ اسلام بالجبر تلوار کے ذریعے پھیلا ہے۔

سورۃ التوبہ کے اندر ہی اہل کتاب کے لیے اس حوالے سے ایک علیحدہ قانون آیا ہے کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو چھوٹے بن کر رہیں اور ہاتھ سے جزیہ دیں۔ لیکن یہ امیین اگر نہیں مانیں گے تو ان کا قتل عام ہوگا۔ اگرچہ معاملے کی نوعیت بالفعل یہ رہی کہ قتل عام کی نوبت نہیں آئی‘ بلکہ ایک شخص کے قتل کی بھی نوبت نہیں آئی اور سب کے سب ایمان لے آئے اور جو لوگ ایمان نہیں لائے وہ جزیرہ نمائے عرب کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔

پاکستان کا ’’کافرستان‘‘ اور افغانستان کا ’’نورستان‘‘

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک پاکستان میں چترال کے ساتھ ایک چھوٹا سا علاقہ ’’کافرستان‘‘ ہے اور اس سے بالکل ملحق افغانستان میں ایک علاقہ ’’نورستان‘‘ ہے۔ یہ دونوں اصل میں مل کر ایک قوم ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ہم قریشی ہیں۔ ہمارے آباء و اَجداد سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات نازل ہونے اور قتلِ عام

کے اس آخری حکم کے آ جانے کے بعد جزیرہ نمائے عرب چھوڑ کر بھاگے تھے اور عراق میں آ بسے تھے۔ لیکن جیسے جیسے اسلامی فتوحات کا دائرہ کار بڑھتا گیا تو یہ لوگ بھی آگے بڑھتے گئے اور عراق' ایران' افغانستان سے ہوتے ہوئے چترال سے ملحقہ ان پہاڑی علاقوں تک پہنچ گئے۔ اس طرح یہ سارا علاقہ 'کافرستان' کہلانے لگا۔ لیکن جب احمد شاہ ابدالی کا انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا اور افغانستان وجود میں آیا تو اس علاقے کا ایک ٹکڑا افغانستان میں چلا گیا اور ایک ٹکڑا ہندوستان میں آ گیا جو اَب پاکستان میں ہے۔ افغانستان میں والئ کابل امیر دوست محمد خان نے ان لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے' یعنی ان کو الٹی میٹم دے دیا کہ ایمان لاؤ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے تو وہ ایمان لے آئے اور اس کے بعد سے یہ علاقہ 'نورستان' کہلاتا ہے —ان کے ایک عالمِ دین کہتے تھے کہ چونکہ ہم قریشی ہیں لہٰذا مہدی ہم میں سے ہوگا۔ وہ ایک بار یہاں آئے تھے اور ان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ یہ لوگ مسلک کے اعتبار سے سلفی یعنی اہلِ حدیث ہیں اور شریعت کے بڑے پابند اور پختہ عقائد کے حامل ہیں۔

دوسری طرف اس علاقے کا جو ٹکڑا پاکستان میں ہے وہ آج بھی 'کافرستان' کہلاتا ہے اور وہ اپنے پرانے کفر پر قائم ہیں۔ پاکستانی حکومت نے اس علاقہ کو سیاحت کے لیے محفوظ (preserve) کر رکھا ہے کہ لوگ آئیں اور دیکھیں کہ ان کی روایات (customs) کیا ہیں' ان کی عورتیں ناچتی کیسی ہیں' ان کے لباس کیسے ہوتے ہیں' وغیرہ۔

عکرمہ بن ابوجہل کا واقعہ

سورۃ التوبہ میں قتل عام کے اس آخری حکم کے آ جانے کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے بھاگنے والوں میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی تھا۔ ابوجہل کی طرح وہ بھی اپنی ہٹ کا پکا تھا۔ وہ ایمان نہ لایا اور کشتی میں سوار ہو کر حبشہ کی طرف فرار ہونے لگا— جیسے کبھی مسلمانوں نے اہل مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی — بحیرۂ قلزم (Red Sea) میں طوفان آنے کی وجہ سے کشتی ہچکولے لینے لگی۔ اس پر سب کشتی والوں نے مل کر اللہ کو پکارا: یا اللہ! ہمیں اس مصیبت سے نکال لے۔ عکرمہ نے

سوچا کہ مصیبت کی اس گھڑی میں ہم ہبل' لات' عُزیٰ اور منات کو پکارنے کے بجائے ایک اللہ کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری فطرت میں اور دلوں میں لات' منات' عُزیٰ ہبل وغیرہ نہیں بلکہ اللہ ہی اللہ ہے۔ اسی اللہ کی طرف تو محمد ﷺ بلا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ واپس لوٹے' ایمان لے آئے اور صادق الایمان ثابت ہوئے۔ پھر انہوں نے جہاد کے کئی معرکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہادت کا بلند درجہ حاصل کیا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ۔

قتال کی تین صورتیں

قرآن حکیم اور سیرت النبی ﷺ میں ہمیں قتال کا معاملہ تین سطحوں پر ملتا ہے۔

قتال کی پہلی صورت: یہ قتال حضور ﷺ کا بنیادی فریضہ تھا کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے قتال کرنا جبکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے اتمام حجت ہو چکا ہو' اور دوسری طرف ایک معتد بہ تعداد میں لوگ تیار ہو چکے ہیں جو دین پر عمل پیرا ہوں' منظم بھی ہوں' اور جان دینے کو تیار ہوں۔ یہ دو شرطیں جب پوری ہو جائیں تو پھر جو بھی راستے میں مزاحم ہے اس سے قتال ہو گا۔ اسے ''قتال فی سبیل اللہ'' کہا جاتا ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی (top) ہے۔ دیکھئے' حضور اکرم ﷺ نے اپنی بعثت کے پہلے پندرہ برس تک دعوت و تبلیغ' وعظ و تلقین' نصیحت' تربیت' تزکیہ اور تعلیم پر زور دیا۔ یہ سب کچھ بھی جہاد فی سبیل اللہ تھا۔ پھر اس کے بعد قتال شروع ہو گیا اور واضح کر دیا گیا کہ جب تک دین غالب نہ ہو جائے اور فتنہ ختم نہ ہو جائے یہ قتال جاری رہے گا۔ یہ قتال گویا آخری مرحلہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کا' لیکن اس کے لیے کچھ شرائط و لوازم ہیں۔ پہلے حقیقی ایمان دلوں میں راسخ کیا جائے' شریعت کو اپنی ذات اور اپنے گھر پر نافذ کیا جائے۔ پھر ایسے لوگوں کی تربیت اور تزکیہ کیا جائے' ان کو نظم و ضبط کا خوگر بنایا جائے اور ایک جماعت کی صورت میں ایک امیر کے پیچھے چلنے والا بنایا جائے۔ یہ سب پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تب جا کر قتال کی منزل آتی ہے۔

یہ قتال آج بھی ہو سکتا ہے کہ کسی غیر مسلم اکثریت والے ملک میں چند مسلمان اٹھ

کھڑے ہوں۔ وہ دعوت دیں اور ان کی دعوت کے نتیجے میں اگر وہاں معتد بہ تعداد میں لوگ ایمان لے آئیں تو وہ اپنی جماعت بنائیں' اور اگر ضرورت پڑے تو قتال کریں۔ اس کے نتیجے میں وہاں پر زمین کا جو حصہ بھی ان کو مل جائے اس میں اللہ کا دین قائم کرلیں۔ اس طرح کی صورتِ حال کسی مسلمان ملک میں بھی پیش آ سکتی ہے۔ یعنی اگر کہیں مسلمان حکمران ہی شریعت کے نفاذ اور اسلام کے نظام کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بنے بیٹھے ہوں تو ان کے خلاف بھی قتال ہوسکتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا فتویٰ ہے اور میں اس کا قائل ہوں۔ اہل حدیث حضرات اس معاملے میں بہت نرم ہیں اور ان کا موقف ہے کہ مسلمان حکمران خواہ کیسے بھی ہوں ان کے خلاف خروج' بغاوت اور قتال نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک میں آمر اور بادشاہ آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں اور انہیں کوئی خطرہ نہیں' جبکہ ایرانیوں نے ہمت کرکے بادشاہ کو بھگا دیا اور اس کے لیے جان بچانی مشکل ہوگئی۔ میرے نزدیک ایک قتال تو یہ ہے اور قرآن مجید میں اکثر و بیشتر جو قتال کا حکم آیا ہے وہ اسی قتال سے متعلق ہے۔

اس وقت دنیا میں ڈیڑھ ارب مسلمان ہیں اور وہ بس نام کے مسلمان ہیں۔ اگر ہم واقعی مسلمان ہوتے تو کیا دنیا میں یوں ذلیل وخوار ہوتے؟ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں!

ظاہر بات ہے کہ مسلمانوں کے کسی ملک میں حکومت بھی اسی طرح کے نام نہاد مسلمانوں کی ہوگی۔ اگر کوئی تحریکِ اسلامی اس حد تک پہنچ جائے کہ دعوت وتبلیغ کے ذریعے سے اس کی جانب سے لوگوں پر اتمامِ حجت بھی ہوگیا ہو اور ایک جماعت ''حزب اللہ'' بھی ایسی تیار ہوچکی ہو جو خود بھی اللہ کے احکام پر کاربند ہو اور وہ منظم ہوکر ایک امیر کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم بھی کرلے تو پھر چاہے وہ حکومت نام کے مسلمانوں کی ہو ان کے خلاف بھی قتال جائز ہے۔ اس قتال کو کوئی حرام قرار نہیں دے سکتا۔ یہ کام صرف جھوٹے مدعیٔ نبوت غلام احمد قادیانی نے کیا کہ قتال کو حرام قرار دے دیا۔ ع ''دیں کے

لیےحرام ہےاب دوستو قتال"!— اس اعتبار سے بہت گمراہ کن بات ہے اس لیے کہ قتال تو قیامت تک جاری رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُقَاتِلَ آخِرُ اُمَّتِي الدَّجَّالَ))(۱) "جہاد اس وقت سے جاری ہے جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا اور (جاری رہے گا) یہاں تک کہ میری امت کا آخری حصہ دجال سے جنگ کرے گا۔"

البتہ یہ ضرور ہے کہ آج کے حالات میں اس کا ایک متبادل بھی موجود ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومتیں آج کل بہت طاقتور ہیں اور ان کے پاس لاکھوں کی تعداد میں مسلح افواج ہیں، بری بحری اور فضائی فورسز ہیں، ہوائی جہاز، گن شپ ہیلی کاپٹرز اور ٹینک ہیں، جبکہ عوام بالکل نہتے ہیں، اس لیے مقابلہ بالکل غیر مساوی (unequal) ہے۔تو اس کا بدل یہ ہے کہ ایک منظم، پرامن عوامی تحریک برپا کی جائے جو حکومت کو بہا لے جائے۔ اس میں قربانیاں دینی پڑیں گی۔ جو لوگ بھی یہ کام کریں گے ان پر ملک کی فوج گولیاں چلائے گی، راکٹ برسائے گی، لیکن بالآخر کچھ عرصے کے بعد فوج ہاتھ اٹھا دے گی کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو مزید قتل نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں ۱۹۷۷ء کی تحریک میں ایسا ہو چکا ہے اور ایران میں بھی یہی ہوا تھا۔

<u>قتال کی دوسری شکل</u>: دوسری نوعیت کے قتال کا بس حکم آیا ہے اور وہ بالفعل ہوا نہیں ہے۔ اس کا ذکر سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات اور ہمارے زیر مطالعہ احادیث میں ہوا ہے۔اس کو قتال نہیں، بلکہ قتل عام کہنا چاہیے' اس لیے کہ یہاں لفظ قتال نہیں آیا بلکہ کہا گیا ہے: ﴿فَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ﴾ "قتل کرو انہیں جہاں بھی تم انہیں پاؤ"۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قتال تو دو گروہوں کے درمیان ہوتا ہے جبکہ وہ تو مقابلے میں تھے ہی نہیں، ان کی جڑ تو بدر میں ہی کٹ گئی تھی۔ ان کی قوت ختم اور ان کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ درحقیقت یہ ان کے قتل عام کا حکم تھا، اگرچہ اس کی نوبت نہیں آئی، بایں طور کہ ان کی اکثریت ایمان لے آئی اور باقی عرب سے بھاگ گئے۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی الغزو مع ائمة الجور۔

قتال کی تیسری شکل: قتال کی تیسری شکل جو ہمیں قرآن حکیم اور سیرت النبی ﷺ سے ملتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ملک میں اسلامی انقلاب آ جائے اور اسلام بطورِ دین غالب آ جائے تو اسے آگے پھیلانے کے لیے قتال کرنا۔ اس قتال کا ذکر سورۃ التوبہ ہی کی آیت ۱۲۳ میں ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴿۱۲۳﴾﴾ (التوبۃ)

''اے اہل ایمان! قتال کرو ان کفار سے جو تم سے متصل ہیں (یعنی تمہاری سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہیں) اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں۔ اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔''

حضور اکرم ﷺ کے دور میں دو بڑی جنگوں کا معاملہ شروع ہو گیا تھا' ایک شام سے ہو کر سلطنتِ روم تک اور دوسری عراق سے ہو کر سلطنتِ ایران تک۔ شام کے خلاف جو فوج کشی ہوئی اس کا ایک سبب بظاہر موجود تھا کہ وہاں کے حکمران نے حضور ﷺ کے ایک ایلچی کو شہید کر دیا تھا۔ ایلچی کا قتل یقینی طور پر اعلانِ بغاوت ہوتا ہے' چنانچہ ان پر فوج کشی کی گئی' لیکن اس کا اصل سبب دین اسلام کو آگے سے آگے پھیلانا تھا۔ اس بات کو تقویت اس سے ملتی ہے کہ ایران نے تو کچھ نہیں کیا تھا' پھر بھی اس کے خلاف قتال اس لیے کیا گیا کہ اس دین کو پوری دنیا میں پھیلانا ہے۔ یہ دین صرف عرب کے لیے نہیں بلکہ یہ پوری دنیا کے لیے آیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایران میں فوج کشی کی گئی۔ لہٰذا سورۃ التوبہ کی یہ آیت ۱۲۳ بہت اہم ہے۔ اصل میں سورۃ التوبہ تقریباً آخری زمانے کی سورت ہے اور اس میں جو احکام آئے ہیں وہ حتمی ہیں۔

ہمارے ہاں ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے ''میثاقِ مدینہ'' کو اسلام کا دستور قرار دے کر ایک بہت بڑا مغالطہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے' اس لیے کہ میثاقِ مدینہ تو مدینہ کے مشترکہ دفاع (Joint defence) کا ایک معاہدہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہودیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے انہیں جکڑ لیا کہ اب اگر مدینہ پر حملہ ہو گا تو ہم سب مل کر حملہ آور سے جنگ کریں گے اور مدینہ کا دفاع کریں

گے۔ یہ تو ان کی اپنی بدعہدی تھی جس کی وجہ سے انہیں مدینہ سے نکال باہر کیا گیا۔ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کی بالادستی قائم ہونے کے بعد وہاں پر آباد یہود و نصاریٰ کو اختیار دے دیا گیا کہ یا تو اسلام لے آئیں یا جزیہ دیں یعنی اسلام کی بالادستی تسلیم کریں۔ اگر یہ دونوں منظور نہیں تو پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس کے بعد مسلمان فوج جہاں بھی گئی وہاں انہوں نے یہی تین متبادل مطالبات (alternatives) پیش کیے: پہلی صورت یہ کہ اسلام لے آؤ' ہمارے برابر کے ہو جاؤ گے۔ ہم یہ بھی نہیں کہیں گے کہ ہم سینئر مسلمان ہیں تم جونیئر مسلمان اور ہمارے حق زیادہ ہیں تمہارے کم ہیں۔ بلکہ ''المُسلم کفوٌ لکل مُسلم'' کا اصول لاگو ہوگا۔ اگر ایمان نہیں لاتے تو دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے دین کی بالادستی قبول کرو' نیچے ہو کر رہو اور اپنے ہاتھوں سے جزیہ دو۔ اگر یہ بھی قبول نہیں تو تیسری صورت یہ ہے کہ آؤ میدان میں۔ پھر تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔ اسی کے ضمن میں یہ آیت ہے جس پر توجہ بہت کم ہوتی ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَکُمْ مِّنَ الْکُفَّارِ﴾۔ ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فوری طور پر چین سے تو جنگ نہیں کر سکتے تھے' صرف انہی سے کر سکتے تھے جن کی سرحدیں عرب کے ساتھ ملتی ہیں — دیکھئے جزیرہ نمائے عرب کے ایک طرف خلیج' دوسری طرف بحیرۂ قلزم اور نیچے بحیرۂ عرب ہے۔ اب دو ہی ملک تھے' ایک عراق جو ایران کے تابع تھا' لہٰذا عراق سے ہو کر ایران' جبکہ دوسری طرف شام' جو تابع تھا روم کے۔ لہٰذا صحابہ کرامؓ نے ان سے جہاد کیا اور ان کو فتح کر کے اسلامی ریاست کا حصہ بنایا۔

میں نے کئی مرتبہ یہ بات واضح کی ہے کہ آج کے دور میں اللہ کے دین کا قیام قتال کے بغیر بھی ممکن ہے اور اس کے لیے غیر مسلح بغاوت اور پُرامن عوامی تحریک' ان شاء اللہ' کفایت کر جائے گی۔ اسی طرح ایک دفعہ دنیا میں کہیں اسلام قائم ہو جائے تو پھر اس کو پھیلانے کے لیے فوج کشی کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا نظام پوری دنیا کی نگاہوں کے سامنے ہوگا۔ ٹیلی ویژن' اخبارات اور انٹرنیٹ کے

ذریعے پوری دنیا کے لوگ دیکھ رہے ہوں گے کہ انہوں نے کس قدر عمدہ نظام بنا دیا ہے تو کون نہیں چاہے گا کہ اچھی چیز کو اختیار کرے۔ ان شاء اللہ اسی کے ذریعے سے بات پھیل جائے گی۔ لیکن یہ یاد رہے کہ آج کے دور میں بھی قتال حرام نہیں ہے اور آیاتِ قتال کا حکم آج کے لیے بھی ہے۔ اگر کہیں اس کا موقع ہو تو پھر فوج کشی کر کے پڑوسی ملک کو دین اسلام کے تابع لایا جا سکتا ہے۔

ربّ العالمین کا قانونِ عذابِ استیصال

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہو چکا' سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد بنی اسماعیل کے لیے کوئی اختیار نہیں تھا' ان کے لیے بس یہی ایک آپشن تھا کہ اسلام لے آؤ' ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ ایسا کیوں ہوا' اس بارے میں نوٹ کر لیں کہ یہ سنت اللہ کے تحت ہوا ہے۔ سابقہ اقوام کے بارے میں بھی اللہ کا یہی طریقہ رہا ہے کہ جس قوم کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا اور اس نے اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے اتمامِ حجت کر دیا' لیکن پھر بھی وہ قوم کفر پر اَڑی رہی اور ان میں سے اتنے لوگ بھی ایمان نہیں لائے کہ وہ اپنی قوم کے خلاف جنگ کر سکتے تو اس کے بعد یہ شکل ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذابِ استیصال آتا اور اس قوم کو نسیاً منسیاً کر دیا جاتا۔

اس حوالے سے چھ قوموں قومِ نوح' قومِ ہودؑ قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیب اور آلِ فرعون کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آتا ہے کہ جو اس قانونِ الٰہی کے تحت ہلاک کر دی گئیں۔ اس ضمن میں سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۰ خصوصی اہمیت کی حامل ہے' جس میں اس عذابِ استیصال کی مختلف صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ فرمایا: ﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ﴾ ''چنانچہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اُس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا''۔ ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا﴾ ''تو ان میں وہ بھی تھے جن پر ہم نے زور دار آندھی بھیجی'' —— یہ آندھی قومِ لوطؑ پر بھی آئی تھی جو زلزلے سے تلپٹ ہو جانے والی بستیوں پر پتھراؤ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اس سے پہلے قومِ عاد پر بھی آندھی کا عذاب آیا تھا' جس کا ذکر سورۃ الحاقہ میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ

عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝﴾ ''اور قومِ عاد کے لوگ ہلاک کیے گئے تیز آندھی سے' جو ان پر مسلط کر دی گئی سات راتیں اور آٹھ دن تک' برباد کر دینے کے لیے' پس تو دیکھتا ان لوگوں کو جو گری ہوئی کھجوروں کے تنوں کی طرح پچھڑے پڑے تھے''۔ روایات میں آتا ہے کہ اس ہوا میں کنکر اور پتھر بھی تھے جو گولیوں اور میزائلوں کی طرح انہیں نشانہ بناتے تھے اور وہ آندھی اتنی زوردار تھی کہ انسانوں کو زمین پر پٹخ پٹخ کر پھینکتی تھی۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ﴾ ''اور ان میں وہ بھی تھے جنہیں چنگھاڑ نے آ پکڑا''۔ اس سے قومِ ثمود کے لوگ اور اہل مدین مراد ہیں جن پر ایک زوردار آواز آئی جس کے نتیجے میں سب ہلاک ہو گئے —— واضح رہے کہ قیامت والی عظیم ہلاکت بھی ایک آواز ہی سے ہو گی۔ آپ نے مسجدوں میں دیکھا ہو گا کہ نماز کے دوران کسی وقت لاؤڈ سپیکر اَپ سیٹ ہو کر چیخ مارنی شروع کر دے تو واقعہ یہ ہے کہ نمازیوں کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے تیز آواز میں بھی ہلاکت خیزی موجود ہے۔

آگے فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ﴾ ''اور ان میں ان میں وہ بھی تھے جنہیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا''۔ اس ضمن میں قارون کا ذکر سورۃ القصص' آیت ۸۱ میں ہوا ہے' جہاں فرمایا گیا: ﴿فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۣ﴾ ''تو ہم نے اُسے اور اُس کے محل کو زمین میں دھنسا دیا''۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قارون ''خسف فی الارض'' کے عذاب کا شکار ہو گیا۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ﴾ ''اور ان میں وہ بھی تھے جن کو ہم نے غرق کر دیا''۔ غرق کیے جانے کا عذاب دو قوموں پر علیحدہ علیحدہ طریقے سے آیا تھا۔ قومِ نوحؑ کو تو ان کے گھروں اور شہروں میں ہی غرق کر دیا گیا تھا' جبکہ فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو محلوں اور آبادیوں سے نکال کر سمندر میں لے جا کر غرق کیا گیا۔ آخر میں فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝﴾ ''اور اللہ ایسا نہیں تھا کہ ان پر ظلم کرتا' بلکہ وہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔

عذاب استیصال کے قانون میں یہود کا استثناء

اللہ تعالیٰ کے قانونِ عذابِ استیصال کے ضمن میں یہ نوٹ کر لیں کہ اس میں ایک استثناء موجود ہے اور وہ یہودیوں کا استثناء ہے — یہود کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا: ﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ﴾ (الصف:٦) ''اور جب کہا عیسیٰ ابن مریم نے: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول (بنا کر بھیجا گیا) ہوں'' — حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت پوری دنیا کے لیے نہیں تھی۔ پوری دنیا کے لیے تو صرف ایک ہی رسول بھیجے گئے اور وہ محمد ﷺ ہیں۔ آپؐ سے پہلے سارے رسول اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے۔ حضرت عیسیٰؑ بھی بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے — بنی اسرائیل نے نہ صرف ان کا انکار کیا بلکہ ان پر بے ہودہ الزام لگایا' انہیں جادوگر' کافر اور مرتد قرار دیا (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) اور بالآخر اس قوم نے حضرت مسیحؑ کو اپنے بس پڑتے سولی پر چڑھوا کے دم لیا۔ اس نافرمانی پر وہ عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے لیکن ان پر عذاب نہیں آیا۔ کیوں نہیں آیا؟ اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی مشیت ہے' البتہ اس کی ایک توجیہہ میرے سامنے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سارے معاملے کو اشتباہ میں ڈال دیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اوپر آسمانوں پر اٹھا لیا گیا اور سولی پر نہیں چڑھنے دیا گیا۔ پھر سولی پر کون چڑھا' اس کے بارے میں خود انجیل برنباس یہ بتاتی ہے کہ یہودا اسکریوتی جو بارہ حواریوں میں سے ایک تھا اور جس نے غداری کر کے حضرت مسیحؑ کو گرفتار کروایا' اس کی شکل بدل کر حضرت مسیحؑ کی سی کر دی گئی اور وہ پکڑا گیا اور سولی چڑھا — وہ اس کا مستحق تھا کہ غداری کی سزا اسے ملنی چاہیے تھی۔ یہ نہیں کہ کسی بے قصور انسان کو پکڑ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل بنا دی جاتی اور اسے سولی پر چڑھا دیا جاتا — بہرحال اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا اور قوم کو مہلت دے دی۔ وہ مہلت ابھی تک جاری ہے' چل رہی ہے' لیکن قانونِ خداوندی نافذ ہو کر رہے گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے اور انہی کے ذریعے سے ان کی قوم

(بنی اسرائیل) پر عذابِ استیصال نافذ ہوگا۔ اس کا ہونا یقینی ہے اور اس کی خبریں صحیح اور متفق علیہ احادیث میں موجود ہیں' جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ رفعِ مسیحؑ اور نزولِ مسیحؑ یہ دونوں چیزیں ہمارے ایمان ویقین میں شامل ہیں' اس لیے کہ یہ باتیں اتنی واضح اور تواتر سے ثابت ہیں کہ ان کا انکار گویا قرآن وحدیث کا انکار ہو جائے گا — اس کے باوجود ایسے بدبخت لوگ موجود ہیں جو اتنی پختہ بات کا انکار کرتے ہیں —— بہرحال یہ ہونا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام ہی کے ہاتھوں ان کا آخری انجام ہوگا۔ ان میں سے ایک شخص ''مسیح'' ہونے کا دعویٰ کرے گا اور وہ دراصل مسیح الدجال (Anti Christ) ہوگا جسے حضرت مسیح علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے ختم کریں گے۔ اس کے بعد یہودیوں کا قتل عام ہوگا اور کوئی یہودی نہیں بچے گا۔ البتہ عیسائیوں کے پروٹسٹنٹس فرقہ میں سے Evengelists جو آج کل بہت زیادہ فعال ہیں' ان کا ایک رسالہ ''The Philadelphia Trumpt'' امریکہ کے شہر فلاڈلفیا سے نکلتا ہے۔ اس کے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ اسی (۸۰) فیصد یہودی قتل ہو جائیں گے' صرف بیس فیصد باقی بچیں گے۔ یہ بات اس طرح درست ہوسکتی ہے کہ یہودیوں میں سے بیس فیصد حضرت مسیحؑ کی آمد ثانی کے بعد ایمان لے آئیں اور اس طرح وہ بچ جائیں' لیکن جو بھی کفر پر اڑا رہے گا وہ لازماً قتل ہوگا۔ احادیث میں یہاں تک آتا ہے کہ اگر کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو پتھر بولے گا: اے مسلمان بھائی! میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے اسے قتل کرو۔ کسی درخت کے پیچھے چھپے گا تو وہ درخت بھی بولے گا' سوائے ایک درخت ''غرقد'' کے' جس کی انہوں نے اسرائیل میں بڑے پیمانے پر کاشت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہماری احادیث کو جانتے ہیں۔

اس حوالے سے سمجھ لیجیے کہ قانونِ خداوندی ختم نہیں ہوا' بس تھوڑا سا وقفہ ڈال دیا گیا ہے۔ فیصلہ تو سنا دیا گیا ہے' لیکن اس کی تنفیذ (execution) مؤخر کر دی گئی ہے۔ عمل درآمد لازماً ہوگا' لیکن ہوگا حضرت مسیحؑ کے نزول کے بعد جو ان کے رسول تھے۔ دوسری طرف حضرت مسیحؑ جب آئیں گے' رسول اللہ ﷺ کے فرمان: ((یُکَسِّرُ الصَّلِیْبَ

وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيرَ)) کے مطابق صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ یہ دو چیزیں عیسائیوں نے خود گھڑ لی ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر مصلوب ہوئے اور انہوں نے صلیب کو اپنا قومی نشان بنا لیا۔ حضرت مسیحؑ کہیں گے کہ میں تو صلیب ہوا ہی نہیں، تم نے کیا کہانی بنا رکھی ہے؟ لہٰذا صلیب اور عقیدۂ صلیب ختم، چنانچہ عیسائیت بھی ختم۔ اس لیے کہ موجودہ عیسائیت تو قائم ہی عقیدۂ صلیب پر ہے۔ دوسرے یہ کہ ان سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت چلی آ رہی تھی جس میں خنزیر کا گوشت حرام تھا، لیکن انہوں نے حلال قرار دے لیا۔ حضرت مسیحؑ آ کر کہیں گے کہ تم نے غلط کام کیا اور پھر اپنے ہاتھ سے خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ اس طرح عیسائیت بحیثیت مذہب ختم ہو جائے گی اور سب کے سب عیسائی مسلمان ہو جائیں گے۔ اس طرح عیسائی اور مسلمان مل کر ایک اُمت واحدہ بنیں گے اور یہودی سب کے سب قتل ہو جائیں گے۔ ان میں سے اگر کسی کے بچنے کا امکان ہے تو صرف ان کا جو حضرت مسیحؑ کی آمد ثانی کے بعد ایمان لے آئیں گے۔

اُمتِ مسلمہ اور بنی اسرائیل میں مشابہت

اب میں ڈرتے ڈرتے اپنا خیال عرض کر رہا ہوں کہ دو ہزار برس پہلے انہوں نے حضرت مسیحؑ کو اپنے بس پڑتے گویا سولی پر چڑھا دیا تو یہ اسی وقت عذابِ استیصال کے مستحق ہو چکے تھے، پھر ان کو سزا میں دو ہزار سال کا وقفہ کیوں دیا گیا۔ میرے نزدیک اس کی جو توجیہہ ہے (اور ظاہر ہے یہ حتمی اور یقینی بات نہیں ہے) وہ میں بیان کر رہا ہوں۔ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو عذاب بنی اسرائیل پر آئے ہیں وہ سب کے سب امت مسلمہ پر بھی آئیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

''میری اُمت پر بھی وہ سب احوال آ کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی کے مشابہ ہوتی ہے۔''

یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے اور ترمذی شریف کی روایت ہے۔ اس حوالے سے میں نے اپنی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا

ماضی حال اور مستقبل'' میں اُمت مسلمہ اور بنی اسرائیل پر آنے والے عذابوں کا موازنہ (compair) کر کے دکھا دیا ہے۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ہماری اور سابقہ اُمتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ میں حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے' اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دَور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دَور آئے' اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ؎

اِسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

دیکھئے! بنی اسرائیل پر پہلا عذاب آیا شمال سے آشوریوں اور اہلِ بابل کے ہاتھوں' جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝۵﴾

''پس جب ان دونوں میں سے پہلے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے اپنے سخت جنگجو بندے تم پر مسلط کر دیے جو شہروں کے اندر پھیل گئے۔ اور وہ وعدہ پورا ہو کر رہا۔''

بعینہٖ ایسا ہی حال مسلمانوں کا بھی ہوا ہے شمال سے آنے والے عیسائیوں کے ہاتھوں۔ اس صلیبی جنگ میں نہ صرف مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا' بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہود پر دوسرا عذاب مشرق کی جانب سے بخت نصر کے ہاتھوں آیا' جبکہ مسلمانوں پر بھی دوسرا عذاب مشرق کی جانب سے تاتاریوں کے ہاتھوں آیا اور اس فتنۂ تاتار نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیے اور بالآخر بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے' بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی' اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم وبیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی

تھی۔اس کے بعد یہودیوں پر عذاب آیا سکندرِ اعظم اور سلوکس‘ جو بعد میں سکندر کا سپہ سالار بنا تھا‘ کے ہاتھوں اور پھر اس کے بعد رومیوں کے ہاتھوں۔اسی طرح اس اُمت پر بھی عذاب آیا ہے مغربی یورپی ممالک (برطانیہ‘ فرانس‘ اٹلی‘ سپین) کے ہاتھوں۔اس کے بعد پچھلی صدی میں یہودیوں پر آخری عذاب ''ہولوکاسٹ'' آیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کو جرمنوں نے قتل کیا۔اگر یہ تعداد ساٹھ لاکھ کے بجائے چھ لاکھ بھی ہو تو بھی بہت بڑا عذاب ہے۔یہ عذاب ابھی اس اُمت پر آنا ہے اور میں ڈرتے ڈرتے کہہ رہا ہوں کہ یہ عذاب اُمت کے بہترین حصہ پر آئے گا اور وہ اہلِ عرب‘ اُمیین اور بنی اسماعیل ہیں۔

اس وقت پوری اُمت مسلمہ مجرم ہے‘ اس لیے کہ دنیا کے کسی ایک کونے میں بھی ہم نے اسلام کو بطورِ نظام نافذ نہیں کیا۔ہم دنیا والوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی یہاں موجود ہے‘ اپنی آنکھوں سے آ کر مشاہدہ کرلو‘ اس کی برکات آ کر دیکھ لو۔اس روئے ارضی کے ایک انچ پر بھی ہم اسلام کو نافذ نہیں کر سکے۔تو پوری امت مسلمہ بحیثیت مجموعی مجرم ہے‘ لیکن عربوں کی حیثیت سب سے بڑے مجرموں کی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر عربوں کے لیے تو قرآن اجنبی زبان میں ہے‘ جبکہ عربوں کی تو اپنی زبان میں قرآن ہے۔اس کے ساتھ ان کو ایک رتبہ بھی ملا تھا کہ نبی آخر الزماں ﷺ ان میں سے تھے۔ ؏ ''جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق جن کا مقام اونچا ہوتا ہے ان کا محاسبہ بھی سخت ہوتا ہے۔اس لیے وہ بڑے مجرم ہیں اور زیادہ عذاب کے مستحق ہیں۔یہ عذاب تیسری جنگ عظیم کی صورت میں عربوں پر یہودیوں کے ہاتھوں آنا ہے۔اس جنگ کو احادیث مبارکہ میں ''المَلحَمة العُظمٰی'' اور بائبل میں ہرمجدون (Armageddon) کہا گیا ہے۔آپ اخباروں میں پڑھتے رہتے ہیں کہ اس کے لیے فضا تیار ہو رہی ہے۔جنگ کا میدان مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک بنیں گے۔یورپ تو پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنا حصہ ادا کر چکا‘ بایں طور کہ ان جنگوں میں کروڑوں یورپین قتل ہوئے۔وہ کہتے ہیں کہ اب جو تیسری جنگ ہو گی وہ ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں ہو گی اور اس جنگ میں پہلی دو جنگوں سے زیادہ لوگ قتل ہوں گے۔

احادیث میں تو یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ اگر ایک شخص کے سو بیٹے ہوں گے تو ننانوے قتل ہو جائیں گے' صرف ایک بچے گا۔ اسی طرح حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ زمین پر اتنی لاشیں پڑی ہوں گی کہ ایک پرندہ اڑتا چلا جائے گا 'اڑتا چلا جائے گا' مگر اسے اتنی جگہ بھی نہیں ملے گی کہ زمین پر اُتر سکے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں ہوں گی' یہاں تک کہ تھک ہار کر اس کے بازو شل ہو جائیں گے تو وہ لاشوں پر ہی گرے گا۔ ایک تو مردار خور پرندے ہوتے ہیں جو لاشوں پر جھپٹتے ہیں اور مردار کھاتے ہیں' وہ چاہے کوے ہوں یا گدھ ہوں' لیکن جو نفاست پسند پرندہ ہے وہ کبھی بھی گندگی پر نہیں اترتا۔

ایسا کیوں ہوگا؟ اس کے لیے میری توجیہہ یہ ہے کہ اس اُمت کو تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے اور امت کا بہترین حصہ اہل عرب ہیں۔ آج عرب ممالک میں ارب ہا ارب ڈالر کے محل بنائے جا رہے ہیں۔ سیون سٹار ہوٹل عرب ممالک میں بن رہے ہیں جہاں پر داخلہ کئی سو ڈالر دے کر ہوتا ہے۔ اس طرح انہوں نے اپنی ساحلی سڑکیں اس خوبصورتی سے سجائی ہیں کہ اس قدر حسین مناظر میں نے پورے امریکہ میں کہیں نہیں دیکھے۔ یہ سب نبی اکرم ﷺ کی پیشین گوئی کے عین مطابق ہے۔ آپ ﷺ نے اہلِ عرب کے حوالے سے فرمایا تھا: ((يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ)) ''یہ اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔''

اس اُمت کے افضل حصہ پر جو اللہ کا عذاب آنا ہے وہ ان یہودیوں کے ہاتھوں آئے گا۔ عربوں کی پیٹھ پر عذاب کا کوڑے پڑے گا اور عرب میں لاشیں ہی لاشیں ہوں گی۔ اس حوالے سے مولانا اصلاحی صاحب ایک کہاوت بیان کیا کرتے تھے۔ ان کے علاقے میں ایک رواج تھا کہ اگر کوئی راجپورت نوجوان بڑی گری ہوئی حرکت کرتا تھا تو اس کے سر پر چمار کے ہاتھوں جوتے لگوائے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ راجپوت کے سر پر اگر راجپوت کا جوتا پڑے تو تکلیف تو ہوتی ہے لیکن اتنی بے عزتی محسوس نہیں ہوتی' جبکہ جب چمار کا جوتا پڑے گا تو اس کو انگریزی میں کہتے ہیں to add insult to injury یعنی جوتے لگنے کی جو تکلیف ہوتی ہے وہ تو ہوتی ہے لیکن اس تکلیف کے ساتھ ساتھ

بے عزتی (insult) بھی ہے۔ اسی طرح یہودی دین الٰہی کے اعتبار سے چمار ہیں' مغضوب علیہم قوم ہیں۔ دوسری طرف اہل عرب انسانوں میں سے افضل ترین ہیں' اس لیے کہ ان ہی میں سے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جو تمام انبیاء و رسل میں افضل ترین ہیں۔ الغرض افضل ترین انسانوں کو ان چماروں کے ہاتھوں سزا دی جائے گی۔ اس میں تکلیف تو ہو گی ہی' لیکن ایک طرح کی ہتک (insult) بھی ہو گی۔ میری رائے کے مطابق اللہ نے یہودیوں کو جو تھوڑی سی مہلت دی ہے تو یہ مسلمانوں کی آزمائش کے لیے ہے۔

عظیم تر اسرائیل ہی یہود کا عظیم تر قبرستان بنے گا

اس کے بعد یہود عرب اور مشرق وسطیٰ پر چھا جائیں گے اور "عظیم تر اسرائیل" وجود میں آئے گا ــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسرائیل ابھی بہت چھوٹا سا ملک ہے اور وہاں پر صرف تیس پینتیس لاکھ یہودی ہیں' جبکہ پوری دنیا میں ان کی تعداد سوا کروڑ ہے' اور ظاہر بات ہے کہ سوا کروڑ اس چھوٹے سے ملک میں تو نہیں سما سکتے' ان کو ایک گریٹر اسرائیل چاہیے۔ پہلے تو ان کا کہنا تھا کہ دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ اسرائیل بنے گا' لیکن عراق جنگ کے بعد شیرون نے کہا ہے کہ اب ہمارا مطالبہ دریائے نیل سے دجلہ تک کا ہے۔ عظیم تر اسرائیل کا نقشہ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر آویزاں ہے۔ اس نقشے کے مطابق پورا فلسطین' پورا شام' عراق (کم از کم دجلہ تک)' مصر کا انتہائی زرخیز دریائے نیل کے ڈیلٹا کا علاقہ' ترکی کا جنوبی حصہ اور سعودی عرب کا بھی شمالی حصہ بشمول مدینہ' یہ سب گریٹر اسرائیل کا حصہ بنیں گے۔ یہ لوگ مکہ کو اس میں شامل نہیں کرتے مگر مدینہ کو کرتے ہیں' جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ لوگ مدینہ میں داخلے کی کوشش ضرور کریں گے مگر اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے گا اور یہ اس میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔

اس طرح ایک گریٹر اسرائیل وجود میں آئے گا اور پھر ساری دنیا سے تمام یہودیوں کو جھاڑ و پھیٹر کر یہاں جمع کر لیا جائے گا۔ اس کا ذکر بھی سورۃ بنی اسرائیل میں موجود ہے: ﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا﴾ "پس جب آخرت کا

وعدہ آ جائے گا تو ہم تمہیں لپیٹ کر لے آئیں گے''۔ اس کے بعد یہودیوں پر عذابِ استیصال آئے گا اور ''عظیم تر اسرائیل'' ہی یہودیوں کا ''عظیم تر قبرستان'' بنے گا۔

اَقُولُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

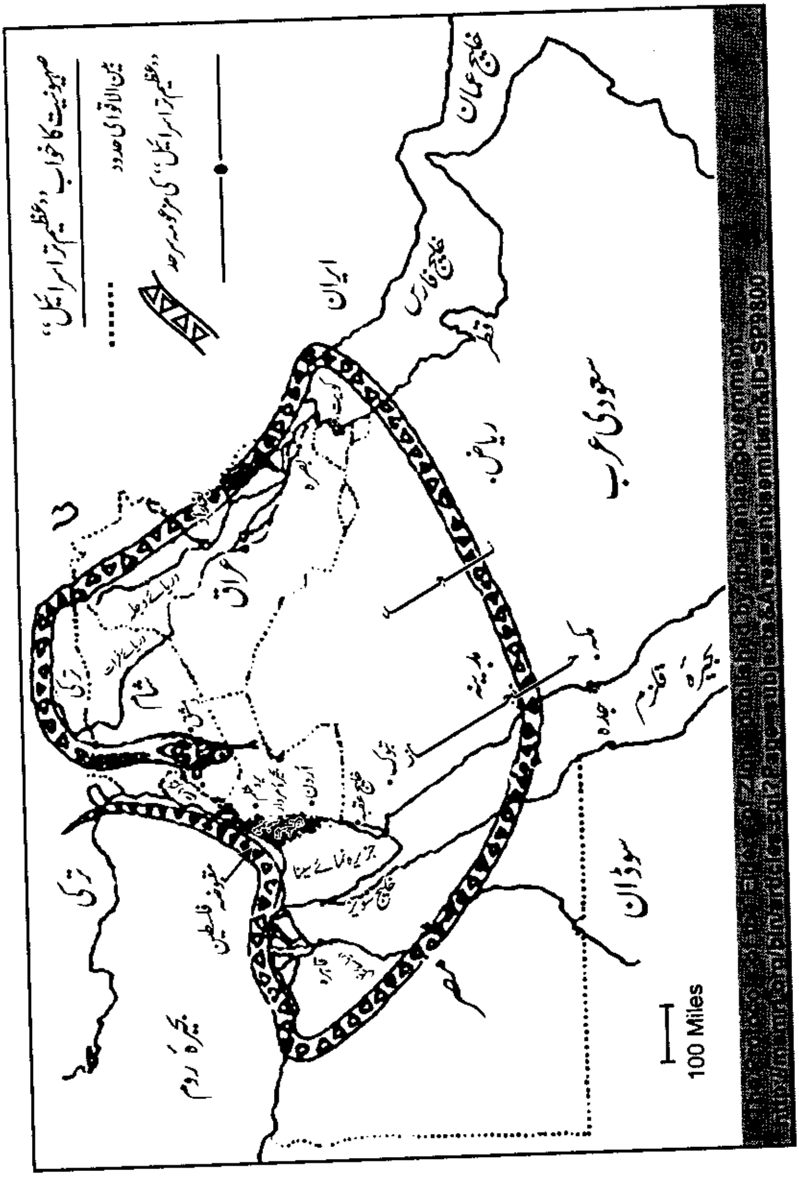

حدیث
9

اطاعتِ رسول کی فرضیت
اور کثرتِ سوال کی ممانعت

۱۶/نومبر ۲۰۰۷ء کے خطبہ جمعہ کا بقیہ حصہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷)

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ صَخْرٍ ﷛ قَالَ : سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ :

((مَا نَھَیْتُکُمْ عَنْہُ فَاجْتَنِبُوْہُ ، وَمَا اَمَرْتُکُمْ بِہٖ فَافْعَلُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، فَاِنَّمَا اَھْلَکَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کَثْرَۃُ مَسَائِلِھِمْ وَاخْتِلَافُھُمْ عَلٰی اَنْبِیَائِھِمْ))(۱)

سیدنا ابو ہریرہ عبدالرحمٰن بن صخر ﷛ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

''میں تمہیں جس کام سے منع کروں اس سے باز رہو اور جس کام کا حکم دوں اسے بقدر استطاعت بجا لاؤ ـــــ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوالات اور انبیاء سے حجت بازی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔''

معزز سامعین کرام!

یہ امام یحییٰ بن شرف الدین النووی ؒ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' کی حدیث ۹ ہے۔ اس حدیث میں مذکور مضمون اس سے پہلے حدیث ۴ میں بھی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ۔ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب توقیرہ وترک اکثار سؤالہ...... واللفظ لہ۔

ہم پڑھ چکے ہیں' جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ ' وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ ' وَبَیْنَهُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ لَا یَعْلَمُهُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ)) ''حلال بالکل واضح ہے اور حرام بھی بالکل واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کے (شرعی حکم) کے بارے میں لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی'' ــــ یعنی حلال وحرام کے علاوہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں انسان شک میں پڑ جاتا ہے کہ پتا نہیں یہ شے حلال ہے یا نہیں ــــ ان مشتبہ چیزوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ وَعِرْضِهٖ ' وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ)) ''پس جو شخص اس قسم کی غیر واضح اشیاء سے بچ گیا اُس نے اپنے دین اور عزت کو بچالیا اور جو شخص اس قسم کے مشتبہ امور کو اختیار کرنے لگے تو وہ حرام میں جا پڑے گا'' ــــ اس حدیث کے ضمن میں' میں عرض کر چکا ہوں کہ جس شے کو کتاب وسنت کے دلائل اور نصوص سے حرام ثابت نہ کیا جا سکے' وہ قانوناً حلال ہے۔ اصول یہ نہیں ہے کہ جس شے کو حلال ثابت نہ کیا جا سکے وہ حرام ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو حلال کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا۔ لہٰذا جو چیز ازروئے قرآن وسنت حرام ثابت نہیں ہوتی تو وہ قانوناً حلال اور جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز ایسی ہے جس کا شرعی حکم واضح نہیں ہے تو اس کے بارے میں تقویٰ کا پہلو یہ ہے کہ اپنے دین کو بچانے کے لیے ان مشتبہات سے بھی بچا جائے۔

زیر مطالعہ حدیث میں یہی بات بیان کی جا رہی ہے۔ اس روایت کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ــــ یہاں ان کی کنیت کے ساتھ ان کا نام عبدالرحمٰن بن صخر بھی مذکور ہے ــــ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ((مَا نَهَیْتُکُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوْهُ)) ''جس کام سے میں نے تمہیں روک دیا ہے اس سے بچو'' ((وَمَا اَمَرْتُکُمْ بِهٖ فَافْعَلُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ)) ''اور جس کام کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اپنے مقدور بھر اس پر عمل کرو'' ــــ بعینہٖ یہ مضمون سورۃ الحشر کی آیت ۷ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿وَمَآ اٰتٰـکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰـکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ ''اور جو چیز تم کو پیغمبرؐ دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز رہو'' ــــ آگے حضور

اکرم ﷺ نے اوامر ونواہی کے سلسلے میں مین میخ نکالنے اور بال کی کھال اتارنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: ((فَاِنَّمَا اَهْلَكَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى اَنْبِيَائِهِم)) ''(یہ یاد رکھو کہ) تم سے پہلی قوموں کو اس چیز نے ہلاک کیا کہ وہ بہت سوال کرتے تھے اور اپنے انبیاء سے حجت بازی کرتے تھے۔''

یہاں دو چیزوں سے روکا گیا ہے: (۱) کثرتِ سوال' اور (۲) انبیاء سے حجت بازی۔ کثرتِ سوال کے حوالے سے اقوامِ سابقہ کا معاملہ یہ تھا کہ ان کے نبیؑ جب بھی کوئی حکم دیتے تو وہ کہتے: حضرت! اگر اس طرح ہو جائے تو کیا ہوگا اور اگر یوں ہو جائے گا تو پھر کیا ہوگا؟ اس طرح کے بے تکے سوالات سے روکا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کے رسول نے بات کھلی چھوڑی ہے اور تمہیں ایک آزادی دے رکھی ہے تو تم یوں سوالات کر کے لوگوں کے لیے دین کا دائرہ تنگ کرا لو گے۔ جیسا کہ ایک بڑی مشہور حدیث ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: ((يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الْحَجَّ فَحُجُّوْا)) ''اے لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے' پس تم حج کرو''۔ ایک شخص نے کہا: یا رسول اللہ! کیا یہ ہر سال فرض ہے؟ آپؐ خاموش رہے۔ اس نے تین مرتبہ یہی سوال کیا تو تیسری بار آپؐ نے فرمایا: ((لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَّا اسْتَطَعْتُمْ))(۱) ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو پھر حج ہر سال فرض ہو جاتا خواہ تم اس کی طاقت نہ رکھتے''۔ بعض روایات میں تو یہاں تک آتا ہے کہ جب اس شخص نے سوال کیا تو نبی اکرم ﷺ نے ادھر سے رخ پھیر لیا۔ وہ گھوم کر اُدھر آ گیا اور پھر وہی سوال دہرایا۔ حضور ﷺ نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے' لیکن جب اس نے تیسری مرتبہ وہی سوال دہرایا تو آپؐ نے اسے ڈانٹ دیا اور فرمایا کہ اگر میں ہاں کہہ دوں تو یہ تم پر ہر سال فرض ہو جائے گا اور تم اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ لہٰذا تم اس طرح کے سوالات کر کے شریعت کا دائرہ تنگ کیوں کر دینا چاہتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وسیع رکھا ہے۔ چنانچہ پوری

(۱) صحيح مسلم' كتاب الحج' باب فرض الحج مرة في العمر۔

زندگی میں شرعاً ایک ہی مرتبہ حج فرض ہے اور اگر کسی کے لیے ہر سال حج کرنا ممکن ہو تو وہ ہر سال حج کرے۔

اصل میں کچھ لوگوں کا ذوق اور مزاج ایسا ہوتا ہے کہ وہ تکلف اور تقشّف کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس کے لیے ''تقویٰ کا ہیضہ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ جو شے کھلی حرام ہے اس سے بچو اور جو مشتبہ چیزیں ہیں ان کے بارے میں اپنے دل سے پوچھ کر فیصلہ کرو۔ جیسے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ((اِسْتَفْتِ نَفْسَکَ' اِسْتَفْتِ قَلْبَکَ)) ''تم اپنے نفس سے پوچھو' تم اپنے دل سے پوچھو!'' اور پھر آخر میں فرمایا: ((وَاِنْ اَفْتَاکَ النَّاسُ وَاَفْتَوْکَ))(۱) ''اگرچہ لوگ اس کے بارے میں تمہیں کچھ بھی فتویٰ دیں''۔ یعنی اگر کوئی مفتی کہہ دے کہ یہ جائز ہے' لیکن تمہارا دل اس پر مطمئن نہ ہو تو تم اسے چھوڑ دو اس لیے کہ اللہ کا ایک مفتی' جو تمہارے جسم میں دل کی صورت میں موجود ہے' وہ اس کے خلاف فتویٰ دے رہا ہے۔

اس ضمن میں نورالدین زندگی کے بیٹے کا واقعہ بھی میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ تمام مکاتب فکر کے مفتیوں کے فتوے آگئے کہ جان بچانے کے لیے شراب پی جا سکتی ہے' لیکن نورالدین زندگی کے تقویٰ کا عالم ملاحظہ ہو کہ فتویٰ آ جانے کے بعد بھی اس کو تسلی نہ ہوئی۔ اس نے مفتیانِ کرام کو بلایا اور کہا: اگر اللہ میرے بیٹے کو شفا دینا چاہے تو کیا وہ شراب کا محتاج ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! اور اگر اللہ کی مشیت میں میرے بیٹے کی موت کا وقت آ گیا ہے تو کیا شراب اسے بچا لے گی؟ انہوں نے کہا: نہیں! اُس اللہ کے بندے نے کہا: اپنے یہ فتوے اپنے پاس رکھو! چنانچہ اس نے اپنے بیٹے کی قربانی دے دی مگر اسے شراب نہیں پلوائی۔ یہ تو تقویٰ کا انداز ہے کہ جب دل مطمئن نہیں ہے تو حرام شے کو جان بچانے کے لیے بھی استعمال نہیں کیا' جبکہ اس کے برعکس بعض لوگ تکلف اور تقشّف کرتے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تو ان کے ہاں فتوے

(۱) سنن الدارمی' کتاب البیوع' باب دع ما یریبك الی ما لا یریبك۔

ہوتے ہیں اور بڑے بڑے صریحاً حرام کو وہ هَنِيئًا مَرِيئًا کھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی نے رفع یدین نہیں کیا تو اس کی نماز باطل ہونے کا فتویٰ فوراً صادر ہو جائے گا' جبکہ سود کے بارے میں کوئی پروا نہیں ہے' تم بھی کھاؤ' میں بھی کھاؤں گا' نہ میں تمہیں ٹوکوں گا اور نہ تم مجھے ٹوکو گے۔ آج کل ایسی ہی صورت حال ہے کہ ذرا سا اختلاف یا ذرا سا کوئی فرق سامنے آ جائے تو خاص مذہبی ذہنیت کے حامل لوگ یک دم آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے حضرت مسیح علیہ السلام کا بہت ہی خوبصورت تبصرہ ہے۔ انہوں نے یہودی علماء سے یہ کہا تھا: ''اے فریسیو! تمہارا حال یہ ہے کہ تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو''۔ بعینہٖ یہی ہوتا ہے جب اس قسم کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دوسری بات جس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا' وہ ہے: ((وَاخْتِلَافُهُمْ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ))۔ میرے نزدیک اس کا ترجمہ ''انبیاء سے اختلاف'' ذرا مناسب نہیں ہے' جبکہ اس کا صحیح اور مناسب ترجمہ ''انبیاء سے حجت بازی'' کرنا ہے' یعنی سوال پر سوال کر کے حجت بازی کرنا اور شریعت کے دائرے کو محدود کراتے چلے جانا' اس سے روکا گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ایک مسلمان جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھا اس کی فقہی معلومات ہمارے مفتیوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے کہ اس وقت تو اصل دین یہ تھا کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے تَن مَن دھن لگا دو اور نماز پڑھ لو۔ کبھی حضور ﷺ کو رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا ہے تو کر لو اور کبھی دیکھا ہے کہ آپؐ نے رفع یدین نہیں کیا تو آپ بھی مت کرو' کوئی فرق واقع نہیں ہوتا — ایک بدو صحابی دُور سے آئے اور انہوں نے حضور ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ آپؐ نے گریبان کے بٹن بند نہیں کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے ساری عمر اپنی قمیص کے بٹن بند نہیں کیے۔ ٹھیک ہے یہ اُن کا اپنا ذوق ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو اسی حال میں دیکھا اور عمر بھر اسی پر عمل پیرا رہے' لیکن اس سے آگے بڑھ کر فروعی معاملات پر بحث و تمحیص اور پھر ان میں ایک دوسرے سے اختلاف لائقِ تحسین نہیں' بلکہ فتنہ پیدا کرنے والا رویہ ہے۔ ہمارے ہاں جو فقہی اختلاف اور اس میں جو شدت ہے وہ آج سے نہیں ہے' بلکہ یہ شدت تو ابتدا سے ہے۔ امام

ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دور کے غیر حنفی فقہاء امام صاحب سے اس درجے نفرت کرتے تھے کہ ان کا نام تک لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ان کی کتابوں میں اکثر آپ کو قَالَ رَجُلٌ کُوْفِیٌّ (ایک کوفی شخص نے کہا) کے الفاظ ملیں گے۔ بھئی ان کا نام تو لیں اور اگر آپ ان کی بات رد کرنا چاہتے ہیں تو دلیل سے رد کریں۔ فقہی اختلاف کی یہ شدت ہمارے ہاں بہت جلدی پیدا ہو گئی تھی' جبکہ اب تو فرقہ پرستی اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے کہ لوگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے ضال اور مضل ہونے کے فتوے ہیں' کفر کے فتوے ہیں۔ اس ساری صورتحال کا سبب اوامر و نواہی میں مین میخ نکالنا ہے۔

اس حوالے سے درست رویہ یہ ہے کہ موٹی موٹی باتیں جن کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے ان پر عمل پیرا ہوا جائے اور جن چیزوں سے روک دیا ہے ان سے رک جایا جائے۔ باقی یہ کہ ان کے اندر بہت زیادہ مین میخ نکالنا' بال کی کھال اتارنا' بہت تفصیلات کے اندر جانا' درحقیقت یہ وہ چیزیں ہیں جس سے دین میں تنگی پیدا ہوتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (آیت ۱۵۷) یعنی جب ہمارے نبی اُمی آئیں گے تو وہ لوگوں کو ان بوجھوں سے نجات دلائیں گے جو ان کے کندھوں پر ہوں گے اور ان کی گردنوں میں جو طوق پڑے ہوں گے ان سے بھی نجات دلائیں گے۔

یہودیوں میں قانون کے اندر باریک بینی اور مین میخ کی عادت بہت زیادہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بنی اسرائیل کا ایک شخص قتل ہو گیا تو اس کے قاتل کے بارے میں جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک گائے قربان کرنے کا حکم دیا۔ لیکن انہوں نے اس گائے کے بارے میں سوال کر کے اور اس کی تفصیلات پوچھ کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر لیں ☆۔ تو یہ ساری چیزیں وہ اَغلال اور بوجھ تھے جو لوگوں کے اوپر ڈال دیے گئے تھے۔

☆ محترم ڈاکٹر صاحبؒ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ ◄

اس ضمن میں ایک پتے کی بات اور بھی ہے' وہ یہ کہ علماء کو تو ''باب الحیل'' بھی معلوم ہے' یعنی ہر مشکل سے نکلنے کا راستہ آ تا ہے۔ مرتا تو عام آدمی ہے' اس لیے کہ اُسے حیلے معلوم نہیں ہیں' جبکہ علماء تو اپنے لیے حیلے تلاش کر لیتے ہیں۔ اس کی مثال ملاحظہ کیجیے کہ دربارِ اکبری کے نورتن ابوالفضل اور فیضی کے بارے میں آتا ہے کہ جب گیارہ مہینے گزر جاتے تو اپنا پورا مال اپنی بیویوں کے نام کر دیتے تاکہ ''حولانِ حول'' نہ ہو (یعنی مال پر پورا سال نہ گزرے) اور زکوٰۃ نہ دینی پڑے' اور پھر جب بیویوں کے قبضے میں گیارہ مہینے ہو جاتے تو وہ واپس اپنے شوہروں کے نام کر دیتیں۔ یہ حیلے بہانے کرنے والے وہ علماء ہیں جن میں سے ایک نے بے نقط تفسیر لکھی ہے' یعنی وہ قرآن کا اتنا بڑا عالم تھا کہ کوئی نقطے والا حرف اس تفسیر میں شامل نہیں کیا —— آپ کو معلوم ہے کہ بعض حروفِ تہجی مثلاً ب' ت' ث نقطے والے ہیں' جبکہ بعض مثلاً ح' د' س وغیرہ بغیر نقطے والے ہیں' تو اس کی تفسیر میں کوئی نقطے والا حرف نہیں ہے—— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس ایک طرف تو قرآن مجید کا وسیع علم تھا اور دوسری طرف لغت کا بھی وہ ماہر تھا۔ پھر یہی دونوں بھائی تھے جنہوں نے چٹے اَن پڑھ اکبر کو ''دینِ الٰہی'' کا سبق پڑھایا تھا' جیسے غلام احمد قادیانی کو جو کچھ پڑھایا' وہ حکیم نور الدین نے پڑھایا جو بہت بڑا اہلِ حدیث عالم تھا۔ ورنہ خود غلام احمد قادیانی کی اپنی کوئی علمی حیثیت نہیں تھی۔

◀ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے حکم دیا کہ یک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مردہ شخص کے جسم پر مارو تو وہ جی اُٹھے گا اور بتا دے گا کہ میرا قاتل کون ہے...... بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تو ان کے دلوں میں جو بچھڑے کی محبت اور گائے کی تقدیس جڑ پکڑ چکی تھی اس کے باعث انہوں نے اس حکم سے کسی طرح سے بچ نکلنے کے لیے مین میخ نکالنی شروع کی اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے کہ وہ کیسی گائے ہو؟ اس کا کیا رنگ ہو؟ کس طرح کی ہو؟ کس عمر کی ہو؟ بالآخر جب ہر طرف سے اُن کا گھیراؤ ہو گیا اور سب چیزیں ان کے سامنے واضح کر دی گئیں تب انہوں نے چار و ناچار بادلِ نخواستہ اس حکم پر عمل کیا۔''

(بیان القرآن' جلد اول' سورۃ البقرہ)

بہر حال حضور اکرم ﷺ نے ہمیں دین کی واضح تعلیمات پر عمل کرنے اور حجت بازی اور کثرتِ سوال سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس چیز سے میں تمہیں روکوں اس سے باز آ جاؤ اور جس کام کا حکم دو تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کے لیے کوشش کرو، اور اَحکامِ دین میں بلاوجہ مین میخ نہ نکالو، اس لیے کہ تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں سے بہت زیادہ سوال کرنے اور حجت بازی کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرزِ عمل سے محفوظ رکھے۔ آمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

حدیث
11
12

تقویٰ اور اس کی عملی شکلیں

۴/ جنوری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝ (آل عمران)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ (التحریم)

عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدٍ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ ــ سِبْطِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرَيْحَانَتِهٖ ــ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا ـ قَالَ : حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ :

((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ)) (۱)

رسول اللہ ﷺ کے نواسے اور آپ کی خوشبو ابو محمد سیدنا حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان حفظ کر رکھا ہے:

''جو بات تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے ترک کر دو اور جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اسے اختیار کرو۔''

(۱) سنن الترمذی' ابواب صفة القيامة والرقائق والورع'باب منه۔قال ابوعیسیٰ هذا حديث حسن صحيح۔ وسنن النسائی'كتاب الاشربة'باب الحث علىٰ ترك الشبهات۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ﷺ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ)) (۱)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''انسان کے حسن اسلام (یعنی اسلام کی خوبی) میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ان کاموں کو ترک کر دے جن کا کوئی فائدہ نہیں۔''

معزز سامعین کرام!

ان سلسلہ ہائے خطابات میں امام یحییٰ بن شرف النوویؒ کے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' کا سلسلہ وار مطالعہ کرایا جا رہا ہے اور آج میں نے درسِ حدیث کے سلسلے کو آگے بڑھانا ہے —— اس سے قبل ''اربعین نووی'' کی دس احادیث ہم پڑھ چکے ہیں اور آج ان شاء اللہ اس نشست ہم حدیث نمبر ۱۱ اور ۱۲ کا مطالعہ کریں گے —— میرا معمول ہے کہ میں اکثر و بیشتر زیر مطالعہ حدیث سے متعلق کوئی قرآنی آیت ضرور تلاوت کرتا ہوں۔ آج میں نے جو آیات تلاوت کی ہیں ان کا مرکزی مضمون ہے: ''تقویٰ''۔

تقویٰ کے بارے میں قرآن کی تاکیدی آیت

تقویٰ کے بارے میں میرے نزدیک قرآن مجید کی سب سے زیادہ گاڑھی اور تاکیدی آیت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ ہے جس میں فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ''اے ایمان والو! (ایمان کے دعوے دارو!) اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے'' —— اس آیت کے نازل ہونے پر اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پریشان ہو گئے کہ کون ہے جو اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکے گا کون ہے جو اللہ کی عبادت اور اللہ کی معرفت کا حق ادا کر سکے گا جبکہ حضور اکرم ﷺ خود فرما رہے ہیں: ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ)) ''اے رب! ہم تجھے پہچان نہیں پائے جیسا کہ تیرے پہچاننے کا حق تھا'' ((وَمَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ)) ''اور ہم تیری بندگی نہیں

(۱) سنن الترمذی ابواب الزهد باب فیمن تکلم بکلمة یضحك بها الناس۔ ومسند احمد کتاب مسند اهل البیت باب حدیث الحسین بن علی۔ ح ۱۷٤٦۔

کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق تھا''—— ایک طرف حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان اور دوسری طرف سورۂ آل عمران کی مذکورہ آیت۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا گھبرانا بجا تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ اللہ کی معرفت' عبادت اور تقویٰ حق ادا نہ کر سکے تو پھر اللہ کے تقویٰ کا حق کون ادا کر سکتا ہے!

میں بار ہا عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا قرآن کا پڑھنا' سننا کچھ اور طرح کا ہے' جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب قرآن پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کا انداز کچھ اور ہوتا تھا۔ وہ قرآن کو پڑھتے اور سنتے ہوئے اپنے آپ کو تولتے رہتے تھے کہ ہم اس پر پورے اتر سکتے ہیں یا نہیں! اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے پیش نظر ''عمل'' تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے کہ اس آیت پر عمل کرنا اور اس پر پورا اُتر جانا تو ناممکنات میں سے ہے۔

اسی طرح جب سورۃ الانعام کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''اب دونوں فریقوں (یعنی ایک موحدین کا گروہ ہے اور ایک مشرکین کا' تو ان) میں سے امن کا مستحق کون ہے؟ (یعنی کس کو دلی اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے؟ بتاؤ) اگر تم سمجھ رکھتے ہو!''—— جیسا کہ قرآن مجید کا عام اسلوب ہے کہ پہلے سوال کیا جاتا ہے اور پھر جواب بھی اللہ خود دیتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوال کرنے سے ذہن بیدار ہو کر غور و فکر شروع کر دیتا ہے اور پھر اس کے سامنے اصل جواب آ جاتا ہے۔ تو یہاں بھی اگلی آیت میں اس کا جواب دے دیا گیا—— فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان میں کسی ظلم کی آمیزش نہیں ہونے دی' اُن کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔''

یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا گئے اور حضور ﷺ سے کہنے لگے کہ ایسا کون شخص ہو گا جس کی زندگی کے اندر ظلم کی آمیزش نہ ہو۔ بسا اوقات ہم اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں' اپنے نفسوں پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں یا بغیر کسی ارادے' نیت اور وجہ کے ہم کسی کے ساتھ ایسا معاملہ کر

بیٹھتے ہیں جو ظلم کے دائرے میں آتا ہے' تو پھر کون ہے جو ظلم سے بچے گا اور امن کا مستحق کون ہوگا؟ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: یہاں ظلم سے مراد ''شرک'' ہے اور سورۂ لقمان کی آیت پڑھی: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ ''یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔ اس اعتبار سے سورۃ الانعام کی مذکورہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو شخص ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہ ہونے دے تو اس کے لیے امن اور دلی سکون ہے۔

اسی طرح کا معاملہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ کا تھا کہ صحابہؓ کو تشویش ہوئی کہ کون اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کرسکتا ہے؟ مگر اس کے بعد جب سورۃ التغابن کی آیت: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) ''اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہاری استطاعت میں ہے'' — نازل ہوئی تب صحابہ کو اطمینان ہوا کہ اپنی امکانی حد تک تو ہم اللہ کا تقویٰ اختیار کر سکتے ہیں۔ یعنی جتنی بھی ہمارے اندر طاقت ہے اس حد تک تو ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کر سکتے ہیں مگر یہ کہ اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کرنا جیسا کہ اس کے ادا کرنے کا حق ہے' یہ بہر حال ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح میں نے سورۃ التحریم کی یہ آیت بھی خطاب کے شروع میں تلاوت کی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (التحریم)

''مؤمنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو آتش (جہنم) سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں' اللہ ان کو جو ارشاد فرماتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم ان کو ملتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں۔''

اس آیت میں سب سے پہلے آتش جہنم سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم ہے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: ((اُوْصِيْكُمْ وَنَفْسِيْ بِتَقْوَى اللّٰهِ

عَزّ وجلّ)) ''میں تمہیں وصیت کر رہا ہوں اور اپنے نفس کو بھی کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!''

احادیث میں تقویٰ کی عملی شکلوں کا بیان

بعض احادیث میں تقویٰ کی عملی شکل سامنے آتی ہے اور آج ہمارے زیر مطالعہ جو دو احادیث ہیں ان میں بھی تقویٰ کی عملی شکل بیان ہوئی ہے۔ اس سے پہلے اربعین نووی کی حدیث ۶ میں بھی تقویٰ کی عملی شکل کا بیان تھا جس میں فرمایا گیا: ((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ ، وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ ، وَبَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ)) یعنی حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، لیکن ان دونوں کے مابین کچھ مشتبہات بھی ہیں، جن کے بارے میں کچھ شک سا ہو جاتا ہے کہ پتا نہیں یہ حلال ہیں یا حرام! اور ان کے حکم کے بارے میں قرآن یا سنت کی کوئی واضح نص موجود نہیں تو اب جو شخص واقعتاً تقویٰ کا حق —— کسی بھی درجے میں، چاہے وہ درجۂ استطاعت ہی کیوں نہ ہو —— ادا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ شبہات کو ترک کر دے۔ یہ نہ ہو کہ مشکوک چیز سے یہ سوچ کر فائدہ اٹھائے کہ اس کی حرمت ثابت نہیں ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو قانون یہی ہے کہ جس شے کی حرمت ثابت نہیں وہ حلال اور مباح ہے۔ یعنی قانون کے دائرے کو تو وسعت دے دی گئی ہے، لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ جس کے حلال ہونے کا ثبوت نہیں ہے آپ اس سے بچ جائیں۔ لہٰذا جو شبہات سے بچ جائے گا وہ اپنے دین اور اپنی عزت و ناموس کو بچا لے گا۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

تقویٰ کا تقاضا: مشتبہات سے بچنا

اسی طرح آج جو دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ ہیں ان میں بھی تقویٰ کی عملی شکل بیان ہوئی ہے۔ پہلی حدیث کے راوی رسول اللہ ﷺ کے چہیتے اور نہایت محبوب نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہیں —— اس روایت میں حضرت حسنؓ کی کنیت بھی دی گئی اور ولدیت بھی: عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ۔ ابو محمد ان کی کنیت اور ولدیت علی بن ابی طالب ہے۔ اسی طرح روایت کے ابتدا میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دو اوصاف

بھی بیان ہوئے ہیں: سِبْطِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرَيْحَانَتِهٖ یعنی حضرت حسن اللہ کے رسول ﷺ کے نواسے اور ان کی خوشبو ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی سیرت و کردار کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں بھی محسوس کیا جا سکتا تھا — آگے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا میں تثنیہ کی ضمیر اس لیے استعمال کی گئی کہ حضرت حسن بھی صحابی ہیں اور آپ کے والد حضرت علی بھی صحابی ہیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حَفِظْتُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: ''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے ایک بات یاد کر لی'' وہ بات یہ ہے: ((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ)) ''اُس چیز کو چھوڑ دو جو تمہارے دل میں شک پیدا کر دے اور اس چیز کو اختیار کرو جو تمہارے اندر شک پیدا نہ کرے''۔ اس ضمن میں ہماری اردو زبان میں ایک اچھا لفظ ہے: ''خلجان''۔ اس اعتبار سے حدیث کا ترجمہ یوں ہوگا کہ جو چیز تمہارے دل میں ''خلجان'' پیدا کرے اسے چھوڑ دو۔ یعنی دل میں ایک خلجان سا ہے کہ میں جو کر رہا ہوں پتا نہیں یہ صحیح ہے بھی کہ نہیں' کہیں یہ حرام تو نہیں۔ تو اگر ایسا کوئی شک دل میں پیدا ہو گیا ہے تو اس کو چھوڑ دو۔

یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ اس بات کی ایک سند عطا کر رہی ہے کہ انسان کا ضمیر اور دل صحیح فتویٰ دیتا ہے۔ اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ بسا اوقات حضور ﷺ سے کوئی صاحب مسئلہ پوچھتے تھے کہ میں یہ کروں یا نہ کروں تو آپؐ جواب میں فرماتے تھے: ((اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ)) یعنی اپنے دل سے اس بارے میں فتویٰ لے لو! بظاہر یہ حکم عام معلوم ہوتا ہے' لیکن یہ عام نہیں خاص ہے۔ یہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں میں نورِ ایمان اور کامل یقین موجود ہے' جن کے دل کو ''دلِ زندہ'' کہا گیا ہے' اور دل زندہ وہ ہوتا ہے جس میں روحِ ربانی (جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر پھونکی ہوئی ہے) زندہ ہے اور اس میں حرارت موجود ہے۔ الغرض قلب کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ آپ کو بتا سکتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اس اعتبار سے انسان کا ضمیر (conscience) ایک قسم کا جج ہے جو انسان کو غلط کام پر ملامت کرتا

ہے۔ اگر انسان کوئی غلط حرکت کر بیٹھا ہے' مثلاً وقتی طور پر کوئی جذبات کا طوفان آیا اور انسان اس میں بہہ گیا یا کسی ایسے ماحول میں بیٹھا ہوا تھا جہاں برائی غالب تھی تو وہ بھی غلط کام کر بیٹھا تو اندر سے دل اسے ملامت کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہوگا کہ میرا ضمیر مجھے کاٹ رہا ہے' مجھے ڈس رہا ہے۔

اسلام' ایمان اور یقین قلبی کی کیفیات

حدیثِ جبریل کے مطالعے کے دوران میں نے عرض کیا تھا کہ ایک ایمان وہ ہے جو اقرار باللسان کے درجے میں ہے' یعنی محض زبان سے شہادت (verbal attestation) ہے تو اس سے اسلام کا تقاضا تو پورا ہو گیا —— حدیث جبریل میں اسلام کے بارے میں کیے گئے سوال کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا))

''اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز ادا کرے' زکوٰۃ دے' رمضان کے روزے رکھے' اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرے۔''

گویا ''مسلمان'' ہونے کے لیے ''ایمان'' لازمی نہیں ہے۔ جو بھی زبان سے کلمہ شہادت کا اقرار کرے گا تو وہ ہمارے ہاں مسلمان سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ ہمیں کیا پتا کہ اس کے دل میں ایمان ہے یا نہیں؟ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ یا الیکٹروکاڈیوگرام جیسا کوئی آلہ بھی نہیں ہے کہ دل میں اتار کر اس کا ایمان جانچ سکیں۔ لہٰذا اسلام کا دارو مدار اقرار باللسان پر ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے۔ اکثر ہم ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے مابین فرق نہ کرنے سے خلط مبحث کر جاتے ہیں۔ حدیث جبریل میں اسلام اور ایمان کی حقیقت کو علیحدہ علیحدہ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کی اہم ترین آیت سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ ہے' جس میں فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾

''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے فرما دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔''

الغرض ایک ہے زبانی اقرار والا ایمان' جبکہ اس کے مقابلے میں ایک ہے دل کے اندر اُتر جانے والا ایمان۔ پھر اس ایمان کے بھی درجات ہیں' جو یقین کی کیفیات پر منحصر ہیں۔ ویسے یقین کی گہرائی کا تو ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ میں نے شاید پہلے بھی سلطان باہو کا ایک شعر آپ کو سنایا ہے —— مجھے پنجابی زیادہ نہیں آتی اور پنجابی صوفیاء کے کلام کا میں نے خاص مطالعہ بھی نہیں کیا' لیکن بعض چیزیں جو سننے میں آتی ہیں وہ واقعتاً محسوس ہوتی ہیں کہ بہت گہری باتیں ہیں —— سلطان باہو کہتے ہیں: ؎

دل دریا سمندروں ڈُونگھے کون دلاں دیاں جانے ہو!

یعنی دل کی گہرائی تو دریا بلکہ سمندر سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کسی کے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل مسکن ہے روح کا اور روح کا تعلق تو ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾﴾ (بنی اسراء یل) ''(اے نبی ﷺ!) وہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تمہیں تو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے''۔ اس اعتبار سے دل کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے جڑ جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے سورج کی کرن سورج سے چل کر ہماری اس زمین تک آ گئی ہے اور اس نے زمین کو روشن کر دیا ہے' لیکن اس کا تعلق اللہ کے سورج سے ٹوٹا نہیں ہے۔ سورج کی کرن خطِ مستقیم میں سفر نہیں کرتی بلکہ قریب البیضوی (parabola) راستہ اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ اگر درمیان میں کوئی شے رکاوٹ نہ

بنے تو سورج کی کرن چکر کھا کے سورج میں واپس پہنچ جائے گی۔ یہ تو درمیان میں کوئی شے حائل ہوئی جس نے اسے واپس جانے سے روک لیا اور روکنے کی وجہ سے وہ شے منور ہوگئی۔ اگر کوئی شے درمیان میں نہ آئے تو وہ چلتی جائے گی اور ایک بہت بڑا چکر لگا کر' جس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے' یہ کرن واپس سورج میں پہنچ جائے گی۔ یہی معاملہ روح کا ہے اور وہ بھی درحقیقت انسان کے اندر ایک طرح کی روشنی ہے۔

قلبِ مؤمن میں موجود نورِ ایمان اور اس کی مثال

اس حوالے سے یہ بات جان لیجیے کہ جب انسان غلطی پر مصر رہتا ہے اور حرام خوری پر ڈیرے ڈال لیتا ہے تو پھر ایک وقت آتا ہے کہ یہ روشنی بجھ جاتی ہے اور پھر اس میں حق و باطل میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ گویا وہ چراغ اندر سے بجھ گیا ہے یا اس کے اوپر اتنی سیاہی آ گئی ہے کہ اب اس کی روشنی باہر نہیں آ رہی۔ آج کل تو ہمیں اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا جبکہ پچھلے زمانے میں لالٹینیں ہوتی تھیں۔ اس کے اندر ایک شیشہ ہوتا تھا جو اس کی روشنی کو ہموار طریقے سے چاروں طرف پھیلا رہا ہوتا تھا۔ اگر لالٹین کے اس شیشے پر دھواں جم جائے تو شعلہ جلنے کے باوجود روشنی باہر نہیں آئے گی۔ یہی حال دل کا ہے کہ اگر گناہوں کی وجہ سے اس پر سیاہی جم جائے تو پھر اندر کی روشنی باہر نہیں آتی۔

یہ تو تمثیلات ہیں اور ایک ہی حقیقت کو واضح کرنے کے مختلف انداز ہو سکتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے گناہ کو سیاہ نکتے سے تعبیر فرمایا ہے جو بندۂ مؤمن کے دل پر لگ جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءَ فِي قَلْبِهِ ، فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صَقَلَتْ قَلْبَهٗ ، فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَغْلَقَ قَلْبُهٗ ، فَذٰلِكَ الرَّانُ الَّذِيْ قَالَ اللّٰهُ جَلَّ ثَنَاؤُهٗ : كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝))(۱)

''ایک مسلمان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے' باز آ جائے اور استغفار کرے تو یہ نکتہ اس کے دل سے

(۱) رواہ الترمذی فی السُّنن (ح:۳۳۳٤) وابن جریر الطبری فی التفسیر (۱٤۷/۱) واللفظ لہ۔

دور ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ (گناہوں میں) بڑھتا جائے تو یہ سیاہی بھی بڑھتی جاتی ہے' یہاں تک کہ اُس کا دل بند ہو جاتا ہے۔ پس یہی وہ زنگ ہے جس کے بارے میں اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''ہرگز نہیں' بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے۔'' (المطففین: ١٤)

ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی مٹھی بند کر کے دل کے بند ہو جانے کی تمثیل بیان فرمائی۔ یعنی اگر بند مٹھی میں کچھ روشنی ہے بھی تو وہ جسم کو منور نہیں کر سکتی۔ یہی تشبیہہ دراصل سورۃ النور میں بیان ہوئی ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ﴾ (آیت ٣٥)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (بندۂ مؤمن کے قلب میں موجود) اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے اور اس طاق میں ایک چراغ ہے' اور چراغ ایک شیشے میں ہے۔''

اب آپ ذرا غور کیجیے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لایئے' تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ ''ڈایافرام'' جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے' وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو پھر یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے اور اس سے جو نور پھوٹتا ہے وہ پورے انسانی وجود کو روشن کر دیتا ہے۔ یہ ہے درحقیقت نورِ ایمان کی مثال۔ بعض لوگوں کو اس بارے میں مغالطہ ہوا ہے اور وہ اسے اللہ کے نور کی مثال سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اصل میں نورِ ایمان کی مثال ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' سے مراد ہے: ''مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ'' (اللہ کے نور کی مثال جو مؤمن کے قلب میں ہے)۔ گویا یہاں مراد ہے نورِ ایمان۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔

گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے

''اربعین نووی'' کی زیر مطالعہ حدیث کے حوالے سے میں نے بتایا کہ یہ حدیث اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ انسان کے ضمیر کو سند دے رہی ہے۔ اسی معاملہ کو ایک اور سطح پر محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا:

((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ)) (۱)

''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تمہیں یہ ناپسند ہو کہ وہ لوگوں کے علم میں آئے۔''

اس حدیث کے دوسرے ٹکڑے پر غور کیجیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اجتماعی ضمیر بھی ایک شے ہے — جس طرح میرا اور آپ کا ایک انفرادی ضمیر ہے' اگر ایمان کی کوئی رمق ہمارے اندر موجود ہے تو وہ صحیح حکم لگاتا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ اسی طرح ایک نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر ہے۔ نبی اکرم ﷺ اسے بھی سند دے رہے ہیں' بایں طور کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ نے کوئی ایسا عمل کیا ہے جس کے بارے میں آپ نہیں چاہتے کہ لوگوں کے علم میں آئے تو یہ عمل گناہ ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا پہلا جملہ — ((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ)) ''گناہ وہ ہے جو تمہارے اپنے دل میں خلجان پیدا کر دے'' — انسان کے انفرادی ضمیر سے متعلق ہے' جبکہ حدیث کا دوسرا جملہ — ((وَكَرِهْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ عَلَیْهِ النَّاسُ)) ''اور تم ناپسند کرو کہ وہ بات لوگوں کے علم میں آئے'' — بنی نوعِ انسان کے اجتماعی ضمیر سے متعلق ہے۔ گویا نوعِ انسانی کا اجتماعی ضمیر بھی صحیح فیصلے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے نیکی کے لیے ''مَعْرُوف'' اور بدی کے لیے ''مُنْكَر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ معروف کا معنی ہے جانی پہچانی چیز جبکہ منکر سے مراد وہ چیز ہے جو انسان پہچان نہیں پاتا۔ چنانچہ فطرتِ انسانی کے نزدیک منکر اور بدی ایسی اجنبی چیز ہے جس سے اس کو دلچسپی نہیں ہے' اس کی پہچان اور اس کی راہ و رسم نہیں ہے۔ دوسری طرف نیکی اور معروف وہ ہے جسے انسان جانتا پہچانتا ہے' اس کی طرف

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تفسیر البر والاثم۔

اسے رغبت ہوتی ہے اور اس کو وہ پسند کرتا ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیں کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر قرآن مجید کی بڑی اہم اصطلاح ہے' جو قرآن مجید میں کئی مقامات پر استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (لقمٰن:۱۷) ''اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو' نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو''۔ دین اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ دو ہزار چیزوں کی لمبی فہرست دے کر بتا دیا گیا ہو کہ یہ برائیاں ہیں اور ایک ہزار چیزوں کی فہرست دے کر بتا دیا گیا ہو کہ یہ اچھائیاں ہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی ضمیر کے اندر الہامی طور پر نیکی اور بدی کا علم ودیعت کر دیا ہے۔ تو انسان کی فطرت (nature) جانتی ہے کہ کیا خیر ہے اور کیا شر' کیا فجور ہے اور کیا تقویٰ ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الشّمس میں فرمایا گیا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىہَا ۝ فَاَلْہَمَہَا فُجُوْرَہَا وَتَقْوٰىہَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىہَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىہَا ۝﴾

''اور نفس انسانی کی (قسم) اور جیسا کچھ اس کو سنوارا۔ پھر اس کی بدکاری اور اس کی پرہیز گاری (دونوں) کی اسے سمجھ دی۔ پس جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو (برائیوں سے) پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا' اور جس نے اسے خاک میں ملایا (یعنی بدکاریوں میں پڑ گیا تو) وہ خسارے میں رہا۔''

تقویٰ کی عملی شکل: لغو کاموں سے اعراض

اب ہم اربعین نووی کی حدیث ۱۲ کا مطالعہ کرتے ہیں — یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ حدیث حسن ہے جسے امام ترمذی نے اپنی ''سنن'' میں روایت کیا ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ))

''انسان کے اسلام کا حسن اس میں بھی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جس کا اسے کوئی فائدہ نہ ہو۔''

اس حدیث پر بڑے غور و فکر کی ضرورت ہے ——— حُسْنِ الْاِسْلَامِ یعنی اسلام کی خوبی کے بارے میں تو ہم نے حدیث جبریل کی روشنی میں تفصیل سے پڑھا تھا۔ درحقیقت اسلام ہی کو خوبصورت بنانا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اسلام کا ایک رکن ہے۔ جب ایمان اور قلبی یقین آ گیا تو نماز کی کوئی اور ہی شان ہو جائے گی۔ پھر جب قلبی یقین مزید گہرا ہو گیا تو اب وہ نماز ''معراج المؤمنین'' بن جائے گی۔ یعنی چیز وہی ہے مگر اس کا روپ' اس کا رنگ' اس کی شان' اور اس کا حسن ایمان کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسی کا نام ''حسن الاسلام'' ہے اور اسی کو تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تصوف کے موضوع پر میرا ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے: ''مروجہ تصوف یا احسانِ اسلام'' ——— تصوف کے ایک معنی تو وہ ہیں جو آج کل ہمارے ہاں معروف ہیں یعنی مروجہ تصوف' جبکہ ایک تصوف ہے قرآن' حدیث' محمد ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا۔ اس تصوف کے لیے لفظ ''احسان'' یا ''حسن اسلام'' استعمال کیجیے۔ وہ تصوف ہے: اسلام میں حسن اور خوبی کا پیدا ہو جانا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تصوف اسلام سے علیحدہ کوئی شے ہے' بلکہ اسلام کے اندر ایک خوبی' ایک حسن اور ایک دلربائی کا پیدا ہو جانا تصوف ہے اور اس کیفیت کا اصل نام ''احسان'' ہے۔ احسان کے بارے میں بھی ہم حدیث جبریل میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں۔

دنیا آخرت کی کھیتی ہے

زیر درس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی انسان کے اسلام کی خوبی' بہتری' اس کے حسن اور درجے کے بلند ہونے میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو چھوڑ دے جو اس کے لیے کوئی مفید و نفع بخش نتیجہ برآمد نہ کرتی ہو۔ اس کا مطلب سمجھ لیجیے۔ دیکھئے ہماری زندگی بڑی محدود سی ہے۔ آج کل کی اوسط عمر تقریباً ۶۰ سال ہے۔ ان ۶۰ سالوں میں پہلا دور یوں گزر گیا کہ ابھی پورا شعور نہیں تھا اور بعد میں پھر ایک ایسا دور آ گیا کہ ''لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا'' کے مصداق اس کے حواس پوری طرح برقرار نہیں رہے۔ ان دونوں اَدوار کے درمیان میں تیس چالیس برس کا عرصہ ہے جس

میں انسان باشعور ہے اور وہ اپنے ارادے‘ عزم اور منصوبہ بندی کے مطابق فیصلے اور عمل کرتا ہے۔ اس دور میں کیے گئے اَعمال واَفعال کے نتائج لامتناہی زندگی یعنی آخرت میں نکلنے ہیں۔ جو یہاں کمائیں گے وہی آخرت میں پائیں گے۔ چنانچہ دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا جاتا ہے۔ (اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ)۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے‘ اور اگر یہاں کچھ بویا ہی نہیں تو وہاں کیا کاٹو گے؟ اگر یہاں کانٹے بوئے ہیں تو وہاں کانٹے ہی کاٹنے پڑیں گے اور اگر یہاں پھل دار اور پھول دار درخت لگائے ہیں تو وہاں پر بھی آپ کو پھل دار اور پھول دار درخت ہی ملیں گے۔ اگر آپ نے دنیوی زندگی میں نیکیاں کمائی ہیں تو وہاں نیکی کا بدلہ انعامات کی صورت میں ملے گا اور اگر اس حیاتِ ارضی میں بدیاں کمائی ہیں تو ظاہری بات ہے کہ ان کی سزا عذاب کی صورت میں ملے گی۔

یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور اس محدود زندگی میں ہمارے پاس جو بھی وقت ہے‘ اسی میں ہمیں سب کچھ بنانا ہے۔ تو کیا کوئی عقل وشعور رکھنے والا شخص اس محدود سی زندگی میں سے کسی وقت کا ضائع کرنا گوارا کرے گا؟ اس کا ہر لمحہ ''اَمر'' ہے—''اَمر'' ہندی کا لفظ ہے جس کا معنی ہے ''نہ ختم ہونے والا''۔ جب گاندھی جی مرے تھے تو انڈین ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر اُس وقت کہا گیا تھا: ''گاندھی جی امر ہو گئے'' اور یہاں کسی نے بےنظیر بھٹو کے بارے میں بھی کہا ہے کہ وہ امر ہو گئیں۔ یہ ہندوانہ تصور ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی شروع ہوتی ہے اس کے لیے موت نہیں ہے۔ ہر شخص مرنے کے بعد اَمر ہو جائے گا‘ کیونکہ اب کوئی اور موت تو آئے گی نہیں۔ اب تو بس یہی ہے کہ مرنے کے فوراً بعد آپ عالَمِ برزخ میں داخل ہوں گے اور ایک وقت آئے گا کہ عالَمِ برزخ سے عالَمِ آخرت میں منتقل ہو جائیں گے۔

دُنیوی زندگی دیباچہ اور اُخروی زندگی اصل کتاب ہے

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی زندگی لامتناہی (infinite) ہے‘ یعنی وہ زندگی محدود نہیں‘ لامحدود ہے‘ جبکہ ہماری یہ دُنیوی زندگی متناہی (finite)‘ محدود اور بہت چھوٹی ہے۔ اس حوالے سے میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہم آخرت پر ایمان

رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اگر آپ آخرت کے حوالے سے اپنے ذہن کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ذہنوں میں دنیوی اور اُخروی زندگیوں کا نسبت وتناسب (ratio proportion) ایسا ہے کہ جیسے اصل کتاب تو یہ دنیا کی زندگی ہے' اور آخرت کی حیثیت کتاب کے آخر میں لگے ایک چھوٹے سے ضمیمہ (appendix) کی ہے—— ایک تو وہ لوگ ہیں جو آخرت کو مانتے ہی نہیں' ان سے قطع نظر' جو مانتے ہیں ان کا ماننا بھی اس درجے میں ہوتا ہے کہ وہ اس دُنیوی زندگی کو اصل کتاب مانتے ہیں اور آخرت کو کتاب کے ساتھ لگا ہوا ایک ضمیمہ' جو اصل کتاب کا بمشکل دو فیصد ہوتا ہے۔ حالانکہ حیاتِ دنیوی کی حیثیت کتاب کے دیباچے کی ہے' جبکہ اصل کتابِ زندگی تو کھلے گی موت کے بعد' جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''درحقیقت آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے۔ کاش وہ جانتے!''—— غزوۂ احزاب میں رسول اللہ ﷺ نے خندق کی جاں گسل کھدائی میں مصروف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھ کر فرمایا تھا:

((اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْآخِرَةِ ۔ فَاغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ!))

''اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' جبکہ یہ زندگی کوئی زندگی ہی نہیں ہے' پس تو (اپنے راستے میں جہاد وقتال میں مصروف) انصار ومہاجرین کی مغفرت فرمادے!'' (بخاری ومسلم)

دنیوی واُخروی زندگی کے مابین نسبت وتناسب کے اعتبار سے' اب یا تو ہم وہ کام کریں جس سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہورہی ہو —— اس میں ''طولِ امل'' نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کی خواہشات ربڑ کی طرح پھیلتی چلی جائیں۔ تعیش' فراوانی اور زیادہ سے زیادہ سہولتیں ضروریات (necessities) میں نہیں آتیں۔ لہٰذا وہ کام کرو جس سے یا تو دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہو یا آخرت کے اندر انسان کو اس کا اجر وثواب مل سکے۔ ان دو کے علاوہ کسی تیسرے کام کے لیے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع کرنا ایمان اور اسلام کے منافی ہے۔ اگر آپ کوئی لمحہ کسی فضول اور بے کار کام میں ضائع کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ آپ کو آخرت پر یقین ہی نہیں۔

بے فائدہ کاموں سے اجتناب: شیوۂ مؤمن

یہی وجہ ہے کہ سورۃ المؤمنون میں کامیاب ہونے والے اہل ایمان کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ① الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَا تِهِمْ خٰشِعُوْنَ ② وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ③﴾ ''بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے' جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں' اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں''۔لغو کام اسے کہتے ہیں جو بے فائدہ ہو' مثلاً بیٹھے تاش یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔بھئی کونسی تمہاری دنیا کی ضرورت اس سے پوری ہوئی یا تم نے اس سے آخرت کا کیا کمایا؟ اس ضمن میں ایک اصطلاح ہمارے ہاں ''وقت گزاری'' (یا to kill the time) استعمال ہوتی ہے' حالانکہ یہ وقت اتنی حقیر شے نہیں ہے کہ اسے یونہی ضائع کر دیا جائے۔ وقت گزاری کے مشغلے انہی کے لیے ہوں گے جن کو آخرت پر یقین نہیں ہے' ورنہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی صاحب ایمان اپنا وقت یونہی ضائع کر دے۔اگر آپ کو وقت ملا ہے تو سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ کا ورد کیجیے۔ان میں سے ہر کلمہ آپ کے لیے جنت میں پودا بن جائے گا اور وہاں آپ کو سرسبز باغات ملیں گے' لہٰذا وقت ضائع کیوں کر رہے ہو؟ یا تو کسی ایسے کام میں مصروف ہو جاؤ جس سے دنیا کی کوئی ضرورت پوری ہو رہی ہو؟ یا پھر آخرت کے کمانے کے لیے لگ جاؤ' تیسرا کام نہیں ہونا چاہیے۔اس لیے ایمان والوں کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ③﴾ یعنی اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جو لغو اور بے فائدہ کاموں سے مکمل اجتناب برتتے ہیں۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہو گا کہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے ہم معنی اور بہت مشابہ سورۃ المعارج کی آیات ہیں۔سورۃ المعارج میں ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ③﴾ کے بجائے ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ㉖﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔یعنی کامیاب ہونے والے وہ لوگ ہیں جو آخرت' قیامت کے دن' جزا و سزا اور حساب و کتاب کو مانتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے

ہیں۔ آیات کی اس ترتیب سے مفہوم یہ بنے گا کہ جزا وسزا کے قانون پر ایمان رکھنے والوں کے لیے کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی لغو کام کے اندر اپنا وقت صرف کریں! بلکہ سورۃ الفرقان میں ''عباد الرحمٰن'' کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے تو یہاں تک فرمایا گیا:

﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ ''اور جب انہیں بے ہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوتو باوقار انداز سے گزر جاتے ہیں''۔ یعنی خود لغو کام میں ملوث ہونا تو بہت دور کی بات ہے' اگر کہیں اتفاق سے لغو کام کرتے لوگوں کے پاس سے گزر ہو جائے تو وہ متوجہ ہوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی کام سے جا رہے ہیں اور آپ نے دیکھا کہ سڑک پر لوگ جمع ہیں۔ کوئی کھیل تماشا ہے' کوئی مداری ہے جو کرتب دکھا رہا ہے' لوگوں کی دل لگی کا سامان کر رہا ہے' وغیرہ۔ اب اگر آپ اس طرف متوجہ ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وقت کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھا' جبکہ عباد الرحمٰن کا شیوہ یہ ہے کہ اوّل تو وہ بالارادہ کسی لغو کام کی طرف جاتے نہیں اور اگر اتفاقاً کسی لغو کے پاس سے گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے باعزت طریقے سے گزر جاتے ہیں اور اس طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ یعنی اپنے وقت کا کوئی منٹ بھی ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

جوامع الکلم احادیث کو یاد کیجیے!

یہ احادیث بڑی چھوٹی چھوٹی ہیں' لیکن ان میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ یہی وہ احادیث ہیں جن کو ''جوامع الکلم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان مختصر احادیث کو یاد کر لینا آسان ہے' لہٰذا ان کو ضرور یاد کرنا چاہیے۔ آج کی اس نشست میں اربعین نووی کی دو احادیث ہمارے زیر مطالعہ آئیں اور ان کے ضمن میں ایک اور بہت اہم حدیث کا بھی تذکرہ ہوا۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ ان احادیث کو ذہن نشین کر لیں گے۔ آپ کی آسانی کے لیے میں وہ تینوں احادیث ایک بار پھر دہرا دیتا ہوں۔

(۱) ((دَعْ مَا يَرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يَرِيْبُكَ))

''جس چیز سے دل میں خلجان پیدا ہو جائے اسے چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کرو جس سے دل میں اطمینان ہو۔''

(۲) ((اَلْاِثْمُ مَا حَاكَ فِیْ صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ اَنْ يَّطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ))
''گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں خلجان پیدا کرے اور تم ناپسند کرو کہ یہ لوگوں کے علم میں آئے۔''

(۳) ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ))
''کسی انسان کے اسلام کی خوبی میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی لایعنی کام میں وقت ضائع نہ کرے۔''

یعنی انسان کے اسلام کے اندر جو حسن پیدا ہوا ہے اگر وہ اسلام اور ایمان سے گزر کر احسان کے درجے تک آ گیا ہو تو پھر اسے چاہیے کہ وہ اپنا وقت یا تو ایسے کام میں صرف کرے جس سے دنیا کی کوئی ضرورت (necessity) پوری ہو رہی ہو —— اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کے اندر اپنی جائیداد بڑھاتے چلے جانا' کاروبار پھیلاتے چلے جانا اور اپنے لیے لذاتِ دُنیوی اور عیاشی کے سامان فراہم کرنا' بلکہ ایسا کام ہو جس سے دنیا کی ضرورت پوری ہو —— یا پھر ایسے کام میں جو انسان کے لیے آخرت کا تحفہ بن جائے' آخرت کا خزانہ بن جائے —— اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے' آمین یا ربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

حدیث
13
14

اسلامی اخوّت اور خونِ مسلم کی حرمت

۱۱/ جنوری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (الحجرات)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات:۱۳)

عَنْ اَبِیْ حَمْزَةَ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ خَادِمِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ :

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱)

رسول اللہ ﷺ کے خادم ابوحمزہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مکمل ایمان دار نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے (مسلمان) بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ :

((لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ، يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ،

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علیٰ ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه۔

اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ : اَلثَّیِّبُ الزَّانِیْ ' وَالنَّفْسُ بِالنَّفْسِ ' وَالتَّارِکُ لِدِیْنِہٖ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَۃِ)) (۱)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''(مندرجہ ذیل) تین صورتوں کے علاوہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں' جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں (۱) شادی شدہ زانی' (۲) جان کے بدلے جان (قاتل)' اور (۳) دین کا تارک' جماعت سے علیحدگی اختیار کرنے والا۔''

معزز سامعین کرام!

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ احادیث ''اربعین نووی'' میں بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کے کلمات تو نہایت مختصر ہیں مگر ان میں دین کی بڑی بڑی حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ''جوامع الکلم'' سے تعبیر فرمایا ہے۔ گزشتہ نشست میں بھی ہم نے چند جوامع الکلم احادیث کا مطالعہ کیا تھا اور آج بھی جو دو احادیث (حدیث نمبر ۱۳ اور ۱۴) ہمارے زیر مطالعہ ہیں وہ بھی جوامع الکلم میں سے ہیں۔ پہلی حدیث کا تعلق ایمان کے اصل جوہر اور لُبِّ لُباب سے ہے اور دوسری کا تعلق اسلام کے قانونی نظام سے ہے' اور پھر اس میں خاص طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ کسی مسلمان کی جان کن حالات میں لی جا سکتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا قانونی اور فقہی مسئلہ ہے۔ آج ہم ان شاء اللہ ان دونوں احادیث کا مطالعہ کریں گے۔

اسلامی اخوت اور عالمگیر اخوت

اپنے معمول کے مطابق میں نے ابتدا میں سورۃ الحجرات کی دو آیات تلاوت کی ہیں' پہلی آیت ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ (آیت ۱۰) ''یقیناً اہل ایمان تو بھائی بھائی ہیں''— اخوتِ ایمانی کا یہ رشتہ بہت گاڑھا' مضبوط اور بہت بنیادی ہے' لیکن اسی سورۂ مبارکہ کی دوسری آیت میں ایک اور رشتۂ اخوت کا ذکر ہے اور وہ اہلِ ایمان کے درمیان نہیں' بلکہ تمام انسانوں کے مابین ہے' چاہے وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّھَا

(۱) صحیح مسلم' کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات' باب ما یباح بہ دم المسلم۔

النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾(الحجرات:١٣) ''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت (یعنی ایک انسانی جوڑے) سے پیدا کیا ہے''——اس آیت میں بنی نوعِ انسان کی دو مشترک باتوں کو بیان کیا گیا ہے' ان میں سے ایک ہے: ''اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ ''، یعنی ہم سب کا خالق ایک ہے۔ چاہے کوئی مسلمان ہو' ہندو ہو' پارسی ہو' عیسائی ہو' الغرض جو بھی ہو' سب کا خالق اللہ ہی ہے۔ جبکہ بنی نوعِ انسان میں دوسری قدرِ مشترک ''مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى '' ہے' یعنی تمام انسان حضرت آدم اور حواؑ سے پیدا کیے گئے ہیں۔ اس قدرِ مشترک کی بنا پر تمام بنی نوع انسان میں بھی ایک رشتہ اخوت ہے۔ اگرچہ اس میں وہ پہلا دائرہ یعنی اخوتِ ایمانی کا جو رشتہ ہے اس کی افضلیت اپنی جگہ مسلّم ہے' مگر اس کے ساتھ تمام انسانوں کے مابین بھی ایک رشتہ اخوت بہر حال موجود ہے۔

راوی اور روایت کا تعارف

اس تمہید کے بعد اب ہم پہلی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں جن کی کنیت ابوحمزہ ہے' اور یہ حضور ﷺ کے خادم اور انصاری صحابی ہیں—— حضور اکرم ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو حضرت انسؓ کی والدہ تقریباً نو (۹) برس کی عمر میں ان کو حضور ﷺ کی خدمت میں چھوڑ گئیں اور کہا: یارسول اللہ ﷺ! یہ آپ کے پاس رہے گا اور آپ کی خدمت کرے گا۔ اس کے بعد حضرت انسؓ حضور ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے پورے مدنی دور میں آپؐ کے خادم کی حیثیت سے آپ کے ساتھ جڑے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ''خادمِ رسول'' کے لقب سے مشہور ہیں اور بہت سی احادیث بھی ان سے مروی ہیں۔ انہی میں سے ایک حدیث آج ہمارے زیر مطالعہ ہے۔

یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے متفق علیہ ہے' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے' اور یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ سند کے اعتبار سے کسی حدیث کا اس سے اونچا درجہ اور کوئی نہیں ہے۔ سند کے اعتبار سے جو حدیث متفق علیہ ہے وہ صحت کے اعتبار سے قرآن مجید کے بہت قریب پہنچ جاتی ہے' البتہ یہ ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید کا ہر ہر حرف محفوظ ہے' لیکن حدیث کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ حدیث کے اندر ایک ہی بات

مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کریں گے تو الفاظ کا تھوڑا بہت فرق واقع ہو جائے گا — حدیث جبریلؑ کے مطالعہ کے دوران میں نے بہت واضح طور پر آپ کو بتایا تھا کہ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہے۔ اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ اس واقعہ کو روایت کرنے والے سب صحابہ وہاں موجود ہیں جو سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں' لیکن پھر بھی بیان کرنے میں الفاظ اور ترتیب کا تھوڑا سا فرق ہو گیا ہے— لہٰذا قرآن مجید تو لفظاً بھی محفوظ ہے جبکہ حدیث کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ))

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى......'' کا مفہوم

اس قسم کی احادیث کے ضمن میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھیے کہ اس کا یہ نتیجہ نکال لینا کہ وہ مؤمن نہیں ہے تو کافر ہے' درست نہیں ہے۔ حدیث جبریلؑ کے ضمن میں تفصیل سے ایمان اور اسلام کا فرق واضح کیا جا چکا ہے کہ ایمان اصل میں بعض حقائق کے قلب میں جاگزیں ہو جانے کا نام ہے اور پھر اس کے مختلف مراتب ہیں — اسی کا ایک مرتبہ وہ بھی ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) یہ بھی درحقیقت اسی ایمان کی گہرائی کا ایک درجہ ہے' لہٰذا ایمان کی گہرائی کے پہلو سے ایمان کے مختلف تقاضے اور مختلف مظاہر ہیں' اور پھر اسی ترتیب سے ایمان کے مختلف ثمرات اور نتائج ہیں — اگر دل میں فی الواقع ایمان موجود ہے تو اس کے ثمرات بھی حاصل ہوں گے جنہیں مختلف احادیث اور قرآن مجید کی مختلف آیات' مثلاً سورۃ التغابن کے دوسرے رکوع میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔

زیر مطالعہ حدیث کے آغاز میں ((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى......)) کے جو الفاظ آئے ہیں' یہ الفاظ کئی اور احادیث میں بھی آئے ہیں۔ مثلاً دو احادیث بہت ہی معروف

ومشہور ہیں جو تقریباً اسی انداز کی ہیں۔ پہلی حدیث یوں ہے: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ))(۱) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اُس کی خواہشِ نفس اس (دین) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں''۔ میں شریعت' اللہ کے احکام اور اوامر ونواہی لایا ہوں' اب اگر تمہاری خواہش نفس اس کے خلاف سرکشی کرتی ہے تو پھر تمہارے قلب میں حقیقی ایمان موجود نہیں ہے اور تم مؤمن نہیں ہو۔ البتہ ایسا شخص مسلم تو ہوسکتا ہے' اس لیے کہ جو شخص کسی وقت اللہ کے کسی حکم پر اپنے نفس کے کسی تقاضے کو ترجیح دے دے تو اس سے وہ گناہگار' فاسق اور فاجر تو ہوگا لیکن وہ کافر نہیں ہو جائے گا۔ البتہ اسے ایمان کی حقیقت اُس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک کہ اُس کی خواہش نفس تابع نہیں ہوگی اس کے جو نبی اکرم ﷺ لے کر آئے ہیں۔

اسی طرح دوسری حدیث یوں ہے: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۲) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اُسے اُس کے والد' اُس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں''۔ یہ بھی ایمان کا ایک تقاضا ہے۔ ایمان کے مختلف تقاضے اور درجات ہیں اور احادیث میں ان کے حوالے سے بات ہوتی ہے' جبکہ اس کو اس لغوی مفہوم میں لے لینا کہ جب مؤمن نہیں ہے تو مسلم بھی نہیں ہے اور گویا پھر کافر ہے' یہ سارا معاملہ غلط ہے اور اس پر حدیث جبریلؑ کے ضمن میں ہم بڑی تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

اخوت کا تقاضا

اس لحاظ سے زیرِ مطالعہ حدیث کا مفہوم یوں ہوگا کہ کسی شخص کی شرافت ومروّت کا تقاضا یہ ہوگا کہ جو چیز اپنے لیے پسند کر رہا ہے وہ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔ دیکھئے ایک بھائی وہ ہے جو ماں جایا ہے' یعنی آپ کا حقیقی بھائی ہے' ظاہر بات ہے کہ اس اعتبار سے سب سے اَقرب وہی رہے گا۔ اس کے بعد کزنز ہیں جو آپ کے دادا دادی کی

(۱) رواہ فی شرح السنۃ' بحوالہ مشکاۃ المصابیح۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ اکثر من الاھل والولد والوالد۔

اولاد ہیں۔ وہ بھی پھر بھائیوں میں آ جائیں گے اور اس طرح یہ دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا' یہاں تک کہ پوری نوعِ انسانی کو اپنے احاطے میں لے لے گا— میں ابھی بتا چکا ہوں کہ اخوت کا ایک دائرہ تمام مسلمان بھائیوں کو محیط ہے' جبکہ ایک وسیع تر دائرہ میں تمام بنی نوع انسان آ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ تمام بنی نوع انسان کا خالق ایک اللہ ہے اور تمام کے تمام آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں تو اس اعتبار سے ان سے بھی ہمارا ایک رشتہ اخوت تو بہر حال ہے' لہٰذا اگر ہمیں کوئی خیر ملا ہے تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پسند کریں کہ وہ خیر ''الاقرب فالاقرب'' کے حساب سے ہر بھائی کو ملے' اور پھر درجہ بدرجہ یہ بات پھیلتی چلی جائے گی۔

فرض کیجیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو صحت دی ہے' آپ چاہیں گے کہ آپ کے بھائیوں کے اندر بھی صحت ہو' اگر ان میں کوئی مرض ہے تو دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شفا دے دے۔ اسی طرح اللہ نے آپ کو دولت دی ہے تو آپ کو یہ پسند کرنا چاہیے کہ آپ کے بھائیوں کے پاس بھی مال و دولت ہو' اگر ان کے پاس نہیں ہے تو آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی دولت سے سرفراز فرمائے۔

اس حوالے سے اہم ترین بات یہ ہے کہ سب سے بڑی اور اہم ترین دولت ''ہدایت'' ہے۔ اگر اللہ عزوجل نے آپ کو ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے تو اب اس کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کریں کہ اللہ تعالیٰ اسے بھی ہدایت دے دے۔ لہٰذا پھر اس کے لیے دل و جان سے کوشش اور محنت کریں۔ جیسے سورۃ التحریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ ''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے''۔ یہ دراصل خیر خواہی ہے— جس کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةَ)) ''دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے''— لہٰذا ہدایت کو عام کرنا' لوگوں تک پہنچانا' پھیلانا' یہ بھی اسی حدیث کا لازمہ ہو جائے گا۔ پھر جیسے جیسے آپ کے قلب کے اندر وسعت پیدا ہوگی' آپ کے سینے میں فراخی ہوگی تو رشتہ اخوت کا دائرہ بڑھتا چلا جائے گا۔

تبلیغِ ہدایت: حیاتِ دنیا کا سب سے قیمتی مصرف

اس ضمن میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ خلق کی ہدایت اور نوع انسانی کو سیدھے راستے پر لانے کی جدوجہد میں ایک وقت ایسا آ جاتا ہے کہ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور کام کرنے کو جی چاہتا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہاں تک فرما دیا: ((فَوَاللّٰہِ لَاَنْ یَھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا خَیْرٌ لَکَ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ))(۱) ''اللہ کی قسم! اگر تمہارے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں کے مل جانے سے بھی بڑی دولت ہے''— یہ روایت بھی جوامع الکلم میں سے ہے۔ دیکھئے کیسے بات کو جمع کیا گیا: ((اَنْ یَھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلًا وَاحِدًا)) یعنی ہدایت تم نہیں دے سکتے' ہدایت تو اللہ ہی دے گا' لیکن اگر اللہ کسی کو ہدایت دے رہا ہے اور وہ اس کا ذریعہ تمہیں بنا دے یعنی تمہارے ذریعے سے اس کو ہدایت پہنچے' تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر دولت ہے۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یَا مُعَاذُ! اَنْ یَھْدِیَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْکَ رَجُلًا مِنْ اَھْلِ الشِّرْکِ خَیْرٌ لَکَ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لَکَ حُمْرُ النَّعَمِ))(۲) ''اے معاذ! اگر کسی مشرک آدمی کو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں ہدایت عطا فرما دے تو یہ تمہارے حق میں سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔''

ہم صوفیاء اور اولیاء اللہ کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ انہیں تو بس اسی چیز کی غرض تھی کہ لوگوں تک ہدایت کا کلمہ پہنچ جائے۔ انہوں نے کوئی جائیدادیں تو نہیں بنائیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج ان کے مقبروں پر مشرکانہ حرکات ہو رہی ہیں' بدعات ہیں' شریعت کے خلاف افعال سرانجام پا رہے ہیں۔ عرس اور میلے منعقد ہوتے ہیں اور ان میں عصمت فروشی کا دھندا بھی ہوتا ہے۔ یہ سارا کچھ ان کے نام پر ہو رہا ہے اور جو گدی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجھاد والسیر' باب دعاء النبی ﷺ الناس الی الاسلام والنبوۃ...... ومسند احمد' ح ۲۱۷۵۵۔ واللفظ لہ۔

(۲) مسند احمد' کتاب مسند الانصار' باب حدیث معاذ بن جبلؓ ح ۲۱۰۵۹۔

نشین ہیں وہ تو عیاشیاں کرتے ہیں۔ دوسری طرف ان صوفیاء اور اولیاء اللہ نے تو عسرت کی زندگی گزاری ہے۔ بابا فرید گنج شکرؒ کے بارے میں آتا ہے کہ بسا اوقات ان کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا کہ پانی میں تھوڑا سا نمک ڈال کر اس سے سوکھی روٹی ذرا گیلی کر کے کھاتے تھے۔ انہوں نے زندگی اس طور سے گزاری اور انہوں نے کوئی کاروبار نہیں کیا۔ حالانکہ کاروبار کرنا کوئی حرام تو نہیں ہے‘ لیکن ان کے ذہن میں چیزوں کی قدر و قیمت کا ایک معیار (sense of values) تھا کہ کاروبار سے مجھے سوائے معاش کے اور کیا حاصل ہوگا! اور اگر میرے ذریعے سے اللہ ہدایت پھیلا دے تو اس کے بدلے جو کچھ مجھے آخرت میں حاصل ہوگا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اپنی توانائیوں کو کم قیمت پر ہرگز فروخت مت کریں!

الغرض جب انسان اس سطح تک پہنچ جاتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ میں اپنی قدر و قیمت تھوڑی کیوں قبول کروں؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو بھی توانائی‘ قوت‘ مہلت عمر‘ صحت‘ اظہار ما فی الضمیر اور تقریر و تحریر کی صلاحیتیں دی ہیں‘ ان کو آپ بازار میں لا کر گھٹیا قیمت پر فروخت نہیں کریں گے‘ اس لیے کہ ان کی سب سے بڑی قیمت یہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے‘ ان کی عاقبت سنوارنے اور ان کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے صرف کریں۔ تو درحقیقت یہ شرافت و مروّت کا وہ تقاضا ہے جس سے دین کی دعوت پھیلتی ہے۔ یہ جذبہ اگر لوگوں کے اندر ہوگا تو وہ اپنے وقت کا اصل مصرف اسی کو قرار دیں گے اور زندگی کے اندر اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کی سب سے اہم قیمت اسی کو سمجھیں گے کہ اس کو لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت بنایا جائے۔ بہرحال زیر مطالعہ حدیث میں اس کی تاکید کے لیے انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ اگر ایسا جذبہ انسان میں نہیں ہے تو پھر گویا حقیقی ایمان‘ ایمان کا اصل جوہر اور اصل لُبِّ لُباب نہیں ہے‘ اس لیے کہ جب ایمانِ حقیقی ہوگا تو آپ کا آخرت پر یقین ہوگا اور پھر دنیا میں آپ ہر چیز کی قیمت کا تعین آخرت کے حوالے سے کریں گے کہ آخرت میں اس کی کیا قدر و قیمت اور اجر و ثواب ہے۔ جیسے کہ ہم پچھلی حدیث میں پڑھ چکے ہیں: ((مِنْ حُسْنِ

اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ)) ''کسی آدمی (مسلمان) کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر اس کام کو چھوڑ دے جس کا اس کو کوئی فائدہ نہیں''۔ یعنی دنیا کا وقت یا تو دنیوی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے لگے ـــــ ظاہر بات ہے زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے یہ ایک جائز اور صحیح مصرف ہے ـــــ یا پھر اس کے ذریعے سے آخرت کمائی جائے۔ یوں سمجھنا کہ وقت کوئی بے کار اور فضول چیز ہے' یہ رویہ قابل مذمت ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ اس حوالے سے ہمارے ہاں ''وقت گزاری'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے' اگر آخرت کا یقین ہو تو اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح کون چاہے گا کہ میری اولاد' میرا بھائی جہنم میں ڈالا جائے؟ لہٰذا اس جذبہ کے پیدا ہونے کے بعد انسان کی ساری صلاحیتیں' ساری قوتیں' ساری توانائیاں اس فکر میں صرف ہوں گی کہ جتنوں کو بچا سکوں بچا لوں۔ جیسے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا: ''میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ آگ کا ایک الاؤ ہے جو تمہیں نظر نہیں آ رہا اور تم اس میں گر پڑنا چاہتے ہو اور میں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر اس سے دور گھسیٹ رہا ہوں''۔ سمجھانے کی غرض سے اس کی ایک عام سی مثال میں یوں دیا کرتا ہوں کہ آپ ایک سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ آگے سڑک کھدی پڑی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک نابینا آدمی اپنے معمول کے مطابق اس راستے سے گزر رہا ہے' اسے کیا پتا ہے کہ آگے سڑک کھدی ہوئی ہے۔ وہ ذرا آگے بڑھے گا تو آپ چلا کر کہیں گے: او خدا کے بندے! آگے مت بڑھو' ذرا بچو' آگے گڑھا ہے۔ اب فرض کیجیے کہ وہ بہرا بھی ہے اور اس نے آپ کی بات سنی ہی نہیں اور چلتے چلتے وہ گڑھے کے کنارے پر پہنچ گیا ہے تو آپ دوڑ کر اس کے کپڑے پکڑیں گے اور کھینچ کر اس کو بچائیں گے۔ یہی لفظ استعمال کیا حضور ﷺ نے کہ میں تمہارے کپڑے پکڑ پکڑ کر تمہیں بچا رہا ہوں۔

اس حوالے سے آپ کی زندگی میں یہ چیز بہت اہمیت کی حامل ہے کہ آپ کی اقدار کیا ہیں؟ آپ نے کس چیز کو کتنی اہمیت دی ہے؟ آپ کے نزدیک کس چیز کی کتنی قدر و قیمت ہے؟ پھر جو چیز آپ نے اپنے لیے پسند کی ہے وہی اپنے بھائی کے لیے پسند

کیجیے۔ مثلاً اگر آپ اپنے لیے جنت پسند کرتے ہیں تو آپ اپنے بھائی کے لیے بھی جنت پسند کیجیے۔ بھائی سے آگے کزنز اور پھر اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو کر پوری اُمتِ مسلمہ اور پھر پوری نوعِ انسانی تک پھیل جانا چاہیے۔ چنانچہ یہی بات قرآن مجید میں حضور ﷺ کے بارے میں کہی گئی ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۷﴾﴾ (الانبیاء) ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔ یعنی حضور اکرم ﷺ کا دائرۂ رحمت تمام اہلِ عالَم تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ لفظی ترجمہ ہے ''تمام جہانوں کے لیے'' لیکن بعض اوقات عربی زبان میں ظرف کی جمع بول کر مظروف کی جمع مراد ہوتی ہے' تو یہاں بھی ایسا ہی ہے' لہٰذا مفہوم یہ ہوگا کہ اس عالم میں رہنے والے تمام لوگ' تمام قومیں' تمام نسلیں' ان سب کے لیے آپؐ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اب اس رحمت کا کوئی عکس صاحبِ ایمان شخص کی شخصیت کے اندر بھی پیدا ہو جانا چاہیے' اگر حقیقی' واقعی اور اصلی اور قلبی یقین والا ایمان حاصل ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تقسیمِ مراتب

اب آیئے اگلی حدیث کی طرف' اس حدیث کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کبارِ صحابہؓ اور فقہائے صحابہؓ میں سے ہیں —— صحابہ میں ایک تقسیم (classification) ہے کبارِ صحابہ (بڑی عمر کے صحابی) اور صغارِ صحابہ (چھوٹی عمر کے صحابہ) کی۔ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما بھی صحابی ہیں لیکن بچے ہی تھے جب حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا' تو ان کا شمار صغارِ صحابہ میں ہوتا ہے' جبکہ حضرات ابوبکر' عمر' عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا شمار کبارِ صحابہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح صحابہ کی ایک تقسیم فقرائے صحابہ اور اغنیاءِ صحابہ کی ہے۔ صحابہ میں سے بعض فقیر منش لوگ تھے۔ فقراء اس معنی میں کہ وہ بھی دنیا کما سکتے تھے' لیکن انہوں نے دنیا کمانے کا معاملہ بالکل ترک کر دیا۔ گویا اپنے آپ کو صد فیصد حضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلایا۔ اس لیے کہ وحی کے آغاز کے بعد حضور ﷺ نے کسبِ معاش کا کوئی کام نہیں کیا۔ چالیس برس کی عمر میں وحی کا آغاز ہو گیا اور ایک مشن آپ ﷺ کے حوالے کر دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ

فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝﴾ (المدثر) ''اے (محمد ﷺ!) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو' اٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو' اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو!'' اس کے بعد آپ ﷺ کے دن رات کا ایک ایک لمحہ اسی کام میں صرف ہوا۔ آپ ﷺ کے نقش قدم پر بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کیا کہ نہ کوئی مکان بنایا اور نہ کوئی معاش کا ذریعہ اختیار کیا۔ اصحابِ صفہ کی تو گھر گرہستی کی زندگی ہی نہیں تھی۔ وہ تو مسجد کے اندر پڑے رہتے تھے' کہیں سے کسی نے کچھ بھجوا دیا تو کھا لیا' ورنہ بھوکے ہی ہیں اور فاقے پر فاقے آ رہے ہیں۔ اصحابِ صُفّہ میں سے مشہور فقیر منش صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اصحابِ صفہ کے علاوہ بھی چند صحابہ کرامؓ کا شمار فقراءِ صحابہ میں ہوتا تھا' جن میں نمایاں حضرت ابوذر غفاری' حضرت سلمان فارسی' اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہم ہیں۔

پھر صحابہ کی ایک اور تقسیم ہے ''فقہائے صحابہ'' کی' یعنی وہ صحابہ جنہیں دین کا فہم اور دین کا تفقہ گہرائی کے ساتھ حاصل تھا۔ ظاہر بات ہے کہ اس اعتبار سے بھی سب صحابہ برابر تو نہیں تھے' سب کی ذہنی سطح (level of consciousness) ایک طرح کی تو نہیں تھی۔ کسی کے اندر اللہ نے ذہانت زیادہ رکھی تھی اور کسی میں کم۔ تو اس اعتبار سے بھی سب برابر نہیں تھے۔ ع ''خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد!'' — تو وہ صحابہ جن کے اندر دین کا فہم بہت گہرا تھا ان کو فقہائے صحابہ کہتے ہیں اور ان میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اونچا مقام حاصل ہے۔ حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق' معاذ بن جبل اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم بھی فقہائے صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ خواتین میں سے حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہن کا شمار فقہائے صحابہ میں ہوتا ہے۔

خونِ مسلم کی حرمت

بہرحال زیر مطالعہ حدیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ)) ''حلال نہیں ہے کسی مسلمان کا خون'' یعنی کسی مسلمان کا خون کر دینا' کسی مسلمان کی جان لے لینا' کسی مسلمان کو قتل کر دینا جائز نہیں ہے۔ آگے مسلمان کی تعریف بھی کر دی: ((يَشْهَدُ اَنْ

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ)) ''جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں''۔ یہ مسلمان ہونے کی ناگزیر اور واحد شرط ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی شرط نہیں ہے۔ اگر ایک شخص توحید و رسالت کی گواہی دے رہا ہے اور نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو بعض فقہاء کے مطابق ایسے شخص کو بڑی سخت سزا دی جائے گی' اس کو قید میں ڈالا جائے گا' یہاں تک کہ توبہ کرے اور نماز پڑھے' لیکن اسے کافر نہیں قرار دیا جائے گا۔ بعض حضرات کے نزدیک اس کا قتل بھی جائز ہے' لیکن یہ ایک شاذ رائے ہے۔ البتہ اسے سزا دی جائے گی' جیسے چوری پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے' جبکہ قانونی طور پر وہ شخص دائرۂ اسلام سے نہیں نکلے گا۔

ہم نے حدیث جبریلؑ اور ارکانِ اسلام والی حدیث میں پڑھا ہے کہ اسلام میں کلمہ شہادت کے بعد نماز بھی ہے' روزہ بھی ہے' زکوٰۃ بھی ہے اور حج بھی ہے' لیکن یہ سب اضافی چیزیں ہیں۔ اس پر فقہاء کا اتفاق ہے' خاص طور پر امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے وضاحت موجود ہے کہ نماز کا تارک کافر نہیں ہے۔ البتہ نماز کا منکر کافر ہو جائے گا' اس لیے کہ جو مانتا ہی نہیں کہ نماز فرض ہے گویا وہ قرآن کا انکار کر رہا ہے اور جو قرآن کا انکار کر رہا ہے تو وہ اسلام کے دائرے سے نکل گیا۔ اسی طرح تارکِ صوم یعنی روزہ نہ رکھنے والا بھی کافر نہیں ہے' البتہ جو منکر صوم ہو گا وہ کافر ہو جائے گا۔ الغرض جو ضروریاتِ دین میں سے کسی کا بھی انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا' لیکن یہ ایک علیحدہ بات ہے' جبکہ یہاں ایک بنیادی شرط (base line) مقرر کر دی گئی ہے کہ جو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اس کی جان لینا' اس کا قتل کرنا' اس کا خون بہانا جائز نہیں ہے۔

جوازِ قتل کی پہلی صورت: رجم

آگے جوازِ قتل کی صورتوں کا بیان ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ)) ''مگر تین میں سے ایک شکل (میں قتل کا جواز ہے)''۔ (۱) ((اَلثَّیِّبُ الزَّانِیْ)) ''شادی شدہ زانی''۔ یعنی کوئی شادی شدہ شخص اگر زنا کا مرتکب ہوا تو اسے رجم کیا

جائے گا اور رجم بھی قتل ہی کی ایک شکل ہے۔ الہامی شریعتوں میں رجم کی یہ سزا ہمیشہ سے رہی ہے اور تورات میں اس کا ذکر موجود ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے' لیکن نبی اکرم ﷺ نے اپنے دور میں رجم کیا اور رجم کرنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ! میں نے تیری سنت کو زندہ کر دیا۔'' آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بھی شادی شدہ زانیوں کو رجم کیا۔

دراصل یہ دو سزائیں (۱) رجم اور (۲) قتل مرتد' اسلام میں ہیں' لیکن ان دونوں کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ یہ دونوں سزائیں سابق الٰہی قانون ''شریعت موسوی'' میں موجود تھیں اور ان کا ذکر سابقہ آسمانی کتاب تورات میں بھی موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ ایک ہی سلسلۃ الذہب (سنہری زنجیر) کی کڑیاں ہیں' اور بنیادی طور پر دین تو ایک ہی ہے۔ چنانچہ ہماری شریعت میں یہ جو دو قتل ہیں: (۱) قتل مرتد' یعنی کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا' اور (۲) رجم' یعنی جو زانی ہو اور ہو شادی شدہ' تو ان دونوں سزاؤں کی اصل شریعت موسوی ہے اور شریعتِ محمدی میں بھی اسے برقرار رکھا گیا ہے۔

غیر شادی شدہ کے لیے زنا کی سزا سورۃ النور کی ابتدائی آیات میں مذکور ہے کہ زانی اور زانیہ دونوں کو سو سو کوڑے مارو' اور وہ کوڑے بھی برسرعام لگائے جائیں تاکہ مسلمانوں کی ایک جماعت انہیں دیکھے۔ اسی طریقے سے رجم بھی سرعام ہوتا ہے۔

اسلامی سزاؤں کی غرض وغایت: استیصالِ جرم

اسلام میں جو سزاؤں کا تصور ہے وہ درحقیقت جرم کے استیصال کے لیے ہے کہ معاشرے کے اندر دہشت بیٹھ جائے اور لوگوں کو عبرت ہو جائے کہ اگر یہ جرم ہم کریں گے تو ہمیں بھی یہ سزا ملے گی۔ یاد رکھیے کہ جرم اس کے بغیر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آج کی دنیا میں مہذّب ترین اور تعلیم یافتہ ملک امریکہ سے بڑھ کر تو کوئی نہیں' لیکن وہاں کس قدر گھناؤنے جرائم ہوتے ہیں آپ اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہاں تصور یہ ہو گیا ہے کہ جو شخص جرم کرتا ہے وہ نفسیاتی مریض ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مریض سے

دشمنی تو نہیں ہمدردی ہونی چاہیے' اس کی اصلاح ہونی چاہیے اور اس کا علاج کیا جانا چاہیے۔ اسی لیے امریکہ کی جیلوں کو اصلاحی مراکز (corrective centers) کہا جاتا ہے۔ پھر زندگی کی جو بھی ضروریات ہیں وہ بھی انہیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ اب اس کے نتیجے میں لامحالہ جرم کبھی ختم نہیں ہوگا۔

عام طور پر وہاں زیادہ جرائم پیشہ افراد ایفروامریکنز ہیں اور میں کہا کرتا ہوں کہ یہ ایفروامریکنز آج کے امریکیوں سے بدلہ لے رہے ہیں کہ تم ہمارے آباء واَجداد کو آہنی زنجیروں میں جکڑ کر افریقہ سے جانوروں کی طرح جہازوں میں بھر بھر کر لائے تھے اور پھر تم نے انہیں غلام بنایا تھا' ان پر ظلم وتعدّی کے پہاڑ توڑے تھے' اور ان سے وہ کام لیے تھے جو ان کی بساط سے بڑھ کر تھے' تو آج ہم اس کا بدلہ لے رہے ہیں —— بہرحال وہاں ہوتا یہ ہے کہ ایک مجرم نے جرم کیا اور اس کے بعد اس کو ''سزا'' یہ ملی کہ اسے corrective center میں ایک سال رہنا ہے۔ وہ مجرم ایک سال وہاں مزے سے رہا' واپس آیا' پھر جرم کیا اور دوبارہ وہاں پہنچ گیا۔ کیونکہ باہر رہ کر تو محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے اور وہاں بلامشقت تمام سہولیات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح کی سزا سے تو جرم کے خاتمے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہاں یہ چیز بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ ان میں سے جو مسلمان ہو جاتے ہیں وہ پھر جرم کا راستہ ترک کر دیتے ہیں —— اس لیے مسلمان تارکینِ وطن میں سے بہت سے مبلغین بہت عرصے سے وہاں کی جیلوں میں جا کر تبلیغ کرتے ہیں۔ وہ قیدیوں کی دلجوئی کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان اور کچھ تحائف ساتھ لے جاتے ہیں اور انہیں اصلاح کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تبلیغ سے ان میں سے جو مسلمان ہو جاتا ہے وہ دوبارہ وہاں نہیں آتا اور معاشرے میں جا کر ایک امن پسند شہری کی طرح اپنی باقی ماندہ زندگی گزارتا ہے۔ وہاں کی انتظامیہ کے علم میں جب یہ بات آئی تو اس کے بعد اب وہاں پر مسلمان مبلغین اچھی بھلی تنخواہ پر رکھے جاتے ہیں جو جیلوں میں موجود جرائم پیشہ افراد کی اصلاح کرتے ہیں اور اس کے بہت اچھے نتائج بھی نکلتے ہیں۔ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے باقاعدہ اسی پیشے کو اختیار کیا ہے۔

اسلامی سزاؤں کی بدولت سعودی عرب جرائم سے پاک

میں یہ بتارہا تھا کہ جرم کا خاتمہ سخت سزا ہی سے ممکن ہے‘ یعنی ایک آدمی کو سزا دینے سے ہزار کے ہوش ٹھکانے آ جائیں اور ہر کوئی سوچے کہ اگر میں نے یہ کام کیا تو یہی میرا معاملہ ہوگا۔ سعودی عرب کے معاملے میں پوری دنیا میں مانا جاتا ہے کہ وہاں جرائم کی شرح بہت کم‘ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے‘ حالانکہ آلِ سعود کے آنے سے پہلے وہاں بے تحاشا جرم تھے‘ لوٹ مار اور غارت گری عروج پر تھی۔ ایک زمانے میں وہاں حاجیوں کو لوٹا اور قتل کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میرے دادا حج کے لیے گئے تھے تو اُس وقت سمجھا جاتا تھا کہ جو جا رہا ہے اس کی زندگی کا بس خاتمہ ہے۔ اگر وہ واپس آ گیا تو ایک بونس ہے‘ یعنی ایک طرح سے اسے مزید مہلت عمر مل جائے گی۔ اُس دور میں عام طور پر صرف بڑی عمر کے لوگ حج پر جایا کرتے تھے۔ حاجیوں کو جان و مال کا کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ لیکن جب سے آلِ سعود کی حکومت قائم ہوئی ہے تو جرم ختم ہو گیا ہے۔

آلِ سعود کی حکومت اصل میں ایک مشترک حکومت تھی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد جو آلِ شیخ کہلاتے ہیں اور آلِ سعود کے درمیان یہ معاہدہ ہوا کہ ہم مل جل کر جدّوجہد کرتے ہیں اور ایک حکومت قائم کرتے ہیں۔ حکومت کا انتظام آلِ سعود کے پاس رہے گا جبکہ دینی معاملات آلِ شیخ کے پاس رہیں گے (اب بھی وہاں جو عالمِ دین اکثر خطبۂ حج دیتے ہیں ان کے نام کے ساتھ آلِ شیخ موجود ہے‘ یعنی وہ محمد بن عبدالوہاب کی اولاد میں سے ہیں) —— جب آلِ سعود کی حکومت قائم ہوئی تو آلِ شیخ نے وہاں شریعت کے مطابق اسلامی سزاؤں کو نافذ کیا۔ اس سے یہ ہوا کہ جب چوری پر کسی ایک کا ہاتھ کٹا تو چوری ختم ہو گئی۔ اگر کسی علاقے کے اندر کوئی قافلہ لوٹا گیا تو اس علاقے کے لوگوں کو جمع کر لیا گیا کہ تم سب کو سزا ملے گی ورنہ مجرموں کو حاضر کر دو اور مجرم حاضر کر دیے جاتے تھے۔ اسی طرح سے قتل کی سزا قتل ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ ریاض کی جامع مسجد کے باہر میدان میں نمازِ جمعہ کے بعد ہجوم کے سامنے جلاد مجرم کی گردن اڑاتا ہے۔ سب کے سامنے گردن اڑانے کا مقصد یہ ہے کہ عبرت حاصل ہو اور انسان جرم سے دور

بھاگے۔ تو وہاں پر درحقیقت جرم کا خاتمہ اسی سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جرم کو ختم کرنے کا کوئی اور ذریعہ موجود نہیں ہے۔ اگر آپ سمجھیں کہ تعلیم اور تہذیب سے جرم ختم ہو جائے گا تو تعلیم کا معیار امریکی قوم کے معیارِ تعلیم سے اوپر نہیں جا سکتا اور وہ آج دنیا کی مہذب ترین قوم مانی جاتی ہے' لیکن وہاں بھی بدترین جرائم موجود ہیں۔

جوازِ قتل کی دوسری صورت: جان کے بدلے جان

زیر مطالعہ حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے مگر تین صورتوں میں۔ جوازِ قتل کی ایک صورت تو یہ ہے کہ شادی شدہ ہو کر زنا کرے۔ جبکہ دوسری صورت یہ ہے کہ ((اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ)) ''جان کے بدلے جان'' یعنی جس نے قتل عمد کیا ہے تو اس کے جواب میں اسے قتل کیا جائے گا' اِلا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر آمادہ ہو جائیں یا اسے معاف کر دیں۔ یہ اختیار مقتول کے ورثاء کو ہے کسی اور کو نہیں۔ ہمارے ہاں جو یہ قانون ہے کہ صدرِ مملکت کو معاف کرنے کا حق حاصل ہے یہ خلافِ اسلام اور سراسر غلط ہے —— دیکھئے ایک شخص پر قتل کا مقدمہ ہے' سیشن کورٹ نے اسے پھانسی کی سزا دی' ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی تو ہائی کورٹ نے بھی وہ سزا بحال رکھی' پھر سپریم کورٹ میں اپیل ہوئی تو اس نے بھی وہ سزا بحال رکھی' اب وہ صدر کے سامنے رحم کی اپیل (mercy petition) دائر کرے گا اور چاہے گا کہ صدر معاف کر دے —— یہ قطعاً غلط اور خلافِ اسلام ہے۔ کسی کے پاس قاتل کو معاف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہاں مقتول کے ورثاء کے پاس یہ حق موجود ہے اور اس میں بہت بڑی حکمت ہے۔ آپ سوچئے! جیسا کہ ہمارے ہاں' خاص طور پر دیہات میں' اب بھی ہوتا ہے کہ قتل کے بدلے قتل' پھر قتل' پھر قتل اور اس طرح قتل در قتل کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے جو کئی نسلوں تک چلتا ہے۔ اور اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ ایک قاتل کو مقتول کے ورثاء معاف کر دیں تو یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا کہ نہیں؟ یعنی مقتول کے ورثاء نے قاتل کے اوپر اتنا بڑا اکرم اور احسان کیا کہ اس کی جان بخشی کر دی' لہٰذا اب اس کے جواب میں کوئی قتل نہیں ہوگا اور اس طرح قتل کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ یہ قتلِ عمد کی صورت میں ہے' جبکہ قتلِ خطا میں جان کے بدلے جان نہیں بلکہ دیت ہوتی ہے اور اگر اس ضمن میں کسی سرکاری یا حکومتی قانون کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو اس کی سزا الگ ہوگی۔ چنانچہ سعودی عرب میں کسی کی گاڑی کے نیچے آ کر کوئی شخص مر جائے تو دیت تو دینی پڑتی ہے' چاہے ڈرائیور کا ارادہ قتل کا نہیں بھی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ وہاں بہت محتاط ہو کر ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مدینہ منورہ میں دیکھا کہ ایک بڑی عمر کی عورت کو ایک گاڑی نے ذرا ٹچ کیا تو ڈرائیور فوراً اتر کر منت سماجت اور خوشامدیں کرنے لگ گیا کہ ''اے میری ماں' مجھے معاف کر دے!'' اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ اس پر مقدمہ قائم ہو سکتا ہے اور سخت سزا مل سکتی ہے' جبکہ یہاں کون پروا کرتا ہے' اس لیے کہ یہاں دیت کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ وہاں مزید یہ بھی ہے کہ آپ لائسنس کے بغیر ڈرائیونگ کر رہے ہیں تو یہ حکومتی جرم ہو گیا اور اس کا جرمانہ آپ کو الگ سے ادا کرنا ہوگا۔

مجھے ایک واقعہ معلوم ہوا تھا کہ مدینہ یونیورسٹی کے ایک مصری پروفیسر کی کار کے ذریعے ایکسیڈنٹ ہوا اور ایک شخص مر گیا۔ جب مدینہ کے گورنر کے پاس یہ معاملہ گیا تو اس نے کہا: دیکھئے جناب! دیت تو اللہ کی طرف سے ہے' وہ ہم معاف کرنے والے کون ہیں؟ البتہ آپ کا جو دوسرا جرم تھا ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کا تو وہ ہم معاف کر سکتے ہیں' اس لیے کہ وہ ہمارے قانون کی خلاف ورزی ہے۔

جوازِ قتل کی تیسری صورت: قتلِ مرتد

جوازِ قتل کی تیسری صورت یہ ہے: ((وَالتَّارِكُ لِدِيْنِهِ الْمُفَارِقُ لِلْجَمَاعَةِ)) ''جو اپنے دین کو چھوڑ دے اور مسلمانوں کی جماعت سے نکل جائے''۔ اس سے مراد مرتد ہے اور مرتد کی سزا بھی قتل ہے' مگر اس دور میں بعض جدید دانشوروں اور اس وقت دنیا کے اندر رائج جدید فکر کے مطابق ہر انسان کو مذہب بدلنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اہلِ مغرب جو ہماری بہت سی چیزوں پر اعتراض کرتے ہیں' ان کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عیسائی مسلمان ہو جائے تو آپ اسے سینے سے لگاتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان

عیسائی ہو جائے تو آپ اس کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح آزادیٔ خیال اور آزادیٔ اظہارِ رائے جدید تہذیب کے دو نمایاں مندرجات ہیں اور جن کی گھٹی میں اس جدید تہذیب کے جراثیم پڑ گئے ہیں تو اسلام کے یہ احکام ان کی سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں، لیکن بہرحال اسلام کا قانون یہی ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ جدید تہذیب سے متاثر ہو کر ہمارے جدید دانشوروں نے بھی یہ کہنا شروع کیا ہے کہ محض مرتد واجب القتل نہیں ہے، البتہ مرتد ہونے کے بعد اگر وہ اسلامی ریاست کے خلاف کوئی سازش بھی کر رہا ہو تو واجب القتل ہے۔ انہوں نے یہ رائے جدید اثرات کے دباؤ کے تحت قائم کی ہے، ورنہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ مرتد کو قتل کیا جائے گا۔ اس کا اصل حکم بھی تورات میں ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے چالیس دن کے لیے کوہِ طور پر بلایا اور تورات عطا کی تو پیچھے سامری نے ایک بچھڑا بنا دیا —— وہ بچھڑا بنی اسرائیل کے پاس موجود سونا، چاندی اور دوسرے زیورات کو پگھلا کر بنایا گیا تھا اور اس کی ساخت ایسی تھی کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تھی تو اس میں سے بچھڑے جیسی آواز نکلتی تھی۔ سامری نے کہا کہ یہ ہے تمہارا خدا! موسیٰ تو خواہ مخواہ بھٹک کر غلط راستے پر پڑ گیا ہے۔ خدا تو یہاں موجود ہے اور وہ کوہِ طور پر خدا سے ملنے کے لیے گیا ہے۔ تو بنی اسرائیل میں سے بہت سے لوگ بچھڑے کی پرستش کے اندر مبتلا ہو گئے۔ اب یہ کھلا کفر اور شرکِ جلی یعنی بالکل واضح شرک تھا۔

ایک شرک تو وہ ہوتا ہے جو چھپا ہوا ہو، جیسے ریاکاری شرکِ خفی ہے۔ مثلاً اگر آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ دیکھیں کہ کوئی شخص آپ کو دیکھ رہا ہے تو آپ اپنی نماز اور سجدوں کو زیادہ طویل کر دیں تو یہ بھی شرک ہے۔ فرض کریں کہ پہلے آپ کا سجدہ تین سیکنڈ کا ہو رہا تھا اور اب پانچ سیکنڈ کا ہو گیا تو یہ دو اضافی سیکنڈ آپ نے صرف اُس شخص کو دکھانے کے لیے لگائے ہیں، تو یہ بھی شرک ہے، لیکن یہ شرکِ خفی ہے۔ اس پر کوئی حکم اور فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ یہ تو آپ کا اندرونی معاملہ ہے۔ ہمیں اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ یہ ریاکاری کہیں ہمارے اندر پیدا نہ

ہو جائے۔ اس کے بارے میں' میں نے آپ کو وہ حدیث بھی سنائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ' وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ' وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ))(۱) ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی تو اُس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا تو اُس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا تو اُس نے شرک کیا''۔ تو یہ شرکِ خفی ہے' لیکن ظاہر بات ہے کہ بچھڑے کی پرستش شرک جلی تھی اور وہ گویا مرتد ہو گئے۔ لہٰذا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے اور انہوں نے سارا معاملہ دیکھا تو اللہ کا یہ حکم نافذ کیا کہ ہر قبیلے کے وہ لوگ جنہوں نے یہ شرک کیا ہے انہیں اسی قبیلے کے وہ لوگ اپنے ہاتھوں سے ذبح کریں جو شرک سے محفوظ رہے۔ اور تورات بتاتی ہے کہ اس جرم میں ستر ہزار لوگ قتل ہوئے تھے۔ یہ لوگ جب مصر سے نکلے تھے تو چھ لاکھ تھے' ان میں سے ستر ہزار نے وہ جرم کیا اور وہ مرتد ہو کر قتل ہوئے۔ لہٰذا تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے۔

الغرض تین صورتوں کے سوا کسی صورت میں بھی کسی مسلمان کی جان نہیں لی جا سکتی اور وہ تین صورتیں یہ ہیں: (۱) شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے گا' (۲) کسی نے قتل کیا ہے جان بوجھ کر تو جواباً قصاص میں اُسے قتل کیا جائے گا' اِلا یہ کہ مقتول کے ورثاء اسے معاف کر دیں' اور (۳) اگر کسی مسلمان نے اپنا دین ترک کر دیا' بدل دیا تو اسے بھی قتل کر دیا جائے گا' اِلا یہ کہ وہ اس ملک کو چھوڑ کر کہیں چلا جائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ٥٥

(۱) مسند احمد' مسند الشامیین' باب حدیث شداد بن اوس رضی اللہ عنہ' ح ۱۶۵۱۷۔

حدیث

15

اسلامی آدابِ معاشرت

۲۵/ جنوری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ـــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ۝ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان)

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ﷺ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ :

((مَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْرًا اَوْ لِیَصْمُتْ ، وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُكْرِمْ جَارَهٗ ، وَمَنْ كَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُكْرِمْ ضَیْفَهٗ))(۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ہمسائے کی عزت کرے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو اور یومِ آخرت کو مانتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔‘‘

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الرقاق‘ باب حفظ اللسان......وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب الحث علی اکرام الجار والضیف ......

معزز سامعینِ کرام!

امام یحییٰ بن شرف الدین النووی رحمۃ اللہ علیہ کے شہرۂ آفاق مجموعۂ احادیث ''اربعین'' کے سلسلہ وار مطالعہ کے ضمن میں آج ہمارے زیر مطالعہ حدیث نمبر پندرہ ہے۔ اس حدیث اور آگے آنے والی چند احادیث کو ہم ایک مجموعی نام ''اسلامی آدابِ معاشرت'' دے سکتے ہیں۔ ان میں حسنِ معاشرت' حسنِ آداب' شرافت و مروّت' تحمل و بردباری' تہذیب و شائستگی اور اللہ کی نگاہ میں ایک عمدہ شخصیت کے خدوخال کا بیان ہے۔ پھر اس شخصیت کے اوصاف' اس کی صفات اور علامات کا بھی تذکرہ ہے۔

عباد الرحمٰن (اللہ کے محبوب بندوں) کے اوصاف

زیر درس حدیث میں بیان شدہ مضمون قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے حوالے سے کچھ اوصاف بیان کیے ہیں اور انہیں ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' (رحمٰن کے بندے) کا نام دیا ہے۔ ویسے تو تمام مسلمان بلکہ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں' لیکن یہاں پر اللہ کے پسندیدہ اور محبوب بندے مراد ہیں جن سے اللہ محبت کرتا ہے — ان کے چند اوصاف کا تذکرہ بایں طور کیا گیا ہے:

(۱) تواضع و انکساری: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ ''رحمٰن کے (پسندیدہ) بندے وہ ہیں جو زمین میں چلتے ہیں آہستگی کے ساتھ''۔ یعنی اُن کی چال سے تواضع و انکساری نمایاں ہوتی ہے۔ کسی انسان کی چال بتا دیتی ہے کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں: Face is the index of mind یعنی چہرے کا اُتار چڑھاؤ' اس کے رنگ کی تبدیلی اور پیشانی پر آنے والے قطرے بتا دیتے ہیں کہ انسان کی اندرونی کیفیت اس وقت کیا ہے۔ اسی طرح چال سے انسانی ذہن کی کیفیت عیاں ہو جاتی ہے کہ آیا اس میں غرور و تکبر کے جذبات ہیں یا یہ انکساری اور خاکساری کے جذبات سے لبریز ہے۔

چال میں تواضع کا ذکر قرآن مجید میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾﴾ ''اور تم زمین پر اکڑ کر (یعنی زور زور سے پیر مار کر) مت چلو' اس لیے کہ تم زمین کو ہرگز پھاڑ نہیں سکتے اور (کتنی ہی تم گردن اکڑا لو) پہاڑوں کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتے''۔ اسی طرح سورۂ لقمان میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ یقیناً اللہ کسی تکبر اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

(۲) ہٹ دھرمی کے جواب میں بہترین طرزِ عمل: عباد الرحمٰن کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾﴾ ''اور جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں 'جاہل' تو وہ سلامتی والی بات کرتے ہیں''۔ اردو میں جاہل اَن پڑھ کو کہتے ہیں لیکن عربی میں جاہل کے معنی ہیں: جذباتی اور مشتعل مزاج انسان۔ یعنی ایک انسان وہ ہے جو اپنی عقل سے رہنمائی حاصل کرتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں ایک وہ ہے جو جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے' تو اس دوسرے مزاج کے حامل شخص کو عربی میں ''جاہل'' کہتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب کوئی جذباتی اور اکھڑ مزاج شخص اللہ کے بندوں سے الجھنا چاہے یا بحث و تمحیص کرے تو یہ انتہائی ٹھنڈے دماغ سے اُس کا جواب دیتے ہیں۔

نوٹ کیجیے کہ جو اللہ کا بندہ ہوگا وہ یقیناً اللہ کا داعی بھی ہوگا' لیکن اس کی دعوت کا اسلوب بڑا حکیمانہ ہوگا۔ دعوت کا ایک انداز تو یہ ہے کہ آپ جا کر کسی کے سر پر سوار ہو جائیں اور اس سے بحث و تمحیص میں اُلجھتے رہیں۔ وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے تب بھی آپ زبردستی اس سے گفتگو کریں۔ یہ انداز صحیح نہیں ہے' اس لیے کہ اس طریقے سے وہ شخص آپ سے اور آپ کی دعوت سے متنفر ہو جائے گا۔ حکیمانہ انداز تو یہ ہے کہ آپ موقع محل دیکھیں' اپنے مخاطب کی ذہنی کیفیت کو جانچیں۔ اگر آپ دیکھیں کہ اس وقت یہ سمجھنے کے موڈ میں نہیں ہے تو خواہ مخواہ اس کے ساتھ الجھیں نہیں' بلکہ اگر وہ الجھنا بھی چاہے تب بھی آپ اچھے طریقے سے اُس سے الگ ہو جائیں۔ آپ اُس سے کہیں کہ اس وقت آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی اور میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں

آ رہی' لہٰذا پھر کسی وقت گفتگو کریں گے' ان شاء اللہ۔ یعنی سلام کہہ کر اور اچھے طریقے سے رخصت ہو جائیں۔ لٹھ مار کر رخصت نہ ہوں کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع ہی نہ رہے' بلکہ رخصتی اور علیحدگی بھی سنجیدگی اور بہترین طریقے سے ہونی چاہیے۔

(۳) قیام اللیل کا اہتمام: عبادالرحمٰن کی تیسری صفت یہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا﴾ ''وہ لوگ راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے لیے سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے''۔ یعنی وہ قیام اللیل اور تہجد کا اہتمام کرتے ہیں — یہاں رات کی نماز کا ذکر آیا ہے' فرض نمازوں کا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک پختہ اور تعمیر شدہ شخصیت کے نقوش اور خدوخال کا بیان ہے' جس میں فرض نمازوں کی کوتاہی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بلکہ وہ تو نوافل کا بھی تسلسل کے ساتھ اہتمام کرتے ہیں۔

دیکھئے ایک ہے عام مسلمانوں کی سطح۔ اس کے اعتبار سے تو اصل اہمیت نماز پنجگانہ کی ہے' اور یہ بھی یاد رکھیے کہ نفل کسی طور پر بھی فرض نمازوں کا مداوا اور تلافی نہیں کر سکتے۔ آپ ساری رات جاگتے رہیں' لیکن فرض نماز نہ پڑھیں اور فجر کے وقت سو جائیں تو آپ کا ساری رات کا جاگنا زیرو ہو جائے گا۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ذہن نشین رہے کہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَالْفَجْرَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ)) (۱)

''جس شخص نے عشاء اور فجر کی نماز باجماعت پڑھی اُس نے گویا پوری رات کا قیام کیا۔''

تو فرض اور نفل کے اندر یہ فرق ضرور پیش نظر رہنا چاہیے' جبکہ سورۃ الفرقان کی مذکورہ بالا آیت میں فرض کا ذکر اس لیے نہیں ہے کہ یہاں رحمٰن کے ان برگزیدہ بندوں کا تذکرہ ہے جو فرض میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ ایسی ہی شخصیت کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں: ((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ)) ''کسی انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جس کا کوئی فائدہ نہیں''۔ اسی طرح حدیث جبریل میں ہم

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب فی فضل صلاۃ الجماعۃ۔

نے پڑھا تھا کہ پہلا درجہ اسلام ہے‘ پھر ایمان ہے اور پھر بلند ترین درجہ احسان ہے۔ یعنی ایسا شخص جس نے اپنے دین کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ اُس کا اسلام اب دلربا اور دل میں کُھب جانے والا ہے تو وہ بلند ترین درجے پر فائز ہے۔ درحقیقت زیرِ مطالعہ قرآنی آیات اور زیرِ درس حدیث کا موضوع ایسا ہی شخص ہے۔

(۴) نیکیوں پر کوئی غرّا نہیں: اللہ کے محبوب اور چنیدہ بندوں کا ایک وصف یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾﴾

''اور وہ دعا مانگتے رہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم سے جہنم کے عذاب کو پھیر دے‘ کہ اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے''۔ ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾﴾ ''یقیناً وہ بہت بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی''۔ یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم تو دین پر چل رہے ہیں‘ دین کے اعمال سرانجام دے رہے ہیں تو ہمیں جنت ملنی ہی ملنی ہے اور جہنم سے ہمارا چھٹکارا تو لازماً ہو جائے گا—— نہیں‘ اللہ کے بندوں کا یہ رویہ ہرگز نہیں ہوتا۔ اُنہیں اپنی نیکیوں پر کوئی غرور نہیں ہوتا‘ بلکہ وہ تو ہر وقت عذابِ الٰہی سے اور اپنے اعمال کے ضائع ہونے سے ڈرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنی عبادت‘ خدمتِ دین اور اللہ کے دین کے لیے کیے گئے کاموں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ؎

جان دی‘ دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

یعنی اگر اللہ کی راہ میں گردن کٹوا بھی دی تو کیا کارنامہ سرانجام دیا! یہ جان تو اللہ نے دی تھی اور اب ہم نے اس کو واپس سونپ دی‘ اس کے علاوہ مزید تو اُسے کچھ نہیں دیا‘ جبکہ شرافت و مروّت کا تقاضا تو یہ ہے کہ آپ کو کوئی ہدیہ پیش کرے تو آپ اس سے بہتر ہدیہ دینے کی کوشش کریں‘ جیسے فرمایا گیا ہے کہ آپ کو کوئی سلام کرے تو آپ اُس سے بہتر اس کو جواب دیں۔ اس نے السلام علیکم کہا ہے تو آپ جواب میں وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ کہیں اور اللہ مزید توفیق دے تو وبرکاتہ کا بھی اضافہ کیجیے۔

(۵) میانہ روی کی روش پر گامزن: اللہ کے محبوب بندوں کی ایک صفت یہ ہے:
﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ ''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں (خواہ ان کے پاس زیادہ مال ہو) اور نہ ہی بخل سے کام لیتے ہیں' بلکہ اُن کا خرچ ان (دونوں انتہاؤں) کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے''۔ آدمی کو اپنی چادر کے مطابق ہی پاؤں پھیلانے چاہئیں۔ لیکن کبھی انسان نے کوئی ضروری خرچ کرنا ہوتا ہے اور اس طرح کی صورتِ حال میں اگر اپنے پاس کچھ نہیں ہے تو قرض لے کر خرچ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ قرض لینا فی نفسہٖ کوئی بری بات نہیں ہے' حضور اکرم ﷺ بھی قرض لے لیا کرتے تھے' لیکن قرض لوٹانے کی پختہ نیت بہر حال ضروری ہے۔

اس حوالے سے ہمارے ہاں ایک بہت بڑی بیماری ہمارے مذہبی طبقے میں پیدا ہو گئی ہے کہ وہ قرض کے نام پر بھیک مانگتے ہیں۔ جب معلوم ہے کہ ہم یہ قرض واپس کر نہیں سکتے اور ہمارے وسائل ہیں ہی نہیں تو یہ گویا بھیک کی ایک صورت ہے۔ آدمی کو اپنے وسائل کے حساب سے قرض لینا چاہیے' جس کے بارے میں اسے اندازہ ہو کہ میں یہ قرض لوٹا دوں گا۔ ورنہ یہی ہو گا کہ قرض دینے والے صاحب ایک دو مرتبہ یاد دلائیں گے' پھر خاموش ہو جائیں گے۔ سوچیں گے کہ یہ ایک دینی شخصیت ہے لہٰذا معاف کر دو۔ یوں قرض کے نام پر بھیک مانگنا بہت غلط ہے' البتہ قرض لیا جا سکتا ہے — قرضِ حسنہ دینے کی ترغیب بھی ہے — لیکن اس میں ادائیگی کی پختہ نیت ہونی چاہیے اور اسی درجے میں قرض لیا جانا چاہیے جسے آپ کم از کم ظاہری حالات کے مطابق واپس کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔

اچھی بات کہو یا پھر خاموش رہو!

اب ہم زیر مطالعہ حدیث کی طرف آتے ہیں۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے اور اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس میں حضور اکرم ﷺ نے پختہ (mature) شخصیت کے اوصاف بیان فرمائے ہیں

جس کے اندر حسنِ ادب بھی پیدا ہو چکا ہے اور تہذیب و شائستگی بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ)) ''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے یا تو کوئی اچھی بات زبان سے نکالنی چاہیے یا خاموش رہنا چاہیے''۔ کہیں بے تکی باتیں ہو رہی ہیں' خواہ مخوا کا استہزاء اور مذاق ہو رہا ہے' قہقہے لگ رہے ہیں' گپ بازی ہو رہی ہے' طعن و تشنیع ہو رہی ہے' جھوٹ بولا جا رہا ہے' تو ایسی چیزیں اس سطح کی شخصیت کو زیب نہیں دیتیں۔ اُسے چاہیے کہ یا تو کوئی بھلائی اور خیر خواہی کی بات کرے یا پھر خاموشی اختیار کرے' اس لیے کہ خاموشی کے اندر خود ایک بہت بڑا تکلّم ہے' یعنی خاموشی بولتی ہے۔ بسا اوقات انسان تکلّم کی نسبت خاموشی کے ذریعے اپنے جذبات و احساسات کا زیادہ اظہار کرتا ہے اور اس کی خاموشی ہی اس کی ترجمان بن جاتی ہے۔ لہٰذا بولو تو اچھی بات کہو' نصیحت و تذکیر کی بات کرو' لوگوں کی خیر خواہی کی بات کرو' لوگوں کو اچھائی کی دعوت دو' اللہ کا ذکر کرو' ورنہ خاموش رہو!

یاد رکھیے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بولنے کی صلاحیت دی ہے یہ انسان کی چوٹی کی صلاحیت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ بہت سی ایسی صلاحیتیں ہیں جن میں حیوان ہم سے آگے ہیں۔ سماعت اور بصارت فی نفسہٖ بہت بڑی صلاحیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہیں' لیکن بہت سے حیوانات ایسے ہیں جن کی سماعت یا بصارت ہم سے بہت بڑھ کر ہے۔ خاص طور پر گھوڑا سماعت کے معاملے میں بہت حساس ہے۔ گھوڑا سوار کو لے کر جا رہا ہے' اچانک گھوڑے کی کنوتیاں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ گویا کوئی انٹینا ہے جو خطرے کی آہٹ سن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ سوار گھوڑے کے کانوں کو دیکھ کر اندازہ کر لے گا کہ آس پاس کوئی خطرہ موجود ہے۔ اسی طرح بصارت میں بھی بہت سے حیوانات ہم سے آگے ہیں۔ بہت سے شکاری پرندے (مثلاً عقاب) بہت بلندی سے زمین پر پڑی ہوئی چھوٹی سی چیز کو دیکھ لیتے ہیں اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو بغیر روشنی کے دیکھتے ہیں' جبکہ ہم تو روشنی کے محتاج ہیں کہ روشنی ہو گی تو دیکھیں گے ورنہ نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ سمع و بصر بھی اللہ ربّ العالمین کی طرف سے دی ہوئی بڑی چوٹی کی صلاحیتیں ہیں — ارشادِ باری

تعالیٰ ہے:﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾
''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی''۔— لیکن سماعت و بصارت کی صلاحیتیں حیوانات میں بھی ہیں اور حیوانات میں سے بعض میں ہم سے زیادہ ہیں' لیکن انسان میں ''نُطق'' کی جو صلاحیت ہے وہ کسی اور حیوان میں نہیں ہے۔ اس لیے یہ انسان کی چوٹی کی صلاحیت شمار ہوتی ہے اور انسان کو ''حیوانِ ناطق'' یعنی بولنے والا اور اظہار مافی الضمیر کرنے والا حیوان کہا جاتا ہے۔ پھر اظہار مافی الضمیر کے دو پہلو ہیں: (۱) دوسرے کے کلام کو سمجھنا' اور (۲) اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنا۔ یہ دونوں پہلو speech کے ہیں اور ایک ہی پراسیس کے دو حصے ہیں۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ کہیں بیٹھے ہوئے تھے اور آپ کے پاؤں یا جسم کے کسی حصے میں چیونٹی نے کاٹا تو ایک دم آپ کے جسم میں جنبش ہوگی اور آپ کا ہاتھ فوراً متاثرہ حصے تک پہنچے گا۔ اس میں آپ کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ اضطراری حرکت (reflex action) ہے کہ وہاں سے ایک سنسنی (sensation) گزر کر دماغ میں پہنچی' دماغ میں اسے تعبیر کیا گیا کہ کوئی موذی شے اس وقت آپ کے جسم کے فلاں حصے سے چمٹی ہوئی ہے' پھر وہاں سے حکم (order) آیا تو جسم کے اُس حصے کے عضلات (muscles) نے حرکت کی' ورنہ عضلات خودبخود حرکت نہیں کر سکتے۔ اس عمل میں ہمارا سنٹرل نروس سسٹم درمیان میں آتا ہے کہ پہلے اس کا احساس سے متعلق (sensory) حصہ ادراک کرتا ہے اور پھر عمل حرکت (motor function) وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح اظہار مافی الضمیر کے دو پہلوؤں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ آپ نے ایک کلام سنا' اس کو تعبیر (interpret) کیا' پھر اپنے دل میں موجود احساس کو آپ نے بیان کیا۔ یہ دونوں چیزیں سپیچ سنٹر سے متعلق ہیں اور اعلیٰ ترین سطح پر دماغ (brain) کے اندر سب سے بڑا ایریا بھی سپیچ سنٹر ہی کا ہوتا ہے۔

زبان کے استعمال میں احتیاط لازم

''نُطق'' انسان کی سب سے اہم صلاحیت ہے' اس لیے زبان کے صحیح استعمال پر

قرآن وحدیث میں بہت زور دیا گیا ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات وہ کرو جو بالکل سیدھی اور درست ہو''۔ جسے ہم اپنے محاورے میں یوں کہتے ہیں: پہلے تولو' پھر بولو! یعنی ایک بات تمہاری زبان پر آ گئی ہے اور تمہاری طبیعت اس کے بولنے پر آمادہ ہے' لیکن بولنے سے پہلے تم اچھی طرح تول لو کہ تمہیں یہ بات کہنے کا حق حاصل بھی ہے؟ اور جب قیامت کے دن تم اللہ کے حضور کھڑے ہو گے تو کیا تم اس کو حق بجانب ثابت (justify) کر سکو گے کہ اے اللہ! مجھے یہ بات کہنے کا حق تھا۔ یہ سارا احساب کرنے کے بعد زبان کھولو۔ یہی مفہوم ہے: ''قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا'' کا۔

اس سے اگلی آیت میں اس کا نتیجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ اگر تم دو شرطیں پوری کرو' یعنی (۱) دل میں تقویٰ ہو' اور (۲) زبان پر کنٹرول ہو تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ: ﴿يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ ''اللہ تمہارے سارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا''۔ اس لیے کہ زبان کے اوپر کنٹرول بہت مشکل ہے' بولنے میں کوئی طاقت تو لگتی نہیں ہے۔ ذرا سا اپنے احساسات کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اب جو منہ میں آ گیا بک دیا۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ؏ ''بے حیا باش وہر چہ خواہی کُن!'' کہ ایک دفعہ حیا کا پردہ اُٹھ جائے تو پھر آدمی جو چاہے کرتا پھرے۔

اس حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا ایک اور فرمان ملاحظہ ہو ـــــ یہ ایک طویل حدیث کا آخری حصہ ہے ـــــ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا تو میں نے آپ ﷺ سے چند چیزوں کے متعلق سوال کیا۔ آخر میں رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ((اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ)) ''کیا میں تمہیں ان سب کی جڑ کے بارے میں نہ بتاؤں؟'' میں نے عرض کیا: کیوں نہیں یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑی اور فرمایا: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) ''اسے اپنے اوپر روک کر رکھو''۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! کیا گفتگو

کے بارے میں بھی ہمارا مواخذہ ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلاَّ حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) (۱)

''تمہاری ماں تم پر روئے اے معاذ! (یہ ایک محاورہ ہے جو اپنائیت اور ملامت کے ملے جلے جذبات کے لیے استعمال ہوتا ہے) لوگوں کو دوزخ میں ان کے منہ یا نتھنوں کے بل گرانے والی سب سے زیادہ زبان کی کھیتیاں ہی تو ہیں۔''

زبان سے جو لفظ نکلتا ہے وہ ایک بیج بن کر آخرت کی سرزمین میں بویا جاتا ہے۔ اب اگر یہ لفظ برا ہے تو اس سے کانٹے دار پودا اور جھاڑ جھنکاڑ اُگے گا اور قیامت کے دن آپ کو اسے کاٹنا ہوگا — ''حصائد'' کے معنی ہیں کھیتیاں جو کاٹی جاتی ہیں — زمین پر دو قسم کی نباتات ہیں' ایک تو وہ پودا ہے جو موجود رہتا ہے۔ ایک سال آپ اس سے پھل اتار لیتے ہیں تو اگلے سال پھر پھل آ جاتا اور پودا وہی کا وہی رہتا ہے' جبکہ اس کے برعکس ایک فصل ہوتی ہے' مثلاً گندم' چاول یا گنے کی فصل جو ایک بار کاٹنے سے ختم ہو جاتی ہے۔ اس کو کہتے ہیں حَصِید۔ آپ ﷺ نے یہی لفظ استعمال فرمایا: ''حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ'' یعنی لوگوں کی زبانوں کی بوئی ہوئی کھیتیاں ہی ان کو سب سے بڑھ کر جہنم میں گرانے والی شے ہیں۔

زبان کے صحیح استعمال پر جنت کی ضمانت

اس سے ملتی جلتی ایک اور حدیث بھی ہے' جس کو بیان کرنے میں حیا کا پہلو ذرا مانع ہوتا ہے' لیکن رسول اللہ ﷺ کا ہر فرمان حکمت کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ يَتَكَفَّلُ لِيْ مَابَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَابَيْنَ رِجْلَيْهِ اَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ)) (۲)

''جو شخص مجھے اپنے دونوں جبڑوں کے درمیان (یعنی زبان) اور دونوں ٹانگوں کے درمیان (یعنی شرم گاہ) کی ضمانت دیتا ہے (کہ اُس کا غلط استعمال نہیں ہوگا

(۱) سنن الترمذی' ابواب الایمان' باب ماجاء فی حرمة الصلاة۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب الزهد' باب ماجاء فی حفظ اللسان۔

تو) میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔''

آپ ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم مجھے اس بات کی ضمانت دے دو کہ تم اپنے جسم کے دو بہت ہی چھوٹے چھوٹے اعضاء کا غلط استعمال نہیں کرو گے تو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ گویا زبان اور شرمگاہ کے صحیح استعمال سے باقی پورے اعضائے جسم کی حرکات وسکنات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گی اور اگر کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر انسان سے کچھ غلطی ہو بھی گئی تو اللہ معاف فرمائے گا۔ جیسے کہ ماقبل آیت میں ہم نے پڑھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ (الاحزاب)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات وہ کرو جو بالکل سیدھی اور درست ہو۔ اللہ تمہارے سارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔''

اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا اور درست بات کہنا گویا شرط ہے کہ اگر تم یہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال درست کر دے گا۔ لیکن کبھی کبھی انسان سے خطا بھی ہو جاتی ہے — ظاہر بات ہے **الانسان مُرکّبٌ من الخطأ والنسیان** ''انسان تو بھول چوک کا پُتلا ہے''— تو اللہ معاف کر دے گا۔ یہ فلسفہ ہے دین کا۔ آپ کا رخ سیدھا ہے' آپ صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں' لیکن اگر چلنے میں کہیں پاؤں پھسل گیا اور آپ گر گئے تو پھر فوراً کھڑے ہو کر دوبارہ صراطِ مستقیم پر چلنا شروع کر دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس گرنے کو معاف فرمائے گا۔ لیکن اگر زندگی کا رخ ہی ٹیڑھا ہو گیا' تو معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ اب تو جو قدم اُٹھ رہا ہے وہ غلط رخ پر جا رہا ہے اور آپ جتنا آگے بڑھیں گے صراطِ مستقیم سے اتنا ہی دُور ہوتے جائیں گے۔

اگر انسان اللہ کے احکام اور اس کے رسول ﷺ کی سُنّت پر چل رہا ہے' جو اللہ چاہتا ہے وہ کر رہا ہے' عبادتِ رب' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کی جدّوجُہد میں لگا ہوا ہے' اس دوران اگر کوئی خطا ہو گئی' غلطی ہو گئی' لغزش ہو گئی تو وہ معاف ہو جائے گی۔ اس حوالے سے مجھے اپنے میڈیکل کالج کے پانچویں سال کا ایک واقعہ یاد آ جاتا ہے۔ ہمارا

فرسٹ لیکچر سرجری کا ہوتا تھا اور اس کے پروفیسر ڈاکٹر امیر الدین بڑے سخت تھے۔ وہ پانچ منٹ کی مہلت دیا کرتے تھے اور اس کے بعد دروازے بند کرا دیتے تھے۔ اس کے بعد اگر آپ آئیں تو پھر آپ کلاس روم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ ایک دن بارش کی وجہ سے میں ذرا لیٹ ہو گیا تو میں تیز سائیکل چلا کر جلد سے جلد پہنچنا چاہتا تھا۔ اچانک سائیکل پھسلی اور میں گر گیا۔ گرتے ہی بجلی کی مانند میں فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں آج بھی بہت حیران ہوتا ہوں کہ میں جب اُٹھ چکا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں گرا تھا۔ یہ بھی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح غلطی اور گناہ کے معاملے میں بھی ایک طرزِ عمل تو یہ ہے کہ گناہ کے اوپر ڈیرہ لگا لیا جائے' جبکہ ایک یہ ہے کہ گناہ سرزد ہو تو فوراً توبہ کر لی جائے۔ اس کیفیت کو سورۃ النساء میں بایں الفاظ بیان فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ۝١٧﴾

''ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے جو جہالت اور نادانی میں کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں' پس یہی ہیں جن پر اللہ مہربانی کرتا ہے (اور انہیں معاف کر دیتا ہے)۔ اور وہ سب کچھ جاننے والا' حکمت والا ہے۔''

اللہ عزّوجل کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو نو باتوں کا حکم

''اربعین نووی'' کی زیر مطالعہ حدیث میں بیان کیے گئے تین اوصاف میں سے پہلا وصف یہ ہے کہ زبان سے اچھی بات نکالو' زبان کا صحیح استعمال کرو اور یا پھر خاموش رہو' اس لیے کہ بری بات کہنے سے خاموشی بہتر ہے۔ ایک اور حدیث میں بھی خاموشی کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَمَرَنِیْ رَبِّیْ بِتِسْعٍ))(1) ''مجھے میرے رب نے نو باتوں کا حکم دیا ہے'' —— یہ حدیث اس اعتبار سے بڑی ممیّز ہے کہ اس میں حضور اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی ایسا کرو' میں

(1) اخرجه رزين بحواله جامع الاصول فی احادیث الرسول ﷺ لابن الاثیر الجزری: ۱۱/ ۶۸۷۔

تمہیں اس کا حکم دیتا ہوں۔ بعض حدیثوں میں تو یوں آتا ہے: ((اِنِّیْ آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِیْ بِهِنَّ)) ''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے'' —— بلکہ یہاں فرمایا گیا ہے کہ مجھے میرے رب نے ان نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ یہ نو باتیں بہت اونچی اور بلند ہیں۔ گویا یہ انتہائی پختہ' پوری طرح تربیت یافتہ' بہت مہذّب اور شائستہ شخصیت کے اوصاف ہیں۔

وہ نو باتیں یہ ہیں: ① ((خَشْیَةِ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ)) ''اللہ کا خوف (دل میں موجزن) ہو' تنہائی میں بھی اور علی الاعلان بھی''۔ لوگوں کے سامنے تو سب ہی اللہ کے احکام پر چلنے والے بنتے ہیں' مگر اصل صورتِ حال تخلیہ اور تنہائی میں سامنے آتی ہے۔ ② ((وَکَلِمَةِ الْعَدْلِ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضٰی)) ''اور عدل کی بات کروں' غصے اور خوشی کی حالت میں۔'' ③ ((وَالْقَصْدِ فِی الْفَقْرِ وَالْغِنٰی)) ''اور فقر اور آسودگی میں میانہ روی اختیار کروں''۔ یہ وہی بات ہے جو ہم نے ابھی سورۃ الفرقان کے حوالے سے پڑھی ہے۔ ④ ((وَاَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ)) ''اور جو مجھ سے کٹے میں اُس سے جڑوں'' —— جس طریقے سے قرآنی آیات میں ایک ملکوتی غنا ہے اسی طرح اس حدیث کے الفاظ میں ایک آہنگ موجود ہے —— ⑤ ((وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ)) ''اور جو مجھے محروم رکھے میں اُسے عطا کروں۔'' ⑥ ((وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ)) ''اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کروں!''

اس کے بعد ''خاموشی'' کا تذکرہ ہے جس کے لیے میں نے یہ حدیث سنائی ہے: ⑦ ((وَاَنْ یَکُوْنَ صَمْتِیْ فِکْرًا)) ''اور یہ کہ میری خاموشی غور و فکر پر مشتمل ہو''۔ یعنی اس کائنات میں غور و فکر کیا جائے' جیسے قرآن مجید میں کئی مقامات پر غور و فکر کی تلقین کی گئی ہے۔ ⑧ ((وَنُطْقِیْ ذِکْرًا)) ''اور میرا بولنا ذکر پر مشتمل ہو'' —— ذکر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ جیسے کلمات کا ورد کر رہے ہیں' یا جیسے کہ بخاری شریف کی آخری حدیث ہے:

((کَلِمَتَانِ خَفِیْفَتَانِ عَلَی اللِّسَانِ ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ حَبِیْبَتَانِ اِلَی

الرَّحْمٰنِ : سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ)) (۱)

''دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں' میزان میں بہت بھاری ہیں اور رحمان کو بہت پسند ہیں' وہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ!''

آپ ان کلمات کا ورد کر رہے ہیں تو یہ ذکر ہے۔ قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے ہیں یا کسی کو قرآن سکھا رہے ہیں تو یہ بھی ذکر ہے۔ ذکر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ دوسروں کو اللہ کی طرف بلائیں' نیکی کی دعوت دیں اور برائی سے منع کریں۔ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ﴿۴۵﴾﴾ (قٓ) ''نصیحت کیجیے قرآن کے ذریعے سے اس کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے''۔ تو یہ بھی ذکر کی ایک قسم ہے۔

آگے فرمایا: ⑨ ((وَنَظْرِیْ عِبْرَةً)) ''اور میرا دیکھنا عبرت پذیری کا دیکھنا ہو''۔۔۔ عبرت کہتے ہیں عبور کرنے کو' آپ نے دریا عبور کر لیا' ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے تو یہ عبرت ہے۔ اسی طرح عبرت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ آپ نے کوئی شے دیکھی اور اس کی حقیقت تک جا پہنچے۔ دیکھنے کو تو کتا بھی دیکھ رہا ہے کہ گاڑی آ رہی ہے' وہ بھی اس کی زد میں آنے سے بچے گا' آپ بھی بچ گئے تو کون سا فرق ہوا؟ یاد رکھیے کہ حیوان کا دیکھنا اور ہے' انسان کا دیکھنا اور ہے۔ بقول اقبال: ؎

دم چیست؟ پیام است! شنیدی نشنیدی!
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ندیدی!
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

یعنی تم دوسری طرح کا دیکھنا اور دوسری طرح کا سننا سیکھو! تم وہ دیکھنا سیکھو جو انسان کا دیکھنا ہے۔ دیکھو' سبق حاصل کرو اور عبرت حاصل کرو۔

پڑوسی کے حقوق کی اہمیت

اربعین نووی کی زیرِ مطالعہ حدیث میں دوسری چیز حسنِ معاشرت کے حوالے سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب فضل التسبیح۔ وصحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل التھلیل والتسبیح والدعاء۔

یہ ہے:((وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهٗ)) ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے''۔ ''فَلْيُكْرِمْ'' فعل امر ہے اور امر وجوب کے لیے آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ پڑوسی کا اکرام اور اس کے حقوق کی رعایت بہت ضروری ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ نبی اکرم ﷺ کے اس فرمان سے بھی بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا:((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِيْ بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ))(۱) یعنی جبرائیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے حقوق کی اس قدر تاکید کرتے رہے کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ شاید پڑوسی کو وراثت میں حصہ دار بھی بنا دیا جائے گا۔پھر اسی ضمن میں وہ حدیث بھی یاد کیجیے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا آمَنَ بِيْ مَنْ بَاتَ شَبْعَانَ وَجَارُهٗ جَائِعٌ اِلٰى جَنْبِهٖ وَهُوَ يَعْلَمُ بِهٖ)) (۲)
''وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا کہ جو پیٹ بھر کر سو رہا ہو اور اس کے قریب میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو جبکہ اس آدمی کو اس کے بھوکے ہونے کی خبر بھی ہو۔''

ہمسائیگی کے تین درجات

سورۃ النساء (آیت ۳۶) میں ہمسائیگی کے تین درجات کا بیان ہے اور ان سے حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے:﴿وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ ''اور (حسنِ سلوک کرو) قرابت دار ہمسائے اور اجنبی ہمسائے اور ہم نشین ساتھی کے ساتھ۔''

پہلا درجہ: رشتہ دار پڑوسی: پڑوس کا پہلا اور سب سے اہم درجہ رشتہ دار پڑوسی کا ہے' اس لیے کہ اس میں تو دو حق جمع ہو گئے' ایک قرابت داری کا اور دوسرا ہمسائیگی کا۔اس طرح معاملہ اور زیادہ گھمبیر ہو گیا اور اس کے حقوق کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی۔اس کے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الوصاة بالجار۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب الوصية بالجار والاحسان اليه۔

(۲) رواه البزار والطبرانی فی الکبیر (بحواله معارف الحديث)' راوی: حضرت انس رضی اللہ عنہ۔

برعکس معاملے کے حوالے سے ہمیں وہ حدیث ملتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ)) ''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں''۔ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لرز گئے ہوں گے کہ کون بدبخت ہے جس کے بارے میں حضور ﷺ تین مرتبہ قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی فرمارہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! آپ یہ کس کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَایِقَہٗ))(۱) ''وہ شخص جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے''۔ یعنی انسان بداخلاق ہے اور اُس کے ساتھ رہنے والا پڑوسی ڈرتا رہتا ہے کہ پتا نہیں کب کیا زبان سے کہہ دے۔ ظاہر بات ہے کہ اس صورتِ حال میں ایک شریف اور سفید پوش آدمی اس بداخلاق شخص کی ایذا رسانی اور کج خلقی سے اپنے آپ کو اور اپنی عزت کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں آپ ﷺ نے تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ وہ ہرگز مؤمن نہیں ہے۔

الغرض پڑوس کا پہلا درجہ رشتہ دار پڑوسی کا ہے۔ پچھلے دور میں اور خاص طور پر دیہات میں ایسی بستیاں ہوتی تھیں جن میں بالعموم ایک برادری اور خاندان کے لوگ ہی رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر وہاں ''حقِ شُفعہ'' بھی ہوتا تھا۔ اس لیے کہ اگر وہاں رہنے والا کوئی شخص اپنی جائیداد کسی اجنبی کو بیچ کر چلا جائے تو اس معاشرتی دائرے میں ایک اجنبی کے آ جانے سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں' لہٰذا وہاں رہنے والوں کو شُفعہ کا حق حاصل ہوتا ہے۔

<u>دوسرا درجہ: اجنبی پڑوسی</u>: رشتہ دار پڑوسی کے بعد اجنبی پڑوسی کا درجہ ہے۔ یعنی اس سے کوئی رشتہ داری تو نہیں ہے لیکن پڑوس کا معاملہ ہے۔ بعض احادیث میں تو یہاں تک تصریح موجود ہے کہ پڑوس کی حدود چالیس گھروں تک ہے' جبکہ ہمارا موجودہ معاشرہ تو

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یأمن جارہ بوایقہٗ۔وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم ایذاء الجار۔

اس چیز سے بالکل محروم ہو چکا ہے' یہاں تک کہ ایک دیوار کے فاصلے پر رہنے والوں کا بھی ایک دوسرے سے سالہا سال تک تعارف نہیں ہوتا۔ کسی کو کوئی خیال ہی نہیں آتا کہ میری دیوار کے ساتھ کون رہ رہا ہے۔

شہری زندگی میں تو انسان اپنی ذات' اپنے معاملات اور اپنے مسائل کے اندر اس طرح سے گھرا ہوا ہے کہ یہ جو ''حسنِ معاشرت'' نام کی چیز ہے وہ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ ہاں کہیں کہیں اس کے آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ بعض نئی بستیاں جب بنتی ہیں تو وہاں کے لوگ مل کر کوئی ایسوسی ایشن بنا لیتے ہیں اور صبح کے وقت بزرگ لوگ ایک گروپ کی شکل میں سیر کے لیے نکلتے ہیں اور مسجدوں کے اندر مل بیٹھتے ہیں۔ یہ صرف بعض جگہوں پر ہے' لیکن اکثر و بیشتر جگہوں پر حسن معاشرت کا معاملہ بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اب تو جو جتنی جدید تر آبادی ہوگی اتنی ہی حسن معاشرت سے محروم ہوگی۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ محلات جیسے بڑے بڑے مکان بن رہے ہیں اور ایک دوسرے کو جاننے کے مواقع معدوم ہو چکے ہیں۔ ورنہ پہلے چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے تھے اور کسی گھر سے رونے کی آواز بلند ہوتی تھی تو پڑوس والے فوراً پہنچ جاتے تھے کہ کوئی مسئلہ ہے' جا کر پتا کریں۔ بڑے بڑے مکانوں میں کیا پتا چلے گا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

تیسرا درجہ: عارضی پڑوس: پڑوس کا تیسرا درجہ ''اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' ہے۔ یعنی جو تمہارا ہم نشین ہے' تمہارے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور جس کے ساتھ آپ کی عارضی قربت اور مجاورت ہے وہ بھی ایک طرح کا پڑوس ہے۔ مثلاً آپ بس یا ٹرین میں کہیں جا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ والی سیٹ پر جو بیٹھا ہے وہ آپ کا پڑوسی ہے۔ اس عارضی پڑوسی کا لحاظ رکھنا اور اس کا حق ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

مہمان نوازی: شیوۂ مؤمن

زیرِ درس حدیث میں تیسری بات رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی: ((وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ)) ''جو شخص بھی واقعتاً ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخر پر اس پر لازم ہے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے''۔ دراصل یہ انسانی سیرت و

کردار کے وہ موتی ہیں جو ہمیشہ انسان میں تھے' بلکہ جتنا بھی تمدن ابھی ''پس ماندہ'' تھا اتنی ہی یہ صفات وہاں زیادہ تھیں۔ جیسے جیسے شہری زندگی (urbanization) آئی ہے یہ چیزیں ختم ہوگئی ہیں۔ مہمان نوازی کے حوالے سے ہمیں عہدِ نبوی وعہدِ صحابہ میں تو ایسے ایسے واقعات ملتے ہیں کہ انسان عش عش کر اُٹھتا ہے۔ یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ ایک صحابی ایک مہمان کو گھر لے گئے' جبکہ گھر میں صرف اپنے بچوں کے کھانے کے لیے ہی کچھ تھا۔ تو صحابیؓ نے بچوں کو بھوکا سُلا کر وہ کھانا مہمان کے سامنے رکھ دیا اور چراغ بجھا کر اس کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھ گئے۔ ساتھ بیٹھ کر اسے یہ تاثر دیتے رہے کہ وہ بھی کھا رہے ہیں' حالانکہ وہ نہیں کھا رہے تھے' اس لیے کہ اُنہیں معلوم تھا کہ کھانا اتنا ہی ہے کہ وہ صرف مہمان کے لیے کفایت کرے گا۔ الغرض مہمان نوازی کے حوالے سے ایسے واقعات ہماری تاریخ میں ملتے ہیں جن سے اُس دور کے حسنِ معاشرت کا پتا چلتا ہے جس سے آج کا یہ معاشرہ محروم ہے۔

انسانی کردار کے بنیادی موتی اور ہیرے جواہرات آپ کو بہ نسبت شہری زندگی کے دیہاتی علاقوں میں زیادہ ملیں گے۔ اس لیے بھی کہ شہری زندگی میں کچھ مجبوریاں بھی پیدا ہوگئیں ہیں' یہاں مہمانوں کی آمد ورفت بھی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دیہات وغیرہ میں مہمان روز روز نہیں آتے' جبکہ شہری زندگی میں اس وقت یہ صورت بن گئی ہے کہ دیہات سے کوئی مقدمے بازی کے سلسلے میں آ رہا ہے' کوئی خرید و فروخت کے سلسلے میں آ رہا ہے' لیکن شہر سے دیہات کے اندر جانا بہت شاذ ہوتا ہے' چنانچہ شہر والوں پر اس طرح کے مہمانوں کی مہمان نوازی شاق گزرتی ہے۔ میرا اپنا معمول یہ ہے کہ ظہر سے عصر تک میں ذرا علیحدہ رہتا ہوں۔ ظہر کی نماز اور کھانے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ کرتا ہوں۔ اب اگر اس وقت کوئی صاحب مجھ سے ملنے آ جائیں تو سچی بات یہ ہے کہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگر میں ان کی کچھ آؤ بھگت کروں گا بھی تو یوں سمجھئے کہ اپنے اوپر جبر کر کے کروں گا۔ اور جب مجھے یہ پتا چلے کہ یہ صاحب خریداری کرنے آئے تھے یا شہر میں کوئی اور کام تھا وہ کر لیا ہے تو اب ذرا دوپہر کے

وقفے میں وہ میرے پاس آ گئے ہیں تو اس سے ایک کوفت کی شکل بنتی ہے۔ یہ چیزیں نفسیاتی طور پر اثر انداز ہوتی ہیں' لیکن بہر حال جو حکم ہے وہ اپنی جگہ قائم رہے گا' کہ انسان اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

اگر ہم میں سے بہت سے لوگوں کا رہن سہن دوبارہ سے اسی طرح ہو جائے جیسے کبھی پہلے ہوا کرتا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اوصاف بھی لوٹ آئیں گے۔ ان اوصاف کا ختم ہو جانا اصل میں شہری زندگی کی خرابی ہے۔ شاید آپ کے علم میں ہو کہ حضور اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے جو علامہ اقبال نے مسولینی کو جب سنائی تو وہ حیران رہ گیا۔ حدیث یہ ہے کہ جب کسی شہر کی آبادی پانچ لاکھ ہو جائے تو اُس کو چھوڑ کر نیا شہر آباد کرو۔ یہ جو کروڑوں کی آبادی کے شہر ہیں' مثلاً کراچی کی آبادی سوا کروڑ ہے تو وہاں مدنیت (urbanization) نے جو مشکلات پیدا کر دی ہیں وہ انتہا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر جرمنی میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے جو بہت کامیاب رہا ہے۔ انہوں نے اپنی انڈسٹری کو پورے ملک میں پھیلا دیا۔ یہ نہیں کہ انڈسٹریل ٹاؤن علیحدہ بن رہے ہیں' بلکہ بیس' تیس میل کے فاصلے پر ایک فیکٹری ہے' اس کے ساتھ ہی آبادی ہو گئی اور پھر اس کے ساتھ ہی سکول اور ہسپتال بن گئے تو گویا ایک یونٹ بن گیا۔ پھر بیس تیس میل کے بعد اس طرح کا ایک اور یونٹ بنا دیا گیا۔ اس سے یہ ہوا کہ ان کے ہاں مدنیت اور تمدن ایک بہتر شکل کے اندر برقرار رہتا ہے۔

حاتم طائی کی مہمان نوازی

مہمان نوازی کے ضمن میں حاتم طائی کا ایک واقعہ تاریخی طور پر بہت مشہور ہے۔ یہ عیسائی تھے' لیکن بہت بڑے مخیّر اور سخی انسان تھے —— ان کے بیٹے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ حضور ﷺ پر ایمان لائے اور صحابی کے درجے پر پہنچے ہیں —— حاتم کے پاس ایک گھوڑا تھا جو بہت عمدہ' بہت قیمتی اور بہت اعلیٰ نسل ہونے کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ ایک روز ان کے ہاں ایک مہمان آ گیا اور ان کے پاس مہمان کو کھلانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی تو انہوں نے وہ گھوڑا ذبح کر کے اس مہمان کو کھلا دیا۔ اس کے بعد مہمان سے آنے کی وجہ

دریافت کی تو اُس نے کہا: میں نے سنا ہے کہ آپ کسی سائل کا سوال رد نہیں کرتے' آپ کے پاس ایک بہت عمدہ اور قیمتی گھوڑا ہے' میں آپ سے وہ لینے آیا ہوں۔ حاتم طائی نے کہا: بھئی وہ گھوڑا تو میں نے ذبح کر کے تمہیں کھلا دیا۔

ذرا ملاحظہ کیجیے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے اُن کی تحسین فرمائی اور پھر اُن کی بیٹی جو ایک غزوہ میں باندی کی حیثیت سے مالِ غنیمت میں آئی تو آپ ﷺ نے اُس کی عزت و تکریم کی اور اُسے اپنی چادر اوڑھائی' اس لیے کہ یہ حاتم کی بیٹی ہے۔

خلاصہ کلام

زیر درس حدیث میں تین اوصاف بیان ہوئے ہیں جو ایک پختہ تعمیر شدہ شخصیت کے اوصاف ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اگر بولو تو خیر اور بھلائی کا کلمہ زبان سے نکالو ورنہ خاموش رہو۔ دوسرا یہ ہے کہ اپنے پڑوسی کے حقوق کا لحاظ رکھو۔ اس کے جذبات' ضروریات اور اس کے احساسات سب کا خیال رکھو۔ احساسات کے معاملے میں تو یہاں تک تعلیم دی گئی ہے کہ اگر تم اپنے بچوں کے لیے کوئی پھل لے کر آؤ تو اب دو صورتیں ہیں: یا تو اپنے پڑوسی کے ہاں بھی بھیجو۔ اور اگر اتنی کم مقدار میں ہے کہ آپ کے بچوں کے لیے بمشکل پورا ہوگا تو کم سے کم چھلکے باہر مت ڈالو۔ ورنہ یہ ہوگا کہ چھلکے دروازے کے باہر پھینکنے سے پڑوس کے بچے دیکھیں گے کہ آج ان کے ہاں آم یا خربوزے آئے ہیں تو انہیں حسرت ہوگی۔ تو اس درجے پڑوسی کے احساسات کا لحاظ رکھنے کا حکم ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ مہمان کا اکرام کیا جائے اور مہمان کے آنے پر ناک بھوں نہ چڑھائی جائے' بلکہ اُسے رحمت سمجھا جائے —— اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصافِ حمیدہ کو صحیح معنوں میں اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ OO

حدیث

16

غُصّہ کی ممانعت

یکم فروری ۲۰۰۸ء کا خطبہ جمعہ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ــــ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آل عمران)

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ' اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ : اَوْصِنِيْ ' قَالَ :
((لَا تَغْضَبْ)) فَرَدَّدَ مِرَارًا' قَالَ :((لَا تَغْضَبْ)) (۱)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: آپؐ مجھے وصیت فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا:

''غصہ نہ کیا کرو!'' اُس نے بار بار اپنا سوال دہرایا۔ آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ ''غصہ نہ کیا کرو!''

معزز سامعین کرام!

''اربعینِ نوویؒ'' کی حدیث ۱۶ آج ہمارے زیرِ مطالعہ ہے اور اس حدیث میں شدت اور تکرار کے ساتھ غصہ کی ممانعت کا ذکر ہے۔ اس کے لیے تمہیداً میں نے سورۂ آلِ عمران کی دو آیات تلاوت کی ہیں۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''(اے مسلمانو!) مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت کے حصول کی طرف'' ـــ مسارعت

(۱) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب الحذر من الغضب

کے معنی ہیں: تیز دوڑنے کے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا۔ آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے مسلمانو! اپنے رب کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ ﴿وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ﴾ ''اور (مسابقت کرو) جنت کے حصول کے لیے جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین جتنا ہے''۔ ﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''جو تیار کی گئی ہے (اور سجائی گئی ہے) اہل تقویٰ کے لیے۔''

انفاق فی سبیل اللہ: اہلِ تقویٰ کا وصف

اگلی آیت میں اہل تقویٰ کے کچھ اوصاف مذکور ہیں، جن میں پہلا وصف یہ بیان ہوا ہے: ﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ ''وہ لوگ جو (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں کشادگی میں بھی اور تنگی میں بھی'' — اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دو جہتیں ہیں: (۱) اللہ کی رضا کے لیے اُس کے بندوں میں سے جو محتاج ہوں اور جن کو کوئی ضرورت لاحق ہو اُن کی مدد کرنا۔ اس مد میں یتیم، بیوائیں، مساکین اور مقروض سب آ جائیں گے۔ (۲) دوسرا یہ کہ اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا۔ مثلاً دین کی تعلیم اور تعلّم کا کوئی نظام بنانا، دین کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے اپنے زمانے میں موجود سارے ذرائع و وسائل کو استعمال کرنا اور ان کے لیے خرچ کرنا، ان سب کا شمار اس دوسری مد میں ہوگا۔

آپ کو معلوم ہے کہ آج کل مختلف ممالک میں اسلامی تعلیمات کو اُجاگر کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے ٹی وی چینلز چل رہے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ لوگوں کی دلچسپی کے لیے انہیں اس میں کچھ چیزیں ایسی بھی شامل کرنی پڑتی ہیں جو لوگوں کی توجہ کا باعث ہوں اور پھر مختلف قسم کے اشتہارات بھی شامل کرنے پڑتے ہیں تاکہ خرچ پورا ہو سکے۔ لیکن اس وقت پوری دنیا میں کم سے کم ایک مکمل ٹی وی چینل ایسا ہے جس کی بنیاد خالصتاً دین پر رکھی گئی ہے اور یہ چینل ''پیس ٹی وی'' ہے جو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے شروع کیا اور اس کے ساتھ بہت لوگوں نے تعاون کیا ہے۔ پھر اس چینل کو چلانے کے لیے انہیں کتنا خرچ پڑا، اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کروڑوں روپے چاہئیں ہوتے ہیں کسی بھی چینل کو

چلانے کے لیے۔ خاص طور پر ''پیس ٹی وی'' جیسے اسلامی چینل کو چلانا اور بھی مشکل ہے' اس لیے کہ اس میں کوئی قابل اعتراض اشتہار نہیں چلتا' کسی بینک یا کسی انشورنس کمپنی کا اشتہار نہیں چلایا جاتا اور نہ ہی کسی عورت کی تصویر دی جاتی ہے۔ اس چینل پر اشتہار بھی صرف وہی آئے گا جو ہر طرح کے حرام کاروبار سے خالص اور پاک ہو۔ اگر کوئی ایسا اشتہار ہے تو وہ اس چینل پر چلے گا' ورنہ نہیں' جبکہ ابتدا میں تو اُن کے پاس ایسا کوئی اشتہار تھا ہی نہیں۔ بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دو جہتیں ہیں: ایک ہے ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنا اور دوسرا ہے دین کی ترویج اور نشر و اشاعت کے لیے کسی طور پر بھی خرچ کرنا۔

آیت کے اس ٹکڑے کے حوالے سے دوسری نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ اس میں فرمایا گیا: ﴿فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ یعنی اہلِ تقویٰ وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں خوشحالی اور تنگی دونوں صورتوں میں خرچ کرتے ہیں۔ خوشحالی کے دنوں میں تو آدمی کے پاس کافی مال ہوتا ہے اور ایسی صورتِ حال میں اگر وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہے تو اس کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا' لیکن اگر خود تنگی محسوس کر رہا ہے اور پھر بھی خرچ کر رہا ہے تو یہ گویا اس سے اگلا اور مستحسن قدم ہے۔

اہلِ تقویٰ کا دوسرا وصف: غصہ کو پی جانا اور درگزر کرنا

آگے اہل تقویٰ کا دوسرا وصف یہ بیان ہوا ہے: ﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ﴾ ''اور وہ لوگ اپنے غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے والے ہیں''۔ ظاہر بات ہے کہ کسی شخص کی غلطی اور خطا پر غصہ تو آتا ہے' یا کسی نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو آپ کو غصہ آئے گا۔ بہرحال جس صورت میں بھی غصہ آئے تو اپنے غصے کو پی جاؤ اور لوگوں کو معاف کرو۔ اس لیے کہ یہی اہلِ ایمان اور اہلِ تقویٰ کا شیوہ ہے۔ غصہ کو پی جانا اور معاف کر دینا' درحقیقت ایک ہی کام کے دو رخ ہیں۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣٤﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ کو ایسے محسنین بہت پسند ہیں'' — یہاں نوٹ کر لیجیے کہ یہ وہی درجہ احسان ہے جو ہم حدیثِ جبریل کے ضمن

میں بڑی تفصیل سے پڑھ چکے ہیں اور بعض دوسری احادیث کے ضمن میں بھی اس پر گفتگو ہوتی رہی ہے اور اگلی حدیث میں' ان شاء اللہ' اس کا ذکر پھر آئے گا ـــــ آیت کے اس آخری ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے محسنین بہت پسند ہیں جو اپنے دین کو خوبصورت بنا دیں' ان کا دین اور ان کی دینی زندگی دل کو لبھانے والی اور لوگوں کو پسند آنے والی ہو۔

حدیث کی تشریح

اب ہم حدیث کی طرف آتے ہیں۔ آج ہمارے زیر مطالعہ جو حدیث ہے' اس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ ﷺ: اَوْصِنِيْ ''ایک آدمی نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمایئے!'' اَوْصٰى يُوْصِيْ اِيْصَاءً (بابِ افعال) کے معنی ہیں: ''وصیت کرنا'' جبکہ وَصّٰى يُوَصِّي تَوْصِيَةً (باب تفعیل) کے معنی ہیں: تدریجاً اور مسلسل وصیت کرتے رہنا۔ زیر مطالعہ حدیث میں اَوْصِنِيْ کے الفاظ ہیں' جس کے معنی ہیں کہ مجھے وصیت کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَغْضَبْ)) ''تم غصہ نہ کیا کرو''۔ یعنی تم مغلوب الغضب نہ ہو جایا کرو' بایں طور کہ مبادا غصہ آئے تو تم پر چھا جائے اور تمہارے اوپر اپنا غلبہ کر دے۔ راوی بیان کرتے ہیں کہ فَرَدَّدَ مِرَارًا ''اُس شخص نے بار بار یہی سوال دہرایا''۔ اس شخص کے دل میں شاید کوئی اور بات تھی' تو اُس نے پھر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے وصیت کیجیے۔ اور پھر وہ بار بار یہی کہتا رہا تو نبی اکرم ﷺ نے ہر بار یہی فرمایا: ((لَا تَغْضَبْ)) ''تم غصہ نہ کیا کرو!''

غصے کے حوالے سے انسان کی تین قسمیں

اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ غصہ آ جانا ایک فطری بات ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے غصہ انسان کی فطرت میں رکھا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت حسن بصریؒ کا ایک قول بڑا حکیمانہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غصے کے حوالے سے انسان تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو پورا اور مکمل انسان ہے' ایک وہ ہے جو آدھا انسان ہے' یعنی جو

انسانیت کے معیار پر مکمل پورا نہیں اترتا' البتہ نصف تک آجاتا ہے۔ جبکہ تیسرا ان دونوں کے برعکس ہے اور وہ ہے: لَيْسَ بِرَجُلٍ یعنی اُس میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں' بلکہ وہ حیوان ہے۔ پورا انسان تو وہ ہوتا ہے جسے دیر میں غصہ آئے اور جلدی رفع ہو جائے۔ آدھا انسان وہ ہے جسے غصہ جلدی آئے اور جلدی رفع ہو جائے یا دیر میں غصہ آئے اور دیر میں رفع ہو۔ یعنی جلدی غصہ آیا اور جلدی ختم بھی ہو گیا' یا دیر میں غصہ آیا اور جانے میں بھی دیر لگا دی تو یہ دونوں برابر ہیں۔ تیسرا شخص وہ ہے کہ جسے جلدی غصہ آئے اور دیر میں جائے۔ ایسا انسان اخلاقی اعتبار سے انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔ لہٰذا غضب کے اعتبار سے یہ تین درجے ہمارے سامنے ضرور رہنے چاہئیں اور ہمیں مکمل انسان بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جلالی طبیعت

اس حوالے سے یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مختلف مزاج بنائے ہیں۔ بعض میں جمال اور رحم کا عنصر زیادہ ہوتا ہے' جبکہ بعض لوگ جلالی مزاج کے ہوتے ہیں۔ طبائع اور مزاج کا یہ فرق ہمارے بزرگوں اور دین دار لوگوں میں بھی ہوتا ہے' حتیٰ کہ انبیاء ورسل علیہم السلام میں بھی یہ فرق نمایاں ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام جلالی طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کی جلالی طبیعت کو واضح کرنے والے کئی واقعات قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ ایک واقعہ تو بہت معروف ہے کہ ایک قبطی اور ایک اسرائیلی کا کسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہاں سے گزرے تو اسرائیلی نے آپؑ سے مدد مانگی۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کو ایک مُکا رسید کیا اور اس کی جان نکال دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلال کا سب سے بڑا نقشہ جو قرآن مجید میں آتا ہے وہ بنی اسرائیل کے شرک میں ملوث ہونے کے موقع پر تھا جب آپ کوہِ طور پر گئے ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ہجرت کی اجازت دی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے نکل آئے' اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو پار گزار دیا۔ اس کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ انہیں شریعت دی جائے۔ اس لیے کہ یہ اللہ کا قانون ہے کہ ہجرت

کے بعد شریعت آتی ہے' جبکہ ہجرت سے پہلے کا وقت تو ایک کشاکش کے اندر گزرتا ہے۔

یہی قانون ہمیں سیرتِ محمدی ﷺ میں بھی نمایاں نظر آتا ہے' بایں طور کہ آپؐ کے مکہ کے بارہ سال ایک کشاکش (جسے عام طور پر کشمکش کہہ دیتے ہیں) اور ایک جِدّوجُہد میں گزرے ہیں۔ اس میں مصیبتیں ہیں' تکلیفیں ہیں' ماریں کھائی جا رہی ہیں' وغیرہ وغیرہ' لیکن اس دور میں تفصیلی شریعت نہیں تھی' اس لیے کہ ابھی تفصیلی شریعت دیے جانے کا موقع نہیں تھا۔ سن گیارہ نبوی میں ہجرت سے ایک ڈیڑھ سال پہلے نماز فرض ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اُس وقت تک زکوٰۃ کا بھی کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا کہ اتنے مال میں اتنی زکوٰۃ ہے۔ البتہ لفظ زکوٰۃ اُس دور میں اگر آیا ہے تو وہ عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے کہ اپنے اموال میں سے صدقہ خیرات نکال کر اُسے پاک کرتے رہو۔ الغرض ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے لیے شریعت نازل ہوئی۔ اس شریعت کا ابتدائی خاکہ (بلیو پرنٹ) سورۃ البقرۃ میں تیار ہوا ہے' جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ اس کی تکمیل کی سورتیں ہیں۔ [آپ میں سے بہت سے حضرات جانتے ہوں گے کہ کوئی بھی عمارت بنانی ہو تو اس کا جو نقشہ بنتا ہے وہ نیلے کاغذ پر بنتا ہے اور اس کو بلیو پرنٹ (یا ایمونیا پرنٹ) کہا جاتا ہے۔]

بہرحال جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہِ طور پر چالیس دن کے لیے طلب کیا — اس کو ہم چِلّہ بھی کہہ سکتے ہیں' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے چالیس روز کی ریاضت کروائی اور عبادت و ذکرِ الٰہی کرایا — اس کے بعد انہیں اللہ نے تورات عطا فرمادی۔ اس ضمن میں آپ کو یاد آ جانا چاہیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے بھی قرآن مجید کے نزول سے قبل اسی طرح کا معاملہ غارِ حرا میں کیا گیا۔ آپؐ کی وہاں پر جو خلوت گزینی ہوتی تھی اور وہاں پر آپؐ جو بھی عبادات کیا کرتے تھے اس کی تفصیلات تو ہمیں معلوم نہیں ہیں' لیکن یہ ضرور ہے کہ آپؐ نے تخلیہ فرمایا۔ غارِ حرا میں آپ ﷺ کے اس تخلیہ کے حوالے سے عام طور پر محدثین یہ کہتے ہیں: **كان صفة تعبّده في غار حراء التفكر والاعتبار** کہ غارِ حرا میں آپ ﷺ کی عبادت دراصل غور و فکر پر مشتمل تھی۔ آپؐ غور و فکر

کرتے تھے کہ یہ کائنات کیا ہے‘ اس کا نظام کون چلا رہا ہے‘ ہمارا معاشرہ کدھر جا رہا ہے‘ یہ خرابیاں کیوں بڑھ رہی ہیں‘ انسان انسان کا خون کیوں کرتا ہے؟ یہ کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور کچھ لوگوں کے پاس بہت دولت جمع ہو گئی ہے۔ الغرض غارِ حرا میں آپؐ کی عبادات کی حقیقت اور تفصیلات اگرچہ ہمیں معلوم نہیں ہیں‘ مگر بہر حال تخلیہ اور غار میں آپ ﷺ کا قیام اپنی جگہ ثابت ہے۔

بنی اسرائیل کا شرکِ جلی (بچھڑے کی پوجا کرنا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی کوہِ طور پر چالیس دن تخلیہ کا یہ معاملہ ہوا اور پھر انہیں اَلواح دے دی گئیں۔ یہ پتھر کی تختیاں تھیں اور ان کے اوپر احکامِ عشرہ (Ten Commandments) کندہ تھے جو کہ شریعت موسوی کے اساس ہیں۔ پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں سامری کو موقع مل گیا اور اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے ایک شعبدہ دکھایا اور آلِ فرعون کے زیورات سے ایک بچھڑا بنا ڈالا — آلِ فرعون اپنے زیورات بنی اسرائیل کے پاس امانتاً رکھا کرتے تھے۔ یعنی انہیں بھی اندازہ تھا کہ یہ اسرائیلی بد دیانت اور خائن نہیں ہو سکتے‘ اس لیے کہ یہ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ اگرچہ ان میں اور خرابیاں آ گئی ہوں گی‘ لیکن آلِ فرعون ان کی امانت داری کے قائل تھے‘ اس لیے وہ ان کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو آلِ فرعون کی طرف سے امانتاً رکھوائے گئے سارے زیورات بھی ساتھ لے کر آ گئے۔ سامری نے ان سے کہا کہ یہ سارے زیورات تم پھینک دو‘ اس لیے کہ یہ تو نجس ہیں اور یہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں۔ اس حد تک تو بات ٹھیک ہوئی‘ لیکن سامری نے اُن زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی شکل بنا لی اور اس کے اندر ایسا میکنزم رکھا کہ جب اس میں سے ہوا گزرتی تھی تو اندر سے کھوکھلا ہونے کی وجہ سے اُس میں سے ایسی آواز آتی تھی جیسے بچھڑا ڈکار رہا ہو۔ اُس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ یہ ہے تمہارا خدا! جبکہ موسیٰ کو تو کوئی مغالطہ لگا ہے اور وہ کسی غلط فہمی میں پتا نہیں کہاں‘ کس خدا کے پاس گئے ہیں۔ اصل خدا تو یہ ہے‘ لہٰذا تم اس کی پوجا کرو! سامری کی

باتوں میں آکر بنی اسرائیل کی کثیر تعداد نے اُس بچھڑے کی پرستش شروع کردی۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر آگاہ کردیا کہ تمہاری قوم فتنے میں پڑ چکی ہے۔

اس ضمن میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کوہِ طور پر آنے کا اللہ تعالیٰ نے ایک وقت معین کیا تھا، لیکن آپؑ فرطِ اشتیاق میں وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جواب طلبی فرمائی۔ اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں موجود ہے، فرمایا: ﴿وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ۝۸۳﴾ ''اے موسیٰ! تمہیں کس چیز نے جلدی پر آمادہ کیا اپنی قوم کو چھوڑ کر؟'' یعنی تم اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں آ بھی گئے ہو، حالانکہ ابھی تو وقت معیّن نہیں آیا۔ ﴿قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ۝۸۴﴾ ''موسیٰ نے (جواب میں) عرض کیا کہ میری قوم میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے، اور پروردگار! میں نے تو تیری طرف (آنے میں اس لیے) جلدی کی تاکہ تو راضی ہو جائے''۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام تو یہ سوچ رہے تھے کہ اللہ ربّ العزت کی طرف سے شاباش ملے گی، اس لیے کہ اُن کے پیشِ نظر تو ع ''تُو میرا شوق دیکھ، مرا اشتیاق دیکھ!'' والی کیفیت تھی لیکن یہاں تو لینے کے دینے پڑ گئے اور شاباش تو کجا، الٹی باز پرس (explanation call) ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جلد بازی کر کے درحقیقت تم نے غلطی کی ہے اور اس کی وجہ سے سامری کو موقع مل گیا اور اس نے تمہاری قوم کو گمراہ کردیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قوم پر انتہائی غضب ناک ہونا

اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے شرک کی خبر سنائی تو آپؑ انتہائی غصے کے عالم میں اپنی قوم میں واپس آئے۔ اس کے لیے قرآن میں جو الفاظ آئے ہیں وہ سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۰ میں مذکور ہیں: ﴿ وَلَمَّا رَجَعَ مُوۡسٰٓى اِلٰى قَوۡمِهٖ غَضۡبَانَ اَسِفًا﴾ ''اور موسیٰؑ اپنی قوم میں نہایت غصے اور افسوس کی حالت میں واپس آئے'' — غَضۡبان، غضب کی انتہائی شکل ہے اور اس وزن پر عربی زبان میں جو بھی الفاظ آتے ہیں وہ کسی شے کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً اَنَا جَوۡعَانُ (میں انتہائی بھوکا ہوں)، اَنَا عَطۡشَان (میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں)۔ اور رَحۡمان وہ ہستی ہے جس میں رحم کا

جذبہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہو۔اسی طرح انتہائی غصے کی کیفیت کو ''غضبان'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا تو اس بنا پر یہاں غضبان کا لفظ آیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب معلوم ہوا کہ اُن کی قوم کے کثیر لوگ اس طریقے سے گمراہ اور مشرک ہو گئے ہیں کہ انہوں نے باقاعدہ ایک بچھڑے کو خدا مان لیا ہے اور اس کی پرستش کر رہے ہیں تو ایک طرف تو آپ انتہائی غضب ناک ہوئے اور دوسری طرف آپ نے قوم کی اس حرکت پر انتہائی افسوس اور رنج کا اظہار کیا۔اس کے بعد آپؑ نے جو کیا وہ بھی آپ کی اسی جلالی طبیعت کا مظہر ہے۔اس حوالے سے فرمایا گیا:﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ﴾ ''اور (شدتِ غضب سے آپ نے تورات کی) تختیاں (زمین پر) ڈال دیں اور اپنے بھائی ہارون کے سر (کے بال) پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے''۔بلکہ داڑھی اور پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچا اور کہا کہ تم نے ان کو روکا کیوں نہیں؟ میں تو تمہیں یہاں خلیفہ بنا کر گیا تھا اور تمہارے ہوتے ہوئے یہاں یہ سب کچھ ہو گیا تو تم مجھے بتانے کے لیے میرے پیچھے کیوں نہیں آ گئے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے اندیشہ یہ ہوا کہ آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ پیدا کر دیا' جبکہ میں نے انہیں روکنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن یہ کہ تفرقہ کے ڈر سے میں نے کوئی بہت بڑا اور انتہائی قدم نہیں اٹھایا۔

مرتد کی سزا: قتل

بنی اسرائیل کے اس شرک کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم نازل ہوا کہ بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلے کے جتنے لوگوں نے یہ شرک کیا ہے' انہیں اسی قبیلے کے وہ لوگ قتل کریں جو توحید پر قائم رہے ہیں۔چنانچہ تورات کی روایت کے مطابق ستّر ہزار یہودی قتل ہوئے۔اسی بنا پر اسلام میں بھی مرتد کی سزا قتل ہے' لیکن آج کل کے منکرین حدیث اور روشن خیال دانشور اس سزا کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مغرب سے اپنی روشن خیالی کی سند لینا چاہتے ہیں اور

مغرب کا تصور یہ ہے کہ کسی بھی مذہب کو اختیار کرنے میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کو اگر عیسائیت پسند آ گئی اور وہ عیسائی ہو گیا تو یہ اُس کا حق ہے اور اس طرح کرنے سے وہ کوئی مجرم نہیں بن جاتا۔ایسے شخص کو قتل کیا جانا انسان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔اسی طرح اگر کوئی مرد اور عورت رضامندی سے زنا کا ارتکاب کرتے ہیں تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ یہ ان کا حق ہے اور ایسا کرنے سے وہ مجرم نہیں ٹھہرتے۔البتہ اگر کسی نے نابالغ لڑکی سے زنا کیا ہے یا کسی عورت کی زبردستی عصمت دری کی ہے تو اس صورتِ حال میں یہ جرم شمار ہو گا اور ایسا کرنے والا مجرم' لیکن اگر باہمی رضامندی شامل ہے تو پھر کوئی جرم نہیں ہے۔

مغرب میں رائج حقوق انسانی کے مبالغہ آمیز تصور کی رو میں بہہ کر ہمارے ہاں بھی کچھ لوگ قتلِ مرتد اور رجم کے بارے میں مختلف قسم کا پروپیگنڈا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن میں تو قتلِ مرتد اور رجم کی سزا کا کہیں ذکر نہیں ہے' تو پھر تم نے یہ سزائیں کہاں سے نکال لی ہیں؟ اس حوالے سے جان لیجیے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ دونوں سزائیں تورات سے اخذ کر کے اپنی سنت کے ذریعے سے نافذ کی ہیں۔ظاہر بات ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پہلے تو دنیا میں شریعت موسوی رائج تھی۔ یہودیوں کے لیے شریعت موسوی تھی اور اسی طرح عیسائیوں کے لیے بھی' کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت (موسوی) کو ختم کرنے آیا ہوں' بلکہ تم پر یہی شریعت لاگو رہے گی۔آپؑ کے بعد سینٹ پال نے آ کر شریعت کو ختم کیا ہے۔اس لحاظ سے آج کی عیسائیت بڑا عجیب مذہب ہے جس میں کوئی قانون ہے ہی نہیں' جبکہ یہودی اپنے تئیں شریعت موسوی پر کاربند ہیں۔ اسلام میں بہرحال قوانین بھی ہیں اور انسانی حقوق کی حدود بھی مقرر ہیں۔لہٰذا اگر آپ مسلمان ہیں اور آپ کو کوئی اور دین پسند آ گیا ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ آپ مسلمان ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔لیکن دارالاسلام میں رہتے ہوئے آپ کو مرتد ہونے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو سزا کے طور پر اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

قتلِ مرتد کا سبب

مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کا ایک خاص سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی ریاست کی بنیاد نسل' رنگ اور زبان پر نہیں بلکہ نظریے پر ہوتی ہے اور کسی شخص کا یوں مرتد ہو جانا نظریے کو کمزور کر دینے والی شے ہے۔ اس سے تو یہ ہوگا کہ کسی سازش کے تحت بعض لوگ ایک وقت میں ایمان لائیں گے اور پھر مرتد ہو جائیں گے تاکہ اسلام کی ہوا اُکھڑ جائے۔ اس طرح کا معاملہ دورِ نبویؐ میں ہو چکا ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٧٢﴾﴾

''اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے اُس پر ایمان لاؤ صبح کے وقت اور اس کا انکار کر دو دن کے آخر میں' شاید (اس تدبیر سے) ان میں سے بھی کچھ پھر جائیں۔''

یعنی وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ دیکھو بھئی' اسلام اور ایمان کی بڑی دھاک بیٹھ گئی ہے اور جو شخص ایمان لے آتا ہے وہ اپنے ایمان کو نہیں چھوڑتا' چاہے اسے انگاروں میں ڈال دیا جائے۔ ابوجہل نے حضرت سُمیّہ اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہما دونوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا' لیکن انہوں نے کلمۂ کفر زبان سے نکالنا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ جان بچانے کے لیے زبان سے کلمہ کفر کہہ دینے کی اجازت ہے جبکہ ایمان دل میں موجود رہے۔ چنانچہ حضرت سمیہؓ اور حضرت یاسرؓ کے بیٹے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دیا تھا اور پھر ان کو اس پر شدید پشیمانی ہوئی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اطمینان دلایا کہ اس کی بھی اجازت ہے۔ اگرچہ جو مقام تمہارے والدین نے حاصل کیا ہے وہ بہت اونچا مقام ہے۔ وہ عزیمت اپنی جگہ' لیکن یہ رخصت بھی اپنی جگہ دین کا ایک حصہ ہے۔ بہرحال اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے سازش کی اور آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ ایسے کرو کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے' اس پر صبح کے وقت ایمان لے آؤ اور دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو۔ یعنی تم اہلِ ایمان سے کہو کہ جو کتاب تم پر نازل ہوئی

ہے ہم بھی اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم بھی مؤمن ہو گئے ہیں۔ اب اس میں یہ اضافے ہیں کہ ذرا حضور ﷺ کے قریب رہو تا کہ لوگ دیکھ لیں کہ دن بھر یہ حضور ﷺ کی صحبت میں رہے ہیں اور پھر شام کو یہ کہتے ہوئے مرتد ہو جاؤ کہ ہم نے سب دیکھ' پرکھ لیا ہے۔ یہ تو دور کے ڈھول سہانے کے مترادف ہے۔ ہم نے اندر جا کر دیکھ لیا ہے' کوئی خاص بات نہیں ہے۔

یہ سب کرنے سے یہ ہوگا: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ ''شاید کہ وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں''۔ یعنی اس سے یہ ہوگا کہ کچھ نہ کچھ لوگ ضرور متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر سب لوگ تو برابر کے نہیں ہوتے' بلکہ کمزور ایمان والے بھی ہوتے ہیں اور اس طرح کرنے سے کمزور ایمان والوں کے دل کے اندر خدشہ پیدا ہوگا اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔ وہ سوچیں گے کہ بڑے بھلے اور اچھے لوگ تھے' بڑی نیک نیتی سے ایمان لائے تھے اور حضور ﷺ کی محفل کے اندر بڑے مؤدب ہو کر بیٹھے رہے تھے' بڑی توجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کا کلام سنا تھا تو آخر کوئی بات انہوں نے دیکھی ہو گی نا جس کے سبب یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ دراصل اس فتنے کا سدباب کرنے کے لیے قانون بنا ہے کہ جو بھی اسلام لائے' وہ دیکھ بھال کر لائے' اس لیے کہ ایک بار داخل ہونے کے بعد یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تو ایک وادی کے اندر قدم رکھنا ہے جس میں مشکلات بھی آئیں گی' تکالیف بھی آئیں گی' لیکن یہ کہ بہر حال اس سے رجوع کرنے کا پھر حق نہیں ہوگا۔ اگر اسلام کو چھوڑو گے تو قتل کیے جاؤ گے۔ یہ اسلام کا ایک قانون ہے اور اس پر تنقید کرنا شریعت اسلامی کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے۔

کتاب وسُنّت: شریعت کی مستقل بالذّات بنیادیں

یہ بات میں نے آپ کو اتنی تفصیل سے اس لیے سنائی ہے کہ قتل مرتد اور رجم کی سزائیں قرآن میں مذکور نہیں ہیں' لیکن از روئے قرآن تورات پر بھی لفظ ''قرآن'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ مکہ کے کفار ومشرکین کا ایک قول قرآن مجید میں یوں نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ﴾ (سبا) ''اور کہا

انکار کرنے والوں نے کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ اُس (قرآن) پر جو اس سے پہلے تھا"۔ تو یہاں تورات پر قرآن کے لفظ کا اطلاق ہوا ہے — اور حضور اکرم ﷺ نے یہ دو سزائیں تورات سے لی ہیں۔ یہاں یہ اصول بھی یاد رکھیں کہ شریعت صرف قرآن پر مبنی نہیں ہے' بلکہ شریعت کی دو مستحکم اور مستقل بِالذّات (independent of each other) بنیادیں ہیں اور وہ ہیں: کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ البتہ ہمارے ہاں بعض لوگ ایسے موجود ہیں جو صرف قرآن کو شریعت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ یہ اہلِ قرآن کہلاتے ہیں' لیکن ان کو منکرینِ حدیث کہنا زیادہ مناسب ہے' اس لیے کہ یہ حدیث اور سنت کو شریعت کی بنیاد نہیں مانتے۔ پھر یہ لوگ اسلام کی مختلف باتوں کی جو تعبیریں کرتے ہیں' ان میں سے کسی ایک بات پر ان میں سے دو آدمی بھی متفق نہیں ہیں۔ مثلاً ان میں سے ہر کوئی صلوٰۃ کے الگ معنی بیان کرتا ہے' جبکہ اس سے نماز مراد لینا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ سے معین ہوا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))[1] "نماز پڑھو جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو"۔ بہر حال شریعت کی دو مستحکم بالذات بنیادیں ہیں اور حدیث وسنت کے بغیر قرآنی احکام کی صحیح تعبیر ممکن نہیں۔

حمیّتِ ذاتی اور حمیّتِ دینی کا فرق

زیرِ مطالعہ حدیث کے ضمن میں' میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ انسان کو غصہ تب آتا ہے جب کسی نہ کسی حمیت پر زد پڑتی ہے۔ اب یا تو حمیت ذاتی ہے۔ یعنی آپ نے محسوس کیا کہ میری ذات' میری شہرت' میری عزت' میرے خاندان' میری قوم یا میرے وطن پر حملہ کیا گیا ہے' تو ظاہر بات ہے' آپ کو غصہ آئے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے دین پر حملہ کیا گیا ہے' تو یہ حمیتِ دینی ہے' اور اس پر غصہ آنا مستثنیٰ ہو جائے گا ان غصوں سے جو حمیتِ ذاتی' حمیتِ عائلی' حمیتِ قومی یا حمیتِ وطنی پر زد پڑنے کی وجہ سے آتے ہیں۔ لہٰذا اپنے کسی ذاتی معاملے پر غصہ میں آجانا اور اللہ کے

(۱) صحیح الجامع للالبانی' ح:۸۹۳۔

دین کے معاملے میں غضب ناک ہو جانا' ان میں بنیادی طور پر فرق پڑ جائے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی دینی حمیت پر غصہ آیا تھا کہ میری قوم نے اتنے بڑے بڑے معجزے دیکھنے کے باوجود شرک کی روش اختیار کر لی! — ان معجزوں کے بارے میں سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ (آیت ۱۰۱) ''اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں''۔ شروع میں دو معجزے تھے: (۱) موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بن جانا (۲) ید بیضا۔ پھر صحرائے سینا میں منّ وسلویٰ کا نزول ہوا اور ایک چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اسی طرح بڑے سے بڑے معجزے آتے چلے گئے' جبکہ سب سے بڑا معجزہ سمندر کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کے لاؤ لشکر سے نجات دینا تھا — ان سب معجزوں کو دیکھنے کے باوجود قوم کا یوں شرک میں مبتلا ہو جانے پر موسیٰ علیہ السلام کا غضب ناک ہو جانا' بالکل معقول اور قرین قیاس ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام کی دینی حمیت

دینی حمیت پر غضب ناک ہونے کی ایک اور مثال اللہ کے رسولوں میں حضرت یونس علیہ السلام کی ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الانبیاء' آیت ۸۷ میں یہ الفاظ ہیں: ﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا......﴾ ''اور مچھلی والے کو بھی (ہم نے نوازا) جب وہ چل دیا غصے سے بھرا ہوا......'' حضرت یونس علیہ السلام عراق کے شمال میں واقع نینوا شہر میں رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ انہوں نے قوم کو حق کی دعوت وتبلیغ کی اور ہر طرح کی نصیحت وتلقین کا حق ادا کیا' مگر قوم ایمان نہیں لائی اور کفر پر اڑی رہی۔ اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام غضب ناک ہو کر اپنی قوم کو چھوڑ کر چل دیے کہ اب تو ان پر اللہ کا عذاب آ کر رہے گا۔ لیکن یہاں ان سے ایک خطا ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو یہ خطا ہوئی تھی کہ وہ وقت معین سے پہلے کوہِ طور پر پہنچ گئے تھے' جبکہ حضرت یونس علیہ السلام سے غلطی یہ ہوئی کہ اللہ کی طرف سے اجازت آ جانے سے پہلے ہی آپ اپنی قوم اور شہر کو چھوڑ کر چل دیئے حالانکہ رسولوں کے لیے یہ شرط ہے کہ رسول جس قوم یا علاقے کی طرف بھیج دیا جائے تو اللہ کی طرف سے ہجرت کی دوٹوک اجازت (express permission) آ جانے سے پہلے رسول وہ جگہ چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

لیکن حضرت یونس علیہ السلام اپنی قوم کے کفر پر اتنے غضب ناک ہو گئے کہ یہ بات ان کے ذہن میں نہ رہی اور آپ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اس حوالے سے آپ کے ذہن میں آ گیا ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام مسلمانوں کے لیے ہجرتِ مدینہ کی اجازت آ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمادیا کہ تم سب مدینہ چلے جاؤ' لیکن آپؐ خود نہیں گئے' جب تک کہ واضح اور معین طور پر آپؐ کے لیے اجازت نہیں آ گئی۔ اس ضمن میں سیرت کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دو اونٹنیاں تیار کی تھیں کہ لمبا سفر ہے اور تیز جانا ہو گا۔ پھر جب ہم جائیں گے تو ظاہر بات ہے کہ ہمارا تعاقب کیا جائے گا' تو آپؓ نے دو اونٹنیوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کیا ہوا تھا' لیکن رسول اللہ ﷺ کو اس بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آپؓ ہجرت کے منتظر تھے' اس لیے بار بار آپؓ حضور ﷺ سے پوچھتے تھے کہ اجازت آ گئی؟ حضور فرماتے کہ ابھی نہیں آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دن ہم نے دیکھا کہ دوپہر کے وقت نبی اکرم ﷺ ہمارے گھر کی طرف چلے آ رہے ہیں اور اپنا چہرۂ مبارک اپنے رومال میں چھپایا ہوا ہے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی' اس لیے کہ عرب میں قیلولے کے وقت یعنی ظہر اور عصر کے درمیان بازار اور دفاتر بھی بند ہو جاتے ہیں اور اُس وقت کسی کے گھر آنا جانا بھی نہیں ہوتا' اِلّا یہ کہ آپ کو کسی نے دوپہر کے کھانے پر بلایا ہو۔ خیر نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور آ کر کہا کہ ابوبکر! اجازت آ گئی ہے۔ اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ دل میں سوچتے ہوئے کہ مجھے شاباش ملے گی' عرض کیا: حضور! میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں اور انہیں خوب کھلا پلا کر فربہ کیا ہے! حضور ﷺ نے تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد فرمایا: اچھا ٹھیک ہے' میں ایک اونٹنی استعمال کروں گا لیکن میں اس کی قیمت ادا کروں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رو پڑے اور کہا: حضور ﷺ! مجھ سے بھی مغائرت ہے؟ میں نے تو اپنے جان و مال میں سے کوئی بھی چیز آپ سے بچا کر نہیں رکھی ہے۔

بہرحال جب تک فیصلہ کُن اجازت نہیں آ جاتی اُس وقت تک رسول اپنی قوم کو

چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ حضرت یونس علیہ السلام سے غلطی ہوئی کہ وہ انتہائی غصے کی حالت میں بغیر اجازت کے قوم کو چھوڑ کر چل دیے۔ اس غلطی پر ان کی پکڑ ہوئی' اس لیے کہ کارِ رسالت کی شرائط میں سے ایک شرط کے اندر کچھ کمی ہوئی ہے۔ لہٰذا آپ کو معلوم ہے کہ پھر مچھلی نے آپؑ کو نگل لیا اور مچھلی کے پیٹ میں آپؑ نے: "لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ" (الانبیاء:۸۷) کا ورد کیا' اللہ سے استغفار کیا۔ اس پر اللہ رب العزت نے انہیں معاف فرمایا — وہیل مچھلی نے آپ کو "شطّ العرب" میں نگلا تھا (دریائے فرات اور دریائے دجلہ عراق کے جنوب میں باہم مل کر ایک چھوٹے سے سمندر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' جو شطّ العرب کہلاتا ہے) اور خلیج فارس سے ہوتے ہوئے کہیں مکران کے ساحل پر اللہ کے حکم سے اُگلا تھا۔ اس پر جناب احمد الدین مارہروی کا ایک تحقیقی مضمون ماہنامہ میثاق اور حکمت قرآن میں شائع ہوا تھا۔☆

اس ساری تفصیل بتانے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا غضب ناک ہو جانا اگرچہ حمیت دینی کی وجہ سے تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ شرائط کو نظر انداز کرنے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ اس ضمن میں اگر کسی رسول سے بھی کوتاہی ہوئی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی ہے۔

"مجھے یونسؑ بن متّٰی پر فضیلت مت دو!"

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ ہمارے ہاں نعتوں کے اندر شدید مبالغہ آرائی کی جاتی ہے اور آج کل تو اس بارے میں انتہا ہو گئی ہے' جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ اَنْ یَقُوْلَ اَنَا خَیْرٌ مِنْ یُوْنُسَ ابْنُ مَتّٰی)) (۱)

"کسی شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ میں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) یونس بن متّٰی سے بہتر ہوں۔"

دیکھئے حضرت یونس علیہ السلام واحد رسول ہیں جن سے کچھ خطا ہوئی تو پھر اس خطا کی انہیں سزا

☆ مذکورہ مضمون "شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ" کے عنوان سے اول ماہنامہ میثاق' فروری ۱۹۸۰ء' بعد ازاں حکمت قرآن کے شمارہ فروری ۱۹۹۹ء اور پھر مئی ۲۰۰۶ء میں مکرر شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

(۱) صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قولہ انا اوحینا الیک......

بھی ملی۔ باقی اور رسولوں میں سے کسی کے ساتھ ایسا معاملہ ثابت نہیں ہے۔ خطا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ہوئی تھی‘ جس کے بارے میں ہم قبل ازیں پڑھ چکے ہیں‘ لیکن اس خطا کی کوئی سزا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں ملی۔ لہٰذا حضرت یونس علیہ السلام وہ واحد رسول ہیں جنہیں خطا کی سزا ملی ہے اور پھر اس کا فائدہ بھی قومِ یونس کو پہنچا ہے۔ آج کی جدید اکاؤنٹنگ کا اصول ہے کہ ہر ڈیبٹ (debit) کے مقابلے میں کوئی کریڈٹ (credit) اور ہر کریڈٹ کے مقابلے میں کوئی ڈیبٹ ہوگا۔ اس حساب سے یہ جو ڈیبٹ ہوا حضرت یونس علیہ السلام کے خلاف‘ تو یہ قوم کے حق میں کریڈٹ بن گیا۔ وہ اس طرح کہ حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کے بعد عذاب کے آثار شروع ہو گئے تھے‘ جس کے بعد کسی بھی قوم کی اجتماعی توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے‘ جس طرح کسی فرد کے لیے موت کے آثار نظر آنے پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے — جب عذاب کے آثار شروع ہو گئے تو قوم کو یاد آیا کہ یہ تو وہی بات ہوگئی جو یونس کہا کرتے تھے۔ اس پر وہ فوراً گھروں سے نکل کر کھلے میدان میں جمع ہو گئے اور چیخ چیخ کر‘ رو رو کر‘ گڑگڑا کر اللہ سے معافیاں مانگنے لگے اور دعائیں کرنے لگے‘ تو اللہ نے ان پر سے عذاب ٹال دیا۔

سورۂ یونس میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ﴾ یہاں ”بعد ظهور العذاب“ کے الفاظ محذوف ہیں۔ اس کا ترجمہ اس طرح ہوگا: ”کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی (عذاب کے ظاہر ہونے کے بعد) ایمان لائی ہو اور اس کے ایمان نے اس کو فائدہ دیا ہو سوائے یونس کی قوم کے!“ ﴿لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ۝۹۸﴾ ”جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان پر دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ہٹا دیا اور ان کو ایک خاص مدت کے لیے مہلت دے دی“۔ عذاب کے آثار ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا اللہ کو قبول نہیں ہے‘ لیکن اس میں استثناء ہے قومِ یونس کا۔ ان پر عذاب کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے‘ لیکن انہوں نے اجتماعی توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا‘ عذاب کو ٹال دیا اور ان کو کچھ مہلت دے دی۔

روحانی معالج کے لیے شخصی تشخیص کی اہمیت

اس حدیث کے حوالے سے آخری نکتہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس اندازِ بیان —((لَا تَغْضَبْ، لَا تَغْضَبْ، لَا تَغْضَبْ))— سے ایک بڑی اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ درحقیقت شخصی تشخیص اور شخصی علاج تھا۔ روحانی معالج کے لیے شخصی تشخیص بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور وہ اسی کے مطابق علاج کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انبیاء ورسل علیہم السلام مزکّی تھے' اور وہ لوگوں کا روحانی تزکیہ کرتے تھے۔ اسی طرح ہمارے ہاں صوفیاء کا ایک طبقہ ہے جنہوں نے اپنے مشائخ سے تزکیہ کرایا ہوتا ہے اور پھر وہ دوسروں کا تزکیہ کرتے ہیں۔ یہ ایک سلسلہ ہے جو چل رہا ہے۔ اس تزکیہ کے اندر ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی بات سب کو بتائی جائے' بلکہ مزاج اور طبائع کے لحاظ سے ہر ایک کا تزکیہ کیا جاتا ہے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کا انداز تھا۔ اکثر اذکار تو ایسے ہیں جو حضور اکرم ﷺ نے سب کو بتائے' مثلاً ہر نماز کے بعد اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ پڑھنا وغیرہ۔ لیکن بعض اذکار ایسے بھی ہیں جو آپ نے کسی فردِ واحد کو اُس کی باطنی کیفیت کے مطابق بتلائے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے بعض لوگوں کو کچھ خاص نصیحتیں فرمائیں۔ چنانچہ روحانی معالج کے اندر شخصی تشخیص و شخصی علاج کی صلاحیت ضروری ہے اس لیے کہ لوگوں میں مختلف قسم کے باطنی امراض ہوتے ہیں۔ کسی کے اندر دولت کی محبت زیادہ ہے' کسی کے اندر غصہ بہت تیز ہے اور کسی کے اوپر شہوت کا غلبہ بہت زیادہ ہوتا ہے' تو اب سب کا علاج ایک طرح نہیں ہوگا' بلکہ ہر ایک کا علاج اسی کے اعتبار سے ہوگا۔ لہٰذا زیر مطالعہ فرمانِ نبویؐ میں یہ اُس شخص کے لیے شخصی تشخیص وعلاج (personal prescription) ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر غضب اور غصہ کا معاملہ ضرورت سے زائد تھا' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے تکرار کے ساتھ اسے اِسی سے بچنے کا مشورہ دیا اور بتکرار اسی کی وصیت فرمائی۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ